عالمِ اسلام میں اپنے موضوع پر جامع منضبط اور مدلل تحریر
ابکار الأفکار فی اصول الاکفار
المعروف
اصولِ تکفیر
ایمان کی لغوی واصطلاحی تحقیق، اس کی ضروری شرائط، کفر کی لغوی واصطلاحی تحقیق، اقسام واحکام، کفر وتکفیر کی شرائط، موانع اور اس بارے میں افراط وتفریط کی اصلاح، ضروریات دین کا مفصل تعارف اور تحقیقی وتطبیقی جائزہ، تکفیر کا جامع اور منضبط ضابطہ، استحلال واستخفاف کی شرائط اور مختلف صورتیں، سیکولرازم کی تاریخ، اہداف اور شرعی حکم، یہ اور اس کے علاوہ اس موضوع پر مفصل ومدلل تحریر
تالیف: مفتی عُبَیدُ الرحمٰن عفی عنہ
دارالافتاء دارالعلوم الرحمانیہ مردان
تقریظ حضرت مولانا سمیع الحق صاحب دامت برکاتہم العالیہ
مہتمم جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک، نوشہرہ
تقدیم حضرت مولانا سجاد الحجابی صاحب دامت برکاتہم العالیہ
صدر المدرسین دار العلوم نرشک، مردان
مرکز البحوث الاسلامیہ
روشن کتب
اردو بازار لاہور پاکستان
03019452605
ہمارے YouTube چینل کو Subscribe کریں

فہرست مضامین

تقریظ: شیخ الحدیث حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

الحمد لحضرة الجلالة والصلوة والسلام علی خاتم الرسالة، وبعد!

اہم ترین امور اور واجباتِ مہمہ میں سے یہ بھی ہے کہ ہر مسلمان اس بات کو خوب سمجھ لے کہ دین اسلام وہ دین ہے جس نے ترجیحات کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور اہم ترین امور کو ایک ترتیب دی ہے اور اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ تمام مسائل و قضایا کو ان کی صحیح میزان پر تولا جائے، ان کو شرعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور ان کی تفصیلات اور فروع کا مکمل ادراک حاصل کیا جاسکے اور دین اسلام کے کسی بھی حکم اور مسئلہ میں افراط و تفریط، غلو و عناد سے کام نہ لیا جائے اور احکام کے نفاذ میں سے کسی بھی حکم میں خواہش نفس کی جانب ہر گز جھکاؤ نہ کرے خواہ مقصد کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو۔

اس دین کے بہت سے ایسے مسائل ہیں جن کا معاملہ بہت نازک اور خطرناک، جن کی شان وشوکت بہت عظیم اور ان کا فہم اور ادراک بہت دقیق و مشکل ہے، وہ مسائل قدموں میں لرزش اور فہموں میں گمراہی کا باعث تب ہی بن جاتے ہیں، جب اس کے فہم اور انطباق میں احتیاط سے کام نہ لیا جائے۔ ان مسائل میں سب سے خطرناک ترین مسئلہ "مسئلہ تکفیر" ہے، یہ بہت دقیق اور مشکل ترین مسئلہ ہے۔اس میں دخل اندازی کرنے والا اگر اس کے دقائق، رموز، شرائط، اقسام اور حدود کا عالم، محقق، فقیہ شخص نہ ہو تو ٹھوکر کھاجاتا ہے اور جو عالم ربانی نہ ہوگا وہ اس مسئلہ کے شاخ در شاخ دشوار ترین راستوں میں گم ہو کر رہ جائے گا۔

مسئلہ تکفیر کو تاریخ کے ہر دور میں اہل علم مشکل سمجھتے آئے ہیں، یہ ایسا ہے کہ جس میں ایک طبقہ نے مبالغہ آمیزی اور غلو سے کام لیا تو دوسرے طبقہ نے اسے سمجھنے میں

کوتاہی و تفریط برتی، یہ وہی مسئلہ ہے جس میں صحیح وصواب تک صرف وہی ہدایت پاسکتا ہے جس نے کتاب وسنت کی نور سے حظ وافر پایا ہو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام اور تبع تابعین رحمہم اللہ کے منہاج اور اسلاف کے نقش قدم کو تھامے رکھا ہو، یہ مسئلہ علم الکلام، علم العقائد اور ایمانیات کے باب سے تعلق رکھتا ہے، جس کے قواعد وضوابط، اصول وقوانین، شرائط وحدود، تشریحات ومباحث کو عام فہم بنانے کے سلسلہ میں علماء کرام اور اہل تحقیق نے ہر دور اور ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور اس کی انواع واقسام، حدود وموانع کو ادلہ وماخذ اسلامیہ کے تحت مضبوط کر کے اس کے اصول وضوابط طے کئے اور بغیر فہم وادراک کے اس میں دخل اندازی کے خطرناکیوں کی نشاندہی کر کے اس پر تنبیہ کی ہے۔اب تک اس پر ہر زبان میں ہر مسلک اور مکتب فکر کے علماء کرام اور اہل تحقیق نے بے شمار کتابیں تحریر فرمائی ہیں، تاہم اس حوالہ سے کسی ایسی تحریر کی تشنگی محسوس کی جارہی تھی جو تمام مکاتب فکر کے لیے اطمینان کا ساماں فراہم کرسکے۔

زیر نظر کتاب " ابکار الافکار فی اصول الاکفار، معروف بہ اصول تکفیر" بھی اس سلسلہ کی اہم کڑی ہے، یہ کتاب مولانا مفتی عبید الرحمٰن صاحب کی تالیف لطیف ہے جو کفر اور تکفیر کے موضوع پر جامع، منضبط اور مدلل تحریر ہے۔ مفتی عبید الرحمن صاحب ایک باصلاحیت، صاحب قلم محقق اور نوجوان عالم دین ہیں، ان کا ذوق تحقیق قابل صد تحسین ہے کہ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس نازک موضوع پر پُر از معلومات اور فکر انگیز کتاب مرتب فرمائی اور اس حساس اور نازک مسئلہ پر اہل سنت والجماعت کے تمام اکابر واہل علم کے اقوال اور تحقیقات کی روشنی میں تکفیر کے لیے

شرعی معیار کا تعین کیا اور ائمہ اہلسنت کے اقوال واعمال کی روشنی میں تکفیر کے شرائط اور حدود فراہم کیا۔ عدیم الفرصتی کے باوجود جستہ جستہ مباحث اور مقامات کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ موصوف نے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حساس موضوع پر کافی مواد اکھٹا کر کے اس کو کتابی شکل میں اہل علم کے سامنے پیش کیا۔ ان شاء اللہ یہ وقیع علمی کاوش اس پر فتن دور میں ہر گروہ، ہر فرقہ اور ہر مسلک سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ اور ہر صاحبِ علم کے لیے چشم کشا، بصیرت افروز، معلومات افزاء ہوگی۔ اللہ سے دعا ہے کہ مؤلف کی اس کاوش کو قبولیت بخشے۔ آمین

سمیع الحق

خادم دار العلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک

مقدمہ: حضرت مولانا محمد سجاد الحجابی صاحب زید مجد ہم

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کو دین فطرت اور ملت حقہ پر پیدا فرمایا، مگر حالات وماحول کی وجہ سے ان کے مزاج، رائے و سوچ میں نفسانی وساوس اور شیطانی خیالات نے اس دین فطرت پر مضبوط عقیدہ رکھنے میں رخنے ڈالنے شروع کر دیے اور یوں دین فطرت ایسی مسخ ہوگئی کہ حق و باطل میں امتیاز مشکل ہو گیا، صریح حدیث شریف میں انسانیت کی اس طرف رسول اللہ ﷺ نے رہنمائی فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: ما من مولود إلا يولد على الفطرة، فأبواه يهودانه وينصرانه ويشركانه[1]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر بچہ اصل فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی، عیسائی یا مشرک بناتے ہیں۔"

جس میں تفریق کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا گیا اور ان پر کتابیں اور وحی نازل فرمائی، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

[كان الناس امة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين]

انبیاء کرام علیہم السلام کی کوششوں سے تمام انسان ماننے والے اور انکار کرنے والے دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے، ایک جماعت اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، اس کے رسولوں، نبیوں، کتابوں، فرشتوں، احکامات، تقدیر اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث:٢٦٥٨.

ہونے پر دل وزبان سے ایمان لاکر مومن کہلائی اور دوسری جماعت نے ان میں سے کسی ایک یا سب پر ایمان لانے سے انکار کیا، تو وہ کافر کہلائی، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

[هو الذی خلقکم فمنکم کافر ومنکم مومن]

انسانیت کا نقطۂ اتفاق ایمان ہے اور اس سے انحراف کفر وضلال ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیاوی امور کے حواس دے کر چند اصول کے ساتھ کمانے کی اجازت دی، ایسے ہی ان حواس کو استعمال کر کے ایمان و کفر میں بھی کسب کے درجہ میں اختیار دے دی، تاکہ اپنے لیے دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے دین فطرت یا ملت ممسوخہ میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔

کفر و اسلام آپس میں دو متضاد تصویریں ہیں اور دو ایسی نہریں ہیں جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف سمت میں بہتی ہیں، دونوں کی تضاد روشنی اور تاریکی سے زیادہ واضح ہیں، کیونکہ کفر کے پیروکار طاغوت کی پوجا کرتے ہیں اور شیطان کے ہمنوا ہیں، جب کہ مومن اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے سے سکون وراحت پاکر دنیا وآخرت میں نہایت چین کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

اس واضح افتراق کی وجہ سے بعثت کے پہلے دن سے عزت وشرافت کے لیے گورے وکالے، حسب ونسب اور عرب وعجم کی تمیز ختم کر کے ایک ملت واحدہ کی حیثیت سے اسلامی تشخص کو حقیقی انداز میں دین فطرت کے خطاب سے یاد کیا جانے لگا، جب کہ کفر وشرک ایمان کے مقابلے میں ایک الگ ملت روپ دھار کر اسلام کے مخالف سمت میں ایک الٹ متوازی جماعت ابھر آئی۔

ایمان و کفر کے حدود آپس میں روز روشن کی طرح عیاں ہے، کیونکہ ایمان کا تعلق دل کے یقین سے ہے، جو مذکورہ بالا امور کو قرآن و حدیث اور حضرات صحابہ کرامؓ کے تعامل کی روشنی میں ماننے کا نام ہے، جب کہ ان عقائد کے تسلیم کرنے سے انکار کفر ہے۔

قرآن وحدیث کی ان مسلمہ حقائق کو حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور حضرات تابعین رحمہم اللہ نے اپنے تعامل سے ان کی عملی صورتوں کو واضح کر دیا، لہذا ان اصول کے مقابلے میں جو کوئی انحراف کرتا گیا، وہ صحابہ کرامؓ وتابعینؒ کی جماعت سے جدا ہو گیا، جیسے کہ روافض اور خوارج دورِ صحابہ کرامؓ میں اور مجسمہ، معطلہ، مشبہہ، مرجئہ و کرامیہ عہد تابعین عظامؒ میں جدا ہو گئے۔

جب کہ قرامطہ و باطنیہ اور دیگر فرق ضالہ جنہوں نے قرآن وحدیث کے مسلمہ عقائد کو صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے ذکر کردہ متواتر معانی سے نکال کر نئی اور خود ساختہ تعبیر بیان کرنی شروع کر دی اور صوم وصلاۃ، زکوٰۃ وجہاد اور دوسرے دینی اصطلاحات کے نئے مطالب نکالنا شروع کئے، تو تبع تابعین اور حضرات مشائخ نے دین فطرت سے انحراف کی پاداش میں ان کے بارے میں تکفیر کا فتویٰ دیا۔

واضح رہے کہ ان لوگوں نے بذات خود اپنے آپ کو کفر کے اندھیروں میں دھکیل دیا، فقہاء کرام نے ان کے عقائد کو کے شریعت کے نہایت صاف شیشہ سے دیکھ کر اور دکھا کر یہ بیان کیا کہ یہ لوگ اس وقت اس خطرناک مقام پر کھڑے ہیں، الغرض یہ لوگ اپنے اختیاری فعل سے کافر بنے نہ یہ کہ علماء کرام نے ان کو کافر بنایا۔

چنانچہ حضرات فقہائے کرامؒ نے جب بھی کفر کا فتویٰ دیا، تو وہ دراصل ان کے عقائد و اقوال کی وجہ سے ان کے حقیقی کفر کو صرف ظاہر کیا، تاکہ امت مسلمہ کے متفقہ اصول سے اعراض اور ایمان کے ضروری تقاضوں کو پورا نہ کرنے کی وجہ سے اپنے مرضی کو استعمال کرتے ہوئے دین ممسوخہ کے ایک نئے رکن کی نشاندہی کریں۔

گذشتہ چودہ سو سالہ تاریخ میں مسلم امہ کی روش ایمان و کفر کی سرحدات کی حفاظت میں یہی رہی، جس سے ایک طرف تو ایمان و کفر کی حدود مشخص ہوئیں، تو دوسری طرف اسلام کا نام اور مسلمانوں کے عقائدہ حقہ تا قیامت روبزوال ہونے سے بچ گئے۔ اگر علمائے حقہ ایمانی حقائق اور اسلام کی حدود کی حفاظت نہ کرتے، تو ایک جانب اسلام کا نام ہی صفحہ ہستی سے کب کا مٹ چکا ہوتا اور دوسری جانب دین اسلام غیروں کے ہاتھوں بازیچۂ اطفال بن کر رہ جاتا اور جنت و جہنم کے مباحث صرف افسانے بن کر رہتے۔

اور آج کے مسلمان کا دین بھی مذہب عیسائیت کی طرح ساؤل و سینٹ فال کے پلندوں کے رکھوالے ہوتے، نہ دیر و خانقاہ بچتے اور نہ مسجد و مدرسہ، یہ تو ان بوریہ نشینوں کی کوششوں اور جدوجہدوں کا تسلسل ہے، جس میں بانئ علم الکلام، سرتاج اہل حق، سراج الامۃ امام ابو حنیفہؒ اور امام دار الہجرۃ امام مالکؒ کے نام سرفہرست ہے، جو اموی و عباسی امراء کے سامنے عزم مصمم کے مینار ثابت ہوئے اور عقائد و فروعات میں امت کی کامل رہنمائی کی، جب کہ امام احمد بن حنبلؒ معتزلہ کے خلاف صبر پیہم کے دیوار بنے۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ جیسے عباقرہ نے حفص الفرد کے ساتھ کامیاب مناظرے کئے جس کے ذریعے اس کی بدعات کو طشت از بام کیا، آگے چل کر اسی میدان میں جس کی مثال سے تاریخ انسانی تقریباً عاجز نظر آتی ہے اسی میں امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ کے خدمات پیش پیش ہیں، جو عقائد حقہ کی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو کر ہر لعن، طعن کے سامنے سینہ سپر ہو کر ایسے ڈٹے کہ عقائد باطلہ کے علم بردار انہیں انگشت بدانداں ہو کر دیکھتے ہی رہ گئے، کفر والحاد، زندقہ اور ارتداد کے خلاف مجدد الف ثانیؒ کی تحریک نے جہاں کفری تشریحات کو ختم کر دیا، وہی ان کے آلہ کار علمائے سو کی تحریف وتدلیس کو ہر سو واشگاف الفاظ میں بیان کر کے اپنے خلفاء کے ذریعہ باطنی اصلاحی تحریک (جو کہ مکمل طور پر کتاب وسنت کی روشنی میں تھی) کو چار چاند لگا دیئے۔ علمائے سرزمین ہند کی کلامی اور اعتقادی خدمات میں شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادوں، نواسوں اور مریدوں و شاگردوں کے کارنامے پائندہ تابندہ رہیں گے۔

الغرض جب بھی کفر وطغیان نے سر اٹھایا، تو علمائے آخرت نے اس کی سرکوبی کو اپنا فرض منصبی قرار دے کر اپنے تن من، دھن کو اس کے خلاف دھول دیا، یہی وجہ ہے کہ جب انگریز نے ڈپلومیسی، معاشی اور تعلیمی میدانوں میں مسلمانانِ ہند کو شکست دے کر عقائد کی تبدیلی میں اپنے عیسائی مشینریوں کو لایا، تو محسن اعظم حضرت مولانا رحمت اللہ کیرنویؒ اور ان کے رفقاء نے ان کے پاپاؤں کو ناکوں چنے چبھوانے مجبور کر دیا اور وہ بوریہ بستر گول کر کے واپس اپنے مستقر کو چلے گئے، اسی طرح حجۃ الارض فی الارض مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور ان کے قابل قدر رفقاء نے

میلہ خداشناسی اور پنڈت دیانند سرشوتی کے سامنے اسلام کے حقائق کو نہایت مضبوط دلائل سے پیش کر کے حق کے خوشبو سے پورے ارض ہند کو معطر کیا۔

اور جب انگریز کی یہ پالیسی ناکام رہی، تو "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے تحت مسلمانوں کے بخرے کر دیئے اور عقائد حقہ کی غلط تشریح کے لیے مختلف فرقے وجود میں لائے، تو علمائے دیوبند کے سپوتوں نے جہادی، تدریسی، سیاسی اور تبلیغی میدانوں کی طرح اس میدان میں بھی مناظروں، محاکموں ومباحثوں کے علاوہ تصنیف و تحقیق، افتاء وتالیف کے ذریعے بھی اس کام میں اپنا حصہ ڈال کر قادیانیت اور دوسرے فرقِ ضالہ و مبتدعہ کے عقائد واقوال اور اعمال وافعال سے پردے ہٹائے اور ان کے کفر وفسق کو واضح کر دیا۔

انگریزی سرپرستی میں جب قادیانیوں نے مختلف دعوے کر کے مسلمانوں کو اپنا پیروکار بنانے لگے، تو انہیں اکابرین نے قادیانیوں کو گمراہ فرقہ قرار دیا، مگر جب یہ عقائد ایمانی حدود سے تجاوز کر کے کفری سرحدوں کو چونے لگی، تو حکومت وقت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے قادیانیوں کے کفر کا فتویٰ جاری کر دیا اور ان سے ہر قسم کے تعلقات قطع کرنے کا فیصلہ کر دیا۔

کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ احکامات کا اقرار کرنے کے باوجود کفر واسلام کے ان فروق پر کتابیں لکھ کر عام مسلمانوں کے ذہنوں میں اشتباہ کو ختم کر دیا، اس میں مفتی غلام مصطفی امرتسری کشمیری کی کتاب "احسن التقریر فی احکام التکفیر" سر فہرست ہیں، مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے قادیانیوں اور دیگر فرق ضالہ کی کفری تحاریف سے عرب دنیا اور علمائے ہندوستان کو اس پیش آمدہ فتنوں سے خبردار کرنے کے لیے

"ضروریات دین" کے انکار کی بحث کو اپنے کتاب "اکفار الملحدین فی انکار شیٔ من ضروریات الدین" میں بیان کر دیا، امام المناظرین مولانا سید مرتضیٰ حسن نے "تحقیق الکفر والایمان" لکھ کر اس میں مزید اضافہ کر دیا، شیخ التفسیر مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے مسلمان اور کافر کی وضاحت کے لیے "احسن البیان فی تحقیق الکفر والایمان" لکھا یہ رسالہ ایک نہایت محققانہ کاوش تھی، جب کہ مذکورہ بالا امور کی تلخیص واضافہ کر کے مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے "وصول الافکار الی اصول الاکفار" لکھی اور علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب نے ایمان وکفر کا معیاری رسالۂ دارالعلوم سے ۱۹۵۳ میں قسط وار شائع کی۔

یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ علماء ہند کا یہ اقدام کچھ مخترع اور خود ساختہ نہیں بلکہ اس سے سینکڑوں برس قبل انہی کے روحانی آباء واجداد نے اس مسئلہ کو اپنے عصری انداز میں طشت از بام کیا، ان میں سے حجۃ الاسلام امام ابو حامد غزالی رحمہ اللہ قابل ذکر ہے جنہوں نے اپنی کتاب "فیصلۃ التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ" لکھی، اسی طرح علامہ ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ جنہوں نے "الاعلام بقواطع الاسلام" لکھ کر اس ذمہ داری کو کامیابی کے ساتھ نبھایا۔

علمی خدمت کے نام پر انگریزوں نے اردو کی ترویج وترقی کے لیے مختلف ادارے قائم کر کے کتب تفسیر، حدیث، تاریخ وفقہ وغیرہ کتابوں کے اردو تراجم علمائے کرام سے خدمت اردو کے نام پر کرا کے فتنۂ استشراق کے لیے بہم سامان پہنچاتے رہے اور مستشرقین تحقیق وتخریج کے نام پر مغرب میں قرآن وحدیث، فقہ وتاریخ کی غلط ترویج کرتے رہے، تاکہ اہل مغرب کے اذہان میں اسلام کی حقیقی تصویر

جا گزیں نہ ہو جائے اور اپنے مفتوحہ شہروں اور اطراف عالم سے مغرب آئے ہوئے سادہ لوح لوگوں کو تحقیق و تصنیف کے نام پر مذہب وملت سے بے رخ کر کے اپنے گماشتے تیار کریں، تاکہ دین واسلام کی غلط تشریح کر کے ان مفتوحہ شہروں کے مسلمانوں کو حضرات صحابہؓ وتابعینؒ، علماء ومشائخ سے بد ظن کر کے جہاد کو بربریت، خلافت کو ظلم وجبر اور تصوف وعلم الکلام کو بھنگ ودبھنگ قرار دیا جائے، ان کے ہاتھوں میں سیف وسنان کے بجائے ڈول وطبل پکڑایا جائے اور قرآن وحدیث، فقہ وکلام کو دہشت گردی قرار دے کران کے بجائے میوزک وگیتار کو وقعت کی نظر سے دیکھیں اور شعائر دینیہ کو ضیاع اوقات یااوہام واغلاط بنائیں اور مغربی طرز حکمرانی کو آئیڈیل بنا کر دین جمہوریت کی پوجا پاٹ میں لگ کر عیسائیت کی طرح دین ومذہب کوعبادت گاہ ومسجد تک محدود کرا کے اسلام کو چند رسوم اور دین چند عبادات کا نام دیں اور پارلیمنٹ کو چند آزاد خیال اور بیزار مذہب لوگوں کے فیصلوں کا مسکن بنائیں اور پھر انہی فیصلوں کو قرآن وحدیث کے مقابلے میں آئین کے نام سے فرض وواجب کا مرتبہ دیں اوران کے مقابلے کے پارلیمنٹ آئے ہوئے علمائے کرام کو ہر طرح کے طعن وتشنیع، ضد وتذلیل کا ہدف قرار دیں اور پھر من مانیاں کرتے ہوئے قرآن وحدیث کے صریح نصوص میں مذکور حدود کو دور از خیال سزائیں اور کالا قانون کہیں۔

اس سلسلے میں بھی انہی بوریہ نشینوں نے جہاں سیف وسنان کو تھامے ہوئے قلم وزبان سے کلمۂ حق کو بلند کیا، وہی نسل برصغیر کو انگریزوں اوران کے گماشتوں

کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے وہ کارنامے سرانجام دیئے، جس کی تاریخ کے لیے مستقل ضخیم جلدوں میں مشتمل کتابوں کی ضرورت ہے۔

اسی تسلسل میں فتنہ انکار حدیث کی صدا ہندوستان میں اٹھی تو علمائے دیوبند نے عظمت حدیث کے جذبے سے سرشار ہو کر ولی اللہی طرز اتباع میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے دیگر شاگرد میدان میں نکلے اور فتنہ انکار حدیث کا دامن پوری مستعدی سے چاک کر کے علمائے مصر کو بھی اپنا ہمنوا بنایا، جس کی تفصیل سلطان المناظرین علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب دامت برکاتہم ونفعنا بوجودہ وعلومہ نے اپنی کتاب "آثار الحدیث" کے ج ۲ ص ۴۳۸ پر خوب کی ہے۔

ان اکابر نے عوام وخواص کے سامنے فتنہ انکار حدیث کی سرکوبی منبر و محراب کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف، افتاء وتدریس پر بھی جاری رکھی، اس میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تدوین حدیث، مولانا کریم بخش مظفر گڑھیؒ کی ضرورت حدیث، مولانا مفتی رفیع عثمانی دامت برکاتہم کی کتابت حدیث، مولانا ادریس کاندھلویؒ اور شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی حجیت حدیث، مولانا بدر عالم میرٹھی کا مقدمہ ترجمان السنۃ، حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ کی قرآنی معیار، مولانا سرفراز خان صفدرؒ کی انکار حدیث کے نتائج اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی فہم القرآن وغیرہ کتب سرفہرست ہیں، یہاں تک کہ عرب دانشوروں کے مفید کتابوں کے کامیاب اردو تراجم کئے جس کی ایک مثال شیخ مصطفی سباعی رحمہ اللہ کی نفیس کتاب "السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی" کا وہ ترجمہ ہے جو مرکز علم و عمل بنوری ٹاؤن سے شائع شدہ ہے، شیخی وسندی استاذ المحدثین مولانا سلیم اللہ خان صاحب دامت

برکاتہم کے "کشف الباری" ج ا میں آپ اس فتنے کے خلاف کافی مواد دیکھ سکتے ہیں۔

کفر وشرک ، الحاد وارتداد، بدعات وفسوق کے سامنے سد سکندری باندھنے والے یہی علمائے آخرت ہی تھے، جنہوں نے روکھی سوکھی، گرم ونرم اور تزک واحتشام کو بالائے طاق رکھ کر دین محمدیہ ﷺ کی تشریحات کو صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کے نہج پر امت مسلمہ کے ہر فرد اور اطراف کے کونے کونے اور چپے چپے تک پہنچا کر ایمان واسلام اور اعمال وافعال کی وہی تعبیرات محفوظ انداز میں عملی صورتوں اور حقیقی مصداقات کے ساتھ من وعن یکے بادیگرے معین اور مخصوص کردی اور اس کے اصول وضوابط، قواعد ونظائر وضع کرکے آئندہ آنے والے فتنوں کی سرکوبی کے لیے علمائے امت کے لیے رہنمائی کا سامان بہم رکھا، تاکہ کفر وضلال کے آنے والے لیڈر وکارکن زندقہ والحاد کے نئے خوشنما تعبیرات کے جھانسے میں نصوص قرآنیہ اور فرامین نبویہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) کے ارشادات کو معروف ومتواتر شرعی معانی سے نہ نکال سکیں اور نہ ہی اسلامی قوانین کی تشریحات وتوضیحات کے باب میں ایسی تاویلیں ذکر کریں، جو چودہ سو سالہ عرصہ میں کسی بھی عالم دین نے نہ کی ہو اور اگر کسی نے ایسا کیا، تو قرآنی اصطلاح اور اسلامی زبان کی روشنی میں یہ آدمی ملحد ہے۔

عصر حاضر میں اسی الحاد وبے دینی نے سیکولرازم کا لبادہ اوڑھ کر حقوق انسانی، مساوات، آزادی، تحقیق وریسرچ، قانون دوٗلی اور تعلیم وتہذیب کے نام پر انسانوں کو روحانیت سے بیگانہ کرکے مادیت کا گرویدہ بنانا دین اسلام کے احکامات کو انسانی

آزادی کے منافی قرار دے کر دین کو زندگی کے تمام شعبہ جات سے الگ کرنا سیکولر ازم کی بنیادی اہداف ہیں۔

مغربی بالادستی کی بقاء کے لیے کج فکر مسلمانوں نے ڈارون کی "نظریہ ارتقاء"، فرائیڈ" کی "نظریہ جنسیت" ڈارکایم کی "نظریہ عقلیت"، جان پول سارتر کی "نظریہ وجودیت"، آدم اسمتھ کی "کیپیٹل ازم" اور کارل مارکس کی "کمیونزم وسوشلزم" کی اتباع کر کے امت مسلمہ کو اسلام سے بے زار کیا اور مادیت پرستی کے بت کا گرویدہ بنادیا، جس نے خلافت جیسے عظیم نعمت سے محروم کر دیا، اگرچہ ان بوریہ نشین علماء کرام نے ان کا بھی تعاقب کیا، جدید منکرِ اسلام فلسفے کی کمزوریاں ظاہر کرنے کے لئے ایک بہترین مثال کتاب "موقف العقل والعلم والعالم من رب العالمین الی عبادہ المرسلین" کی دی جاسکتی ہے جو خلافت عثمانیہ کے آخری شیخ الاسلام شیخ مصطفی صبری کی قلم سے ہے جس کو "کتاب القرن" کہا جاتا ہے، اگر ماہر اردودان اس کا ترجمہ کرے تو دینی لٹریچر میں ایک بہترین اضافہ ثابت ہوگا۔

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

سیکولرازم کے ان مقاصد کی روشنی میں بہ آسانی یہ کہنا بجا ہوگا کہ تاریخ اسلامی میں اس سے بڑی مصیبت امت مسلمہ پر نہیں اتری، جس نے مرد وزن، چھوٹے بڑے اور جوان وبوڑھے سے ایمان کا نعمت تک بھی چھیننے کی کوشش کرنی شروع کر دی اور دین ومذہب، قرآن وسنت اور اکابر ومشائخ سے بدظن کر کے بس صرف نام کے مسلمان باقی چھوڑ دیئے۔

اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی احکامات کی تضحیک وتذلیل، تمسخر و تبدل کرنے والوں کے بارے میں اپنے پیش روائمہ دین، اکابر و مشائخ کی پیروی میں از سر نو جائزہ لے کر سیکولر ازم کے متبعین کے فقہی احکامات واضح کریں، اس کی نشاندہی فقیہ امت محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے بھی فرمائی تھی، آپؒ فرماتے ہیں:

قرآن کریم نے الفاظ کفر، نفاق، الحاد، ارتداد کو جو استعمال فرمایا ہے، تو جب تک روئے زمین پر قرآن کریم موجود رہے گا، یہ الفاظ بھی انہی معانی میں باقی رہیں گے۔اب یہ علمائے امت کا فریضہ ہے کہ وہ امت کو بتلائیں کہ ان کا استعمال کہاں کہاں صحیح ہے اور کہاں کہاں غلط ہے؟ یعنی یہ بتلائیں کہ جس طرح ایک شخص یا فرقہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد مومن ہوتا اور مسلمان کہلاتا ہے اسی طرح ان ایمان کے تقاضوں کو پورا نہ کرنے والا شخص یا فرقہ کافر اور اسلام سے خارج ہے، نیز علمائے امت کا یہ بھی فرض ہے کہ ان حدود وتفصیلات کو یعنی ایمان کے تقاضوں کو اوران کے کفریہ عقائد واعمال وافعال کو متعین کریں، جن کے اختیار کرنے سے ایک مسلمان اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، تاکہ نہ کسی مومن کو کافر اور اسلام سے خارج کہا جاسکے اور نہ کسی کافر کو مومن و مسلمان کہا جاسکے، ورنہ اگر کفر وایمان کی حدود اس طرح مشخص و متعین نہ ہوئیں تو دین اسلام بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا اور جنت وجہنم افسانے۔۔ ۔۔۔ غرض یہ ہے کہ علماء پر۔کچھ بھی ہو۔رہتی دنیا تک یہ فریضہ عائد ہے اور رہے گا کہ وہ کافر پر کفر کا حکم اور فتویٰ لگائیں اور اس میں پوری پوری دیانت داری اور علم و تحقیق سے کام لیں اور ملحد وزندیق پر الحاد وزندقہ کا حکم اور فتویٰ لگائیں اور جو بھی فرد یا فرقہ قرآن وحدیث کی نصوص وتصریحات کی رو سے

اسلام سے خارج ہو اس پر اسلام سے خارج اور دین سے بے تعلق ہونے کا حکم اور فتویٰ لگائیں، جب کہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہو، قیامت نہ آجائے۔

چونکہ ایمان واسلام، اسلامی معاشرہ، اسلامی شعائر اور مسلمانوں کے دین وایمان کو ملحدوں، افتراءپردازوں اور جاہلوں کے جارحیت سے بچانا علمائے حق اور فقہائے امت کے ذمہ فرض ہے۔

اسی طرح اصول تکفیر کو بھرپور انداز سے واشگاف کرنا بھی ایک واجبی امر تھا، اصول تکفیر پر پہلے بھی اکابر امت کی طرف سے قلم اٹھایا گیا تھا، لیکن مسئلہ اصولی، اعتقادی اغلاق کی وجہ سے پھر بھی تشنہ رہا، اس ضرورت و تشنگی کو ہمارے محترم دوست، رفیق کار، فاضل نوجوان حضرت مولانا مفتی عبید الرحمن صاحب نے پورا کیا اور نہایت عرق ریزی اور دقت نظر سے اس کو نبھایا۔

امر واقعہ یہ ہے کہ فاضل مؤلف کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے گوناگوں خصوصیات سے مالامال کیا، مولانا عاجزی وانکساری کے پیکر ہے اور علمی وکتابی آدمی کا درست مصداق ہے، میں جب بھی ان سے ملا کسی مسئلہ فقہیہ، کلامیہ، نحویہ وغیرہ پر بحث وتمحیص کرتے ہوئے پایا، فاضل مؤلف نے اس سے پہلے بھی ایک بہت وقیع قضیہ پر قلم اٹھایا تھا جس کا عنوان "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" ہے جو راقم کے مقدمہ کے ساتھ چھپ بھی چکا ہے، زیر نظر کاوش میں بھی فاضل مؤلف نے اپنے جستجو، قابلیت اور مطالعہ شناسی کے گوہر بکھیرے ہے۔

مسئلہ کی نزاکت اور باریک بینی کی وجہ سے میں نے تقریباً بالاستیعاب پڑھ ڈالا، امر واقعہ یہ ہے کہ کتاب دیکھنے سے پہلے مجھے یقین نہیں تھا کہ اتنے بہترین مباحث کو

اس کتاب میں ترتیب کے ساتھ سمو دیا گیا ہے میں نے جیسے ہی تحریر پڑھنا شروع کیا تو مجھے اپنی طرف کھینچتا چلا گیا اور دوسرے مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر اس تحریر سے کافی مستفید و محظوظ ہوا، دوران مطالعہ جہاں جہاں مجھے کوئی بات اٹکی تو اسے تبدیل کیا اور فاضل مؤلف کو مشورہ بھی دیا، ان کی رحابت صدری اور وسیع ظرفی تھی کہ کہ اس کمترین خلائق کے مشوروں کو قبول فرما کر اس زیر عمل لائے، میرے خیال میں جدید لٹریچر کے اندر یہ کتاب ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ ان کے اس کتاب کو قبولیت عطا فرما کر امت مرحومہ کے لیے ذریعۂ نجات ہمارے اور ان کے لیے وسیلہ آخرت میں خلاصی کا سبب بنائیں۔

محمد سجاد الحجابی۔٦ ربیع الاول ٣٨ھ

پیش لفظ

نحمده ونصليّ على رسوله الكريم، اما بعد:

امت مسلمہ تاریخ کے جن کٹھن مراحل سے گزر رہی ہے اس پر ہر درد دل رکھنے والا مسلمان اشکبار ہے، ہر دن طلوع ہوتے ہی سورج کی کرنیں کسی نئی مصیبت و آزمائش کا نوید سناتی ہیں رات کے اندھیرے اس بے چاری امت کے نہال بدن پر مصائب کے نت نئے پہاڑ تھوپ ڈالتے ہیں، عالم عرب خصوصاً انبیاء کرام علیہم السلام کی سرزمین شام کے اندر ہونے والے نت نئے مظالم اتنے عروج و ترقی پر ہے کہ جس نے پوری دنیا کے مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا ہے، اس صورت حال میں جہاں امت کی اپنے دین و مذہب سے بے رخی و غفلت وغیرہ اسباب و عناصر کا دخل ہے وہیں کفر واسلام اور اس کے واقعی حدود و قیود نہ پہچاننے کا بھی اس میں بڑا کردار ہے۔

ایمان و کفر کا مسئلہ دین اسلام بلکہ کسی بھی دین و مذہب کی پہلی کڑی یہی ہوتی ہے کہ اس کے حدود و قیود، اس کے حمایت کرنے والوں اور مخالفت کرنے والوں کے درمیاں خط فاصل واضح کیا جائے اس لئے اس دین فطرت نے روز اول ہی سے اس پر بھرپور توجہ دی اور اس کے حدود و قیود کو واضح کر رکھا۔

ایک طرف تو دینِ حق کی اس قدر توجہ اور عنایت ہے دوسری طرف اس کے ماننے والے عالم اسلام کی مجموعی صورتِ حال ہے جس پر غور کرنے کے بعد ہر درد دل رکھنے

والا مسلمان انگشت بدندان ہے، ایک طرف وہ جماعت ہے جس کے خیال میں اپنے سوا ہر مخالف کافر ہے چاہے وہ کوئی اور کیسا ہی کیوں نہ ہو اگر ان کے ساتھ ظنی مسائل میں بھی کوئی اختلاف کرے تو برملا اس کو کافر و مشرک قرار دیتی ہے بلکہ کئی بار تو محض طرزِ فکر یا اندازِ عمل اور مزاج کے خلاف کرنے کی وجہ سے اس قسم کے فیصلہ کئے جاتے ہیں ان کی جرأت و بے باکی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ ان کی ڈکشنری میں لفظ کفر سے ہلکا کوئی لفظ موجود ہی نہیں اور ان کے خیالات و طرزِ عمل ہی وہ واحد سفینہ نجات ہے جس سے ذرا برابر نکلہ نا ہی طوفانِ کفر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غرق یاب ہونے کے مترادف ہے۔

اسی افراط کے دوسرے بالکل متوازی کنارے پر کچھ مسلمان ہیں جو کسی واقعی کافر کو کافر کہنے سے بھی نالاں ہوتے ہیں، ان کی سخاوت کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرے جس کی وجہ سے وہ تمام فقہائے کرام اور متکلمین کے اتفاق سے کافر ہو جاتا ہو اور اس کی تکفیر کرنی ضروری ہو جاتی ہو تو بھی یہ لوگ اپنی بے پناہ فیاضی سے اس کو مسلمان قرار دینے اور خیال کرانے پر ڈٹے رہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اب دنیا میں کفر کے فیصلہ کا اختیار ہمیشہ ہمیشہ ایسا ہی سلب ہوا جس طرح حضور ﷺ کی تشریف آوری سے مزید نبوت کے دروازے کو تالا لگا۔

اہلِ علم سے مخفی نہیں کہ کفر و تکفیر کا فیصلہ نہایت ہی احتیاط و نزاکت کا متقاضی ہے اس میں ذرہ بے احتیاطی بھی خطرناک بلکہ نہایت خطرناک ہے یہ ایک ایسی غلطی ہے جو صرف اپنی جگہ ہی پر محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے بنیاد پر دینی احکام کا ایک طویل سلسلہ مرتب ہوتا ہے جس میں دنیا و آخرت کے بیسیوں احکام پروئے ہیں اس لئے اس

باب میں ایک غلطی بھی بہت سی غلطیوں کی جڑ ہے، کسی کو کافر کہنا صرف زبانی بات ہی نہیں، بلکہ اس کا مطلب اس کو ان تمام حقوق سے محروم کرنا ہے جو خدا ورسول کی طرف سے ایک مسلمان کے لئے ثابت ہوتے ہے، مزید اس کے جرم عظیم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے اپنی کتاب " الشفاء بتعريف حقوق المصطفیٰ" میں علامہ ابوالمعالی رحمہ اللہ سے نقل فرمایا کہ:

ان إدخال كافر في الملة وإخراج مسلم عنها عظيم في الدين.

"کسی کافر کو ملت اسلام میں داخل کرنا اور کسی مسلمان کو اس سے نکالنا دینی لحاظ سے بڑا (اور نہایت نازک) معاملہ ہے"[1]

جغرافیائی، علاقائی، لسانی، نسلی وغیرہ ہزاروں فاصلوں کے باوجود بھی پوری امت مسلمہ جسم واحد کی مانند ہے اگر کہیں جسم میں کوئی عضو ایسا سڑ جائے کہ اس کی بیماری متعدی ہو دیگر اعضاء وجوارح کا اس سے متاثر ہونے کا خدشہ یقینی ہو جائے تو اس جسم کے سلامتی کا واحد علاج یہی تجویز ہوتا ہے کہ اس عضو کو جسم سے بروقت کاٹ کر جدا کر لیا جائے، اگر مریض پر نرمی وشفقت کے خیال سے اس میں تاخیر کی جائے تو اس کا جو کچھ نتیجہ ظاہر ہوگا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اسی طرح اگر اسی جسم انسانی کے اندر بے ڈھنگے پن کے ساتھ چرند وپرند وغیرہ چیزوں کو ملا دیا جائے تو بھی یہ جسم متوازن

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، فصل فى تحقيق القول فى اكفارالمتأولين، ج٢ص٢٧٧.

نہیں رہ سکتا بلکہ اس احمقانہ حرکت کے بعد اگر کچھ زندگی نصیب بھی ہو جائے تو بھی ایسی اجیرن ہو گی کہ اس کے مقابلہ میں موت بھی بھلی معلوم ہو گی۔

بس یہی کچھ صورت حال اسلام اور امت مسلمہ کا بھی ہے اگر شریعت کے مقرر کردہ اصول وضوابط کے مطابق کوئی شخص واقعی کافر ہے تو اس کو زبردستی اسلام کے اندر ٹھونسنا پوری ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچانا ہے اور اگر ان مقرر کردہ قواعد کے مطابق کسی کو کافر قرار دینا جائز نہ ہو تو اس کو خواہ مخواہ کافر قرار دینا ایسا ہی احمقانہ جرم ہے جیسا بلا ضرورت کوئی انسان کا عضو کاٹے، محض گناہ کبیرہ کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا ایسا ہی ہے جیسا کوئی معمولی پھوڑے پسری کی وجہ سے ایسا طریقہ علاج تجویز کرے جبکہ اس کے علاج کے لئے اور سہل اور مفید تدبیریں موجود ہوں۔

موضوع کی اسی نزاکت کی وجہ سے عرصہ دراز سے تلاش وانتظار تھا کہ علم و عمل سے مالامال کوئی شخصیت اس موضوع پر ایسا جامع تحقیقی کام کریں جس سے اس موضوع کے متعلق پائے جانے والے تمام اشکالات وتشنگیاں دور ہو جائیں کیونکہ عالم اسلام کو موجودہ انتشار، خلفشار اور کسمپرسی کے عالم میں اس کی شدید ضرورت ہے۔

اس باب میں حضرت العلامۃ مولانا انور شاہ کشمیری صاحب رحمہ اللہ کی کتاب "اکفار الملحدین" کو خوب شہرت حاصل ہے، لیکن حضرت کے پیش نظر تکفیر کے اصول و قواعد کو جمع کرنا نہیں تھا بلکہ کتاب لکھنے کا اصل باعث یہ بنا تھا کہ قادیانیت، ان کے باطل عقائد اور ضروریات دین میں ان کی بے جا تاویلات کا پردہ چاک کیا جائے، اس مقصد کے لئے یہ کتاب انتہائی مفید ثابت ہوئی، لیکن چونکہ مقصود صرف یہی کچھ تھا،

اس لئے تکفیر کے تمام اصول وضوابط سے تعرض بھی نہیں فرمایا ورنہ اگر حضرت رحمہ اللہ اس موضوع پر کچھ لکھتے تو آج کسی کو لکھنے کی ضرورت نہیں رہ پاتی۔

اس کے علاوہ اردو زبان میں "اصول تکفیر" کے نام سے مولانا پیر محمد چشتی صاحب کی بھی ایک کتاب دستیاب ہے[1]، یہ کتاب اگر حشو وزوائد، بے جا تعصب، ردوقدح میں حد سے غلو وافراط وغیرہ کمزوریوں سے خالی ہوتی اور ان امور میں توجہ واستعداد صرف کرنے بلکہ یوں کہئے کہ ضائع کرنے کے بجائے خود اصول تکفیر ہی پر پوری توجہ مرکوز رکھی ہوئی ہوتی تو امید کی جاسکتی تھی کہ کسی حد تک یہ کتاب امت کے حق میں مفید ثابت ہوتی۔

لیکن اب تو صورت حال یہ ہے کہ ان تمام عناصر کے ساتھ ساتھ کتاب میں جابجا اکابرین ہند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، رحمہم اللہ وغیرہ حضرات پر کفر کے فتوے داغے گئے ہیں، کفریہ امور کی مثال کے طور پر ان حضرات کی عبارات نقل کر کر کے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ انہوں نے متفقہ طور پر التزام کفر کا ارتکاب کیا ہیں جس کے بعد ان کو کافر قرار دینا ضروری ہے، اس سے بسا اوقات قاری کو یہ تاثر ملتا ہے کہ کتاب کا مقصود اسی افسوسناک تسلسل کو دہرانا ہے جو آج سے تقریباً ایک صدی پہلے "حسام الحرمین" کے نام سے تاریخ کے سیاہ صفحات میں ثبت ہے۔

---

[1] ابھی تقریباً سال پہلے ان کا انتقال ہوا اللہ تعالیٰ مغفرت نصیب فرمائے۔ رحمانی

جب تلاش بسیار کے باوجود اس پر کوئی ایسا جامع کام نظر نہیں آیا، ایک آدھ جگہ اس پر جو محنت ہوئی بھی، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں، وہ اس طرز کی نہیں کہ ملت اسلامیہ کی درپیش ضرورت پوری کرسکے، کئی سالوں کے انتظار کے بعد جب ہر طرف سے مایوسی ہی مایوسی چھاگئی تو بالآخر اللہ اللہ کرکے اس کام کی ابتدا کی گئی۔

کتاب کی ترتیب یہ رکھی گئی ہے کہ اس کو کل پانچ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے، پہلے باب میں ایمان و کفر کی لغوی واصطلاحی تحقیق، دونوں کے درمیان نسبت، ایمان کی شرائط اور کفر کی قسمیں ذکر ہیں، باب دوم کے اندر تکفیر کے باب میں ہونے والے افراط و تفریط کی نشاندہی، اس کے نقصانات، اور قرآن وسنت اور ائمہ اسلام کی روش سے اس باب میں حد اعتدال پر رہنے کے مختلف مظاہر کی تفصیل ذکر کی گئی، اس ضمن میں اہل قبلہ اوران کے تکفیر کا مسئلہ، گناہ کبیرہ کے بنیاد پر کسی کو کافر قرار دینے کا مسئلہ اور فقہاء کرام کے ذکر کردہ الفاظ کفر کی بناء پر تکفیر کا حکم لگانے کے تفصیلات بیان کئے گئے ہیں۔

باب سوم میں کفر و تکفیر کے ارکان، مکفِر (فاء کے کسرہ کے ساتھ)، **مکفَر** (فاء کے فتحہ کے ساتھ) اور **مکفَر** کے اعتبار سے اس کی شرائط اور دنیا و آخرت میں اس پر متفرع ہونے والے مختلف احکام کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس ضمن میں تکفیر مطلق اور تکفیر معیّن، تکفیرِ فرد اور تکفیرِ جماعت/طائفہ، موانع تکفیر اور تاویل کے معتبر ہونے کی شرائط بھی ذکر کئے گئے ہیں۔

باب چہارم میں ضروریات دین کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا اور یہ تفصیل بھی ذکر کی گئی کہ مدار تکفیر ضروریات دین کا انکار ہے یا ساتھ ساتھ قطعیات دین کا انکار بھی کفر

ہے ؟اس کے ساتھ ساتھ قول و عمل کے موجب کفر بننے کا ضابطہ، استحلال واستخفاف کے موجب کفر بننے کی شرائط بھی زیر بحث آئیں اور آخر میں تکفیر کا جامع اور منضبط ضابطہ بھی تحریر کیا گیا، باب پنجم میں سیکولرازم کی تاریخ، اہداف و مقاصد،اس کے متعلق علماءامت کے انفرادی واجتماعی آراءاوراس کا شرعی حکم تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

پیش لفظ کو ختم کرنے سے پہلے میں حضرات اہل علم سے بصد ادب یہ عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ ایمان وکفراور اس کے حدود وقیود متعین کرنے کا مسئلہ جس قدر دِقّت اور نزاکت کا حامل ہے اسی قدر موجودہ دور میں اس کی اہمیت وضرورت بھی کچھ کم نہیں ہے، پھر یہ ضرورت بھی کسی خاص فرد یا کسی ایک مکتبہ فکر کے ساتھ مختص نہیں ہے بلکہ جب مسئلہ ہی ایمان وکفر کے حدود ومعیارات واضح کرنے کا ہے تو وحدت کے اس سنہری لڑی میں پروئے ہوئے تمام حضرات پراس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی استطاعت کے بقدراس کی حفاظت کریں،اسی خدمت کے پیش نظراس کتاب کی اشاعت گوارا ہوئی۔

میں نے اس کتاب کی تیاری میں اپنی بساط بھر کوشش کی ہے کہ کوئی بات بے دلیل ذکر نہ ہو، لیکن باین ہمہ مجھے اس کے مضامین کے سو فیصد درست ہونے کا دعویٰ ہے نہ اس کو حرف آخر کہنے کا خیال، بلکہ کھلے دل سے اعتراف ہے کہ اس نازک موضوع کے لئے جس قدر علم واطلاع، پختگی و تجربہ، تقویٰ وتدین اور فصاحت وبلاغت کی ضرورت ہے میں اس سے سراسر محروم ہی محروم ہوں،اس لئے بہت سے غلطیاں ہو چکی ہوں گی، اگر کسی صاحبِ علم کو اس میں کسی بھی قسم کی کوئی کمزوری، غلطی یا

کوتاہی نظر آئے تو براہ کرم اس ناکارہ کو ضرور متنبہ فرمائیں، جو غلطیاں سالوں یا صدیوں بعد انتشار وافتراق کا ذریعہ بن سکتی ہیں ان کو اگرابھی سے بروقت نمٹایا جائے تو بے چاری امت مسلمہ مزید ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ سکے گی ورنہ ماضی کی تاریخ میں عبرت کے ہزار سامان موجود ہیں۔

رب کریم کے بے حد وحساب حمد وشکر کے بعد میں ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کی تیاری سے لے کر طباعت تک کسی بھی طرح اس ناکارہ کے ساتھ تعاون کیااللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو دین ودنیا میں بہترین جزائے خیر عطافرمائیں۔

ناکارہ خلائق: عبیدالرحمن رحمانی

دارالافتاءدارالعلوم الرحمانیہ، مردان

یکم ربیع الاول ۳۸ھ

باب اول

- ❖ ایمان کی لغوی اور اصطلاحی تعریف
- ❖ کفر کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق
- ❖ ایمان اور کفر کے درمیان نسبت
- ❖ اصولِ دین
- ❖ شرائطِ ایمان
- ❖ کفر کی مختلف اقسام اور متنوع صورتیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایمان کی لغوی تعریف

لغت میں لفظ ایمان دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے:

ا۔ "ایمان" "امن سے" "باب افعال" کا مصدر ہے، "امن" "مطمئن ہونے اور بے خوف ہونے کو کہا جاتا ہے باب افعال میں استعمال ہونے کی وجہ سے چونکہ عام طور پر فعل متعدی ہو جاتا ہے اسلئے اس لحاظ سے اس کا معنی ہے کسی کو امن دینا، بے خوف کرنا، کسی کو اعتماد و یقین دلانا، اس معنی کے لحاظ سے ایمان کو ایمان اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے اسلام قبول کرنے والا مخاطب کو اس بات کا اطمینان دلاتا ہے کہ میں تکذیب نہیں کروں گا۔

نیز باب افعال کی ایک خاصیت تصییر بھی ہے یعنی صاحب ماخذ بننا مثلاً الحم زید کا معنی ہے کہ زید صاحب لحم بنا یعنی موٹا ہو گیا، اس لحاظ سے ایمان کا معنی ہے "صاحبِ امن بننا" اور اس خاصیت کی بناء پر ایمان کو ایمان اس لئے کہا جاتا ہے کہ دنیا میں جب تک انسان اسلام قبول نہیں کرتا اس وقت تک اس کا جان و مال مامون و محفوظ نہیں، اسلام قبول کرنے سے ہی وہ معصوم بن جاتا ہے اسلئے اسلام میں داخل ہونے کو ایمان کہا جاتا ہے۔

۲۔ایمان کا دوسرا معنی "تصدیق" ہے یعنی کسی کو سچا سمجھنا،اس کی توثیق کرنا،اس کی طرف سچائی کی نسبت کرنا، چونکہ اس معنی میں کسی کی "تصدیق " کرنے کی وجہ سے خود بھی حفاظت ہو جاتی ہے اور مخاطب بھی مطمئن ہو جاتا ہے اسلئے اس مناسبت کی وجہ سے تصدیق کو ایمان کہا جانے لگا گویا یہ "تسمية الشئ باسم مسببه" کے قبیل سے ہے۔

بعض متکلمین نے اس کو لغوی معنی ماننے سے انکار فرمایا لیکن بہت سے محققین کے نزدیک خود لغت کے اندر بھی ایمان تصدیق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

علامہ احمد بن فارس (المتوفی ۳۹۵ھ) تحریر فرماتے ہیں:

(أمن) الهمزة والميم والنون أصلان متقاربان: أحدهما الأمانة التي هي ضد الخيانة، ومعناها سكون القلب، والآخر التصديق.[1]

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی یہی لکھا کہ تصدیق ایمان کا لغوی معنی ہے، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

(والإيمان) في اللغة التصديق، أي إذعان حكم المخبر وقبوله وجعله صادقاً، إفعال من الأمن، كان حقيقة آمن به آمنه من التكذيب، والمخالفة.

"ایمان لغت میں تصدیق کرنے کو کہا جاتا ہے (تصدیق کرنے کا مطلب) خبر دینے والے کی بات کے یقین کرنا، قبول کرنا اور اس کو سچا سمجھنا ہے، باب

---

[1] مقاييس اللغة، باب الهمزة والميم وما بعدهما في الثلاثي،ص١٣٣.

افعال کا صیغہ ہے (اوراس کو ایمان اس لئے کہتے ہیں کہ) گویا ایمان لانے والے نے تکذیب و مخالفت سے مطمئن کر دیا۔"[1]

اس عبارت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس نکتہ پر بحث فرمائی ہے، اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ایمان ان دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے دونوں اس لفظ کے حقیقی معانی ہیں مگر چونکہ اس لفظ کا اصل مادہ امن ہی ہے اور اس لحاظ سے پہلے معنی میں استعمال ہوتا ہے دوسرے معنی میں اسی پہلے معنی کی مناسبت سے استعمال ہوا کہ چونکہ تصدیق کرنے کے نتیجہ میں تکذیب سے امن ہو جاتی ہے، اس مناسبت سے تصدیق کو بھی اہل لغت نے ایمان کہنا شروع کر دیا اسلئے گویا پہلا معنی حقیقی اور دوسرا مجازی ہے۔[2]

اصطلاحی تعریف

ایمان کی اصطلاحی تعریف علم حدیث اور علم کلام دونوں علوم کا ایک معرکۃ الاراء مسئلہ ہے، اس میں مختلف اقوال ہیں ہر جماعت نے ایمان کی تعریف بھی اپنے مزعومات کے سانچے میں ڈال دی ہیں، لیکن چونکہ اس تحریر کا اصل مقصود اہل سنت والجماعت یعنی اشاعرہ اور ماتریدیہ کے ایمان و تکفیر کے قواعد واصول کی وضاحت ہے، اس لئے ان حضرات کے علاوہ دیگر فرقوں اور مکاتب فکر کے تعریفات سے قصداًاعراض کیا جاتا ہے، یہاں صرف اشاعرہ اور ماتریدیہ کے مسلک کے مطابق ہی اس مسئلہ کی تفصیل ذکر

---

[1] شرح العقائد النسفية ص: ٦٩

[2] ملاحظ النبراس، ص٢٤٥، ٢٤٦

کی جاتی ہے۔

حضرات اشاعرہ اور ماتریدیہ کا موقف

لفظ "ایمان" کا لغوی معنی جو ابھی تحریر کیا گیا، شریعت میں بھی اس معنی (تصدیق) کا لحاظ رکھا گیا تاہم اس میں چند قیودات لگائی، چنانچہ علامہ عضدالدین الایجی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۷۵۶ھ) اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وأما في الشرع وهو متعلق ما ذكرنا من الأحكام فهو عندنا وعليه أكثر الأئمة كالقاضي والأستاذ التصديق للرسول فيما علم مجيئه به ضرورة فتفصيلا فيما علم تفصيلا وإجمالا فيما علم إجمالا.

"ہمارے اور دیگر اکثر ائمہ کرام کے نزدیک ایمان شریعت کی اصطلاح میں ان امور میں حضور ﷺ کی تصدیق کا نام ہے جو آپ ﷺ سے بداہت کے ساتھ ثابت ہو، تفصیلی امور میں تفصیلی تصدیق کرنا اور اجمالی امور میں اجمالی تصدیق کرنا ضروری ہے۔"[1]

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۷۹۳ھ) بھی یہی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اعلم أن الإيمان في الشرع:

(هو التصديق بما جاء به من عند الله تعالى) أي تصديق النبي عليه

---

[1] المواقف، المقصد الأول في حقيقة الإيمان، ج۳ص۵۲۷.

السلام بالقلب في جميع ما علم بالضرورة مجيئه به من عند الله تعالى إجمالاً[1]

فوائد قیود

۱- التصديق للرسول:

لفظ "تصدیق "کا استعمال تین طرح ہوتا ہے:

الف: منطقی تصدیق: علم منطق کی اصطلاح میں تصدیق" معرفت اور ادراک نسبت" کا نام ہے یعنی کسی بھی جملہ (قضیہ) کے دونوں طرفوں کے درمیان نسبت کا ادراک۔

ب: لغوی تصدیق: کسی کی طرف سچائی کی نسبت کرنا یعنی کسی کو سچا کہنا۔

ج: شرعی تصدیق: شریعت میں ان دونوں امور کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حضور ﷺ اور اس کے لائے ہوئے تمام تعلیمات کو تسلیم وقبول بھی کیا جائے۔

گویا شریعت میں تصدیق کے معتبر ہونے کے لئے تین چیزیں ضروری ہے:

(۱) دل میں معرفت۔

(۲) حضور ﷺ کو صادق سمجھنا۔

(۳) حضور ﷺ کے لائے ہوئے تمام ثابت شدہ تعلیمات کو دل وجان سے تسلیم کرنا۔

---

[1] المصدر السابق

یہاں ایمان کی تعریف میں جو لفظ تصدیق مذکور ہے، اس سے یہ آخری تصدیق ہی مراد ہے، ایمان معتبر ہونے کے لئے یہی تصدیق ضروری ہے، محض لغوی یا منطقی تصدیق ہر گز کافی نہیں۔

چنانچہ علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ليس حقيقة التصديق أن يقع في القلب نسبة الصدق إلى الخبر أو المخبر من غير إذعان وقبول، بل هو إذعان وقبول لذلك بحيث يقع عليه اسم التسليم على ما صرح به الإمام الغزالي. وبالجملة هو المعنى الذي يعبر عنه بالفارسية بكرويدن.

"تصدیق صرف اس کا نام نہیں کہ دل میں بات کہنے والے یا اس کی بات کے متعلق سچائی کا خیال رکھا جائے نہ اس کو قبول کرے نہ اس پر یقین کرے، بلکہ تصدیق کسی بات پر اس طور پر یقین رکھنے اور اعتماد کرنے کو کہا جاتا ہے کہ اس کو مکمل طور پر تسلیم کرے جیسا کہ امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کی صراحت کی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں تصدیق سے وہی چیز ہے جس کو فارسی زبان میں "گرویدن" کہا جاتا ہے۔"[۱]

۲۔ تعریف میں دوسری اہم قید لفظ "بالضرورۃ" کی ہے۔

لفظ ضروری کے مختلف استعمالات ہیں اور ہر استعمال میں اس کا ایک الگ اور خاص معنی ہوتا ہے، کبھی یہ "علم اکتسابی" کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے اس صورت میں اس کا معنی ہوتا ہے وہ علوم جو مخلوق کے قدرت و اختیار سے باہر ہو، کبھی یہ لفظ استدلالی کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور اس صورت میں اس سے مراد وہ علوم ہوتے ہیں جو فکر و نظر کو بروئے کار لانے کے بغیر ہی معلوم ہوتے ہیں، کبھی بدیہی کے مترادف

---

[۱] المصدر السابق.

کے طور پر بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، یہاں ایمان کی تعریف میں اس لفظ سے کیا مراد ہے؟اس میں متکلمین کے تین مختلف آراء ہے:

۱۔ضروری یہاں استدلالی کے مقابلے میں ہےاوراس سے مراد یہ ہے کہ جو چیزیں غور وفکر کے بغیر محض حضور ﷺ کی زبان مبارک سے براہ راست سنے یاتواتر کے ساتھ حضور ﷺ سے ثابت ہو، ان کی تصدیق کی جائےاوران پر ایمان لایا جائے۔

۲۔ بعض متکلمین کی رائے یہ ہے کہ یہاں ضرورت بمعنی یقین ہے یعنی جواحکام حضور ﷺ سے یقینی طور پر ثابت ہوان کی تصدیق ایمان ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص کسی ایسی چیز کاانکار کرے جو حضور ﷺ سے ثابت ہو لیکن ثبوت یقینی نہ ہو بلکہ ظنی ہو تو اس کو کافر نہیں کہاجائے گا۔

۳۔جمہور متکلین کی رائے یہ ہے کہ یہاں ضرورت سے سابقہ دونوں معانی مراد نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ شریعت کے جواحکام اس طور پر عام ہوں کہ عوام وخواص کو اس کا دینی حکم یااسلامی عقیدہ ہونا معلوم ہو توان جیسےاحکامات کی تصدیق ایمان کیلئے شرط ہے،اگر کوئی شخص کسی ایسے حکم کاانکار کرے جس کادینی اوراسلامی ہوناعوام وخواص کو معلوم ہوتووہ مسلمان نہیں کہلائے گاکیونکہ ان جیسےامور کی پورے طور پر تصدیق کئے بغیر ایمان قابل اعتبار نہیں۔

علامہ ابوالبقاء کفوی رحمہ اللہ تعالٰی لکھتے ہیں:

الضروري المقابل للاكتسابي: هو ما يكون تحصيله مقدورا للمخلوق، والذي يقابل الاستدلالي هو ما يحصل بدون فكر ونظر في دليل

"ضروری جب استدلال کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، تو اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کا حاصل کرنا مخلوق کی قدرت میں نہ ہو اور جب یہ استدلالی کے مقابل استعمال ہوتا ہے تو اس سے ہر وہ بات مراد ہوتی ہے جو دلیل میں غور وفکر کئے بغیر حاصل ہو جائے۔"[1]

علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ تینوں معانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قيل اراد بالضروة مايقابل الاستدلالي فالضروري كالمسموع من فم رسول الله صلي الله تعالي عليه وسلم او المنقول عنه بالتواتر كالقران والصلوات الخمسة وصوم رمضان وحرمة الخمر والزنا، وقيل اراد بالضرورة ماشتهر بين الخاصة والعامة ضروريا كان الحكم او استدلاليا---وكتب الشارح علي هوامش الكتاب ان المراد بالضرورة اليقين[2]

"بعض حضرات نے کہا کہ ضرورت استدلالی کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، ضروری کی مثال جیسے کوئی بات حضور ﷺ کے زبانی سنی یا ان سے تواتر کے ساتھ نقل ہوئی جیسا کہ قرآن کریم، پنج وقتہ نمازیں، رمضان کا روزہ، شراب وزنا کا حرام ہونا، اور بعض حضرات نے کہا کہ ضرورت سے مراد وہ احکام ہیں جو خواص اور عوام (دونوں) کے درمیان مشہور ہو چکے ہوں، چاہے وہ حکم (اپنے اصل کے لحاظ سے) ضروری ہو یا استدلالی، اور شارح نے لکھا ہے کہ ضرورت سے مراد یقین ہے۔"

---

[1] الکلیات، ج۱ص۵۷۶

[2] النبراس، مبحث الایمان، ص۲٤۹

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی تعریف میں لفظ "ضرورۃ" کے بارے میں متکلمین کے یہ تینوں آراء ہیں ، لیکن آخری قول ہی راجح اور درست ہے کہ اس سے مراد صرف یقین نہیں، نہ ہی یہ استدلالی کے مقابلہ میں استعمال ہے بلکہ مقصود ان احکامات کی تصدیق کرنا ہے جو اس قدر مشہور ہوں کہ عوام و خواص سب اس کو دینی حکم کے طور پر جانتے ہوں، چنانچہ اکثر حضرات متکلمین نے اسی معنی کو بیان کرنے پر اکتفاء فرمایا ہیں۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

تصديق النبي فيما علم مجيئه به بالضرورة أي فيما اشتهر كونه من الدين بحيث يعلمه العامة من غير افتقار إلى نظر واستدلال كوحدة الصانع ووجوب الصلاة وحرمة الخمر ونحو ذلك

(ایمان) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان باتوں میں تصدیق کرنے کو کہا جاتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے "ضرورت" کے ساتھ ثابت ہے،" ضرورت "(کے ساتھ ثابت ہونے) سے مراد وہ امور ہے جن کا دینی حکم ہونا اتنا مشہور ہو کہ عام لوگ میں بغیر کسی دلیل کے جانتے ہوں جیسے اللہ تعالیٰ کا ایک ہونا، نماز کا واجب ہونا، شراب کا حرام ہونا، وغیرہ"[1]

شرح المواقف کے حاشیہ پر علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی صاحب رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قوله:(فيما علم مجيئه به ضرورة) اي فيما اشتهر كونه من الدين بحيث يعلمه العامة بلا دليل.

---

[1] شرح المقاصد في علم الكلام، ج٢ص٢٤٧.

"ایمان کی تعریف میں ضروریات دین سے مراد وہ امور ہے جس کا دین میں سے ہونا اتنا مشہور ہو چکا ہو کہ عام لوگ بھی بے دلیل اس کو جانتے ہوں۔"[1]

حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ضروری اور ضروریات دین کا یہی مفہوم بیان فرمایا اور اسی پر تفصیلات مرتب فرمائی۔[2]

متکلمین کے تعریف سے متعلق ایک اہم نکتہ

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ایمان میں صرف ان احکام کی تصدیق کافی نہیں جو مندرجہ بالا اصطلاح کے مطابق "ضروریات دین" میں داخل ہیں، بلکہ دین اسلام کے تمام احکام کی اجمالی یا تفصیلی طور پر تصدیق کرنا ضروری ہے، اور حضرات متکلمین ایمان کی تعریف میں جو "بالضرورۃ" قید ذکر کرتے ہیں، یہ در اصل ان کی اصطلاح ہے کیونکہ علم کلام میں بنیادی طور پر قطعیات ہی سے بحث کی جاتی ہے، اس لئے یہ حضرات ایمان میں بھی اس قید کو خاص طور پر ذکر کرتے ہیں، ورنہ کامل مسلمان بننے کے لئے دین اسلام کے تمام ثابت شدہ احکام کی تصدیق ضروری ہے صرف قطعی احکام کو درست ماننا کافی نہیں۔

تاہم یہ بات ضرور ہے کہ تکفیر کا تعلق قطعی احکام کے ساتھ ہے، اگر کوئی شخص دین اسلام کے کسی حکم کا انکار کرے جو قطعی طور پر ثابت نہ ہو تو اس کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔

---

[1] شرح المواقف، الموصد الثالث، المقصد الاول، ج۸ ص۳۵۲.

[2] اکفار الملحدین فی ضروریات الدین، ص۴۱، ۴۲.

علامہ ابی المعین نسفی رحمہ اللہ تعالیٰ ایمان کی لغوی تعریف نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

ثم ان هذا اللغوى و هو التصديق بالقلب هو حقيقة الايمان الواجب على العبد حقا لله وهو ان يصدق الرسول صلى الله عليه وسلم فيما جاء به من عند الله تعالى، فمن اتي بهذا التصديق فهو مؤمن فيما بينه وبين الله تعالي والاقرار يحتاج اليه ليقف عليه الخلق فيجروا عليه احكام الاسلام

"ایمان کا یہ لغوی معنی یعنی تصدیق بالقلب ہی ایمان کی اصل حقیقت ہے جو کہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ حضور ﷺ کی ان تمام باتوں میں تصدیق کی جائے جو آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے، لہٰذا جس کسی نے اس طرح تصدیق کی تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمان کہلائے گا، رہی زبانی اقرار تو اس کی ضرورت اس لئے پڑتی ہے کہ لوگوں کو پتہ چلے اور اس پر اسلام کے احکام جاری کریں۔"[1]

اس عبارت میں علامہ نسفی رحمہ اللہ تعالیٰ نے عام متکلمین کے مقابلے میں ذرا مختلف انداز میں ایمان کی وضاحت کی، عام متکلمین ایمان کی تعریف میں "ضروریات دین" کی تصدیق کو ضروری قرار دیتے ہیں جبکہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ان تمام احکام کی تصدیق کو ایمان کہا جو حضور علیہ الصلاۃ والسلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے۔ متکلمین کی تعریف کے مقابلے میں یہ موقف زیادہ عموم پر مشتمل ہے کیونکہ اس موقف کے مطابق صرف "ضروریات دین" کی تصدیق ہی مسلمان ہونے کے لئے

---

[1] التمهيد لقواعد التوحيد، ص ٣٧٧، ٣٧٨.

کافی نہیں بلکہ ان تمام احکام کی تصدیق لازم ہے جن کو حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے چاہے وہ "ضروریات دین" کی فہرست میں شامل ہو یا نہیں۔

تعبیر کی اس اختلاف کی بنیاد کیا ہے؟ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے دیگر متکلمین کی طرح "ضروریات دین" کی قید کیوں نہیں لگائی؟ اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے جو ابھی ذکر کی گئی کہ ایمان کے لئے صرف "ضروریات دین" کو درست ماننا کافی نہیں بلکہ دین اسلام کے تمام قطعیات کو تسلیم کرنا ضروری ہے اس لئے علامہ نسفی نے تصدیق کو صرف ضروریات دین کے ساتھ خاص اور مقید نہیں فرمایا، اسی طرح دیگر متکلمین بھی اس بات کے قائل ہیں اور تمام قطعی احکام کی تصدیق و تسلیم کو وہ بھی لازم سمجھتے ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ جب وہ بھی اس موقف کے قائل ہیں تو پھر تعریف کے اندر اس کی وضاحت کیوں نہیں فرمائی؟ تعریف کے اندر "ضروریات دین" کی قید لگانے کی کیا وجہ ہے؟

علامہ کشمیری رحمہ اللہ اسی بات کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

من قصره من المتكلمين على الضروريات فلِانّ موضوع فنّهم هو القطعي، لا اَن المومن به هو القطعي فقط، نعم التكفير انما يكون بجحوده فقط.

"متکلمین نے ضروریات کو ذکر کرنے پر اکتفاء اس لئے کیا کہ ان کے فن کا موضوع ہی قطعی امور ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ایمان کا تعلق صرف قطعیات کے

ساتھ ہے، ہاں البتہ تکفیر کا تعلق قطعی احکام کے انکار کرنے کے ساتھ ہے (کسی ظنی حکم کا انکار موجب تکفیر نہیں)"[1]

مقلد کے ایمان کی بحث

بعض متکلمین نے ایمان کی تعریف میں یہ قید بھی لگائی کہ فکر و نظر سے حضور ﷺ کے لائے ہوئے دین کی تصدیق کرے، اگر استدلال کے بغیر محض تقلیداً اس کو سچا مانے تو اس کا اعتبار نہیں، اس بحث کو "ایمان مقلد" کے عنوان سے بعض حضرات نے ذکر فرمایا ہے۔

اس موقف کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ فکر و استدلال کی نعمت سے محروم ہوں، مثلاً عام مسلمان لوگ جو علم کلام کی باریک دلائل، وجود صانع، ضرورتِ بعثتِ رسل اور اثبات یوم آخرت کے پر مغز دلائل اور طویل مباحث سے قطعاً ناواقف ہیں، ان کی تصدیق و ایمان معتبر نہ ہوں۔

جمہور متکلمین کا موقف اور علامہ شقرونؒ کے ایک رسالے کا خلاصہ

لیکن جمہور متکلمین کے نزدیک یہ موقف درست نہیں، علامہ ابوعبداللہ محمد شقرون رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۹۲۹ھ) سے جب یہی سوال پوچھا گیا تو آپ نے بڑا تفصیلی جواب لکھا جو سن ۱۴۲۴ھ میں غالباً مصر کے شہر طنطا سے مستقل رسالہ کی شکل میں "الجیش والکمین لقتال من کفر عامة المسلمین" کے نام سے شائع ہوا۔

---

[1] حاشیه اکفار الملحدین، ضمن مجموعة رسائل الکشمیري، ج٣ ص٤.

اس تفصیلی جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو عام مسلمانوں کے بارے میں یہ موقف اختیار کرنا درست نہیں کہ انہوں نے محض تقلیداً ایمان قبول کیا، اصول دین کی تصدیق لوگوں کے اتباع میں کی، کیونکہ اگر کسی عام سے عام آدمی سے بھی زمین وآسمان کے بارے میں پوچھا جائے کہ اس کا خالق کون ہے تو وہ بلا تکلف یہی جواب دیتا ہے کہ اللہ، اگر کسی ایسے دیہاتی کو تلاش کیا جائے جو کہ علم کلام کے نام تک سے نابلد ہو، اللہ تعالیٰ کے وجود وغیرہ مباحث بالکل اس نے نہ سنے ہو لیکن تخلیق کائنات وغیرہ ضروری امور کا جب اس سے سوال کیا جائے گا، تو اس کا یہی جواب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ہی ان سب چیزوں کا خالق ہے، اس لئے ان کو مقلد قرار دینا درست نہیں۔

اگر ان کو مقلد قرار بھی دیا جائے تو مقلد کا ایمان معتبر ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق کل تین اقوال ہیں:

۱۔ جب دل سے تمام ضروری عقائد کی تصدیق کرے تو اس کا ایمان معتبر ہے اور استدلال نہ کرنے کا کوئی گناہ بھی نہیں ملے گا۔

۲۔ ایمان تو معتبر ہے، لیکن غور وفکر اور استدلال چھوڑنے کی وجہ سے گناہ گار ہوگا کیونکہ استدلال بھی ایک ضروری حکم ہے جس کا شریعت کی طرف سے بندہ مکلف تھا، اور مقلد نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔[1]

---

[1] بعض متکلمین نے اسی موقف کو جمہور کا قول قرار دیا اور دیگر اقوال کے مقابلے میں اسی قول کو ترجیح دی مثلاً "تہذیب شرح السنوسیۃ" ص: ۱۳۰ اسی قول کو جمہور کی طرف منسوب فرمایا اور

۳۔ مقلد کی تصدیق وایمان کا کوئی اعتبار نہیں، اس طرح تصدیق وایمان سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا بلکہ بدستور کافر ہی رہے گا۔

جمہور اہل سنت والجماعت کا یہی موقف ہے جو نمبر ا میں ذکر کیا گیا، امام ابو منصور ماتریدی، امام ابوالحسن اشعری، امام قشیری، امام غزالی، امام عزالدین بن عبدالسلام رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہ حضرات کا یہی رجحان ہے، امام ابن رشد وغیرہ حضرات نے بھی اس کو ترجیح دی[1]۔

باقی دونوں اقوال لفظ "قیل" کے ساتھ ذکر کئے اور آخر میں یہ تصریح بھی کردی کہ یہ دونوں قول ضعیف ہیں۔

لیکن خود علامہ سنوسی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حکم تمام عوام کے لئے نہیں ہے بلکہ عوام میں سے صرف ان لوگوں کے متعلق یہ حکم ہے جن کے اندر فکر و نظر اور استدلال کا استعداد موجود ہو، ورنہ گناہ گار نہیں ہوگا۔ نیز استدلال سے بھی منطقی یا متکلمین جیسا علمی استدلال کوئی ضروری نہیں بلکہ عوام کی طرز کا استدلال بھی گناہ سے بچنے کے لئے کافی ہے جیسا کہ ایک اعرابی نے امام اصمعی رحمہ اللہ کو جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ جب حیوان کے فضلہ جات حیوان پر اور انسانی قدم کی نشانیاں انسان پر دلالت کرتے ہیں تو یہ زمین وآسمان کیونکر خدا تعالیٰ کے وجود پر دلالت نہ کریں۔ منہ

[1] علامہ کمال الدین ابن ابی شریف نے "مسامرہ" میں اس کو فقہاء اور اکثر علماء کا مذہب قرار دیا، اور علامہ قاسم قطلوبغا نے مسایرہ کے حاشیہ میں اس کو امام ابو حنیفہ، سفیان، مالک، اوزاعی، شافعی، احمد بن حنبل، عبداللہ بن سعید القطان وغیرہ کا موقف قرار دیا۔ (ملاحظہ فرمائیں: المسامرۃ مع المسایرۃ" ص: ۲۸۵تا۲۸۸)۔

اور حضور ﷺ کے طرز عمل، صحابہ کرام کے طریق کار کو دیکھتے ہوئے بھی یہی موقف مضبوط معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کسی کافر کو اسلام قبول کرتے وقت صرف شہادتین ہی کہلواتے تھے، وجود صانع اور بعثت رسل وغیرہ کے دلائل ہر کسی کو بیان نہیں فرماتے تھے، نہ ہی ہر نو مسلم کو اس بات کا مکلف بنایا، اگر ایمان کے صحیح ہونے کے لئے فکر واستدلال بھی ضروری ہوتا تو حضور ﷺ اس کو ہر گز نہ چھوڑتے بلکہ ہر کسی کو اس کا حکم فرماتے۔

علاوہ ازیں علم کلام میں ذکر کردہ دلائل اور فکر واستدلال کے اسلوب تو بہت بعد کو مرتب ہوئی، اس سے پہلے عوام مسلمان ان فنّی باریکیوں اور کلامی موشگافیوں سے ہر گز کماحقہ واقف نہ تھے، لہٰذا ایمان کو ان امور پر کیونکر موقوف کیا جا سکتا ہے؟

محاکمہ

یہ دوسرا موقف بھی بعض متکلمین سے منقول ہے لیکن پہلا نقطہ نظر ہی راجح ہے، نیز اس موقف کے مطابق بھی فکر واستدلال ہر شخص پر ضروری نہیں بلکہ جن لوگوں میں اس کی صلاحیت موجود ہو ان کے بارے میں یہ حکم ہے، لہٰذا عوام اس سے مستثنی ہیں۔

تیسرا موقف اہل سنت والجماعت کے معروف متکلمین میں سے کسی سے مستند ذریعے سے ثابت نہیں بلکہ بہت سے حضرات نے اس کو معتزلہ کے موقف کے طور پر ذکر فرمایا ہے، اس لئے اس کو قابل عمل نہیں بنایا جا سکتا۔[1]

اصولِ دین

اصطلاحی تعریف سے معلوم ہوا کہ ایمان لانے کیلئے ضروری ہے کہ حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقینی طور پر جو بھی تعلیمات لے کر آئے، ان سب کو بالکل درست تسلیم کرے اور دل و جان سے اس کی تصدیق کرے۔

اس لحاظ سے تو شریعت کے وہ تمام احکامات اس میں داخل ہو گئے جو ہم تک یقین و تواتر کے راستے سے پہنچے، ان سب کی تصدیق ضروری ہے، لیکن ان تمام احکامات میں سے چند احکامات بنیادی قسم کی ہیں جن کے بغیر ایمان قبول نہیں، قرآن کریم میں بھی بار بار متعدد موقعوں پر اس کا ذکر فرمایا گیا اور خود حدیث جبرئیل میں حضرت سیدنا جبرئیل علیہ السلام نے ایمان کے بارے میں سوال کیا تو جواب میں ان ہی چیزوں کی تصدیق کا ذکر فرمایا گیا کہ ان اشیاء کی تصدیق کو ایمان کہا جاتا ہے۔

یہ کل چھ بنیادی عقائد ہیں جن کو غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر بعض اوقات "اصول دین" بھی کہا جاتا ہے، امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائے رسالہ "الجیش والکمین لقتال من کفر عامۃ المسلمین" للعلامۃ محمد شقرون ابو عبد اللہ الوہرانی المتوفی ۹۲۹ھ، مطبوعہ دار الصحابۃ للتراث.

والإيمان هو الإيمان بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر والقدر خيره وشره وحلوه ومره من الله تعالى[1]

ایمان باللہ:

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی اس کائنات کو وجود بخشا، وہ اپنی ذات، صفات اور افعال میں بالکل یکتاہےاس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ کمال کی تمام صفات اس میں جمع ہےاور وہ ہر نقص و عیب سے بالکل پاک اور منزہ ہے۔

ایمان بالملائکۃ:

یہ عقیدہ اپنالیناکہ فرشتےایک نورانی مخلوق ہے، قرآن کریم میں جابجااللہ تعالیٰ نے فرشتوں کاذکر فرمایاہے اوراحادیث مبارکہ میں تواس کی بہت سی تفصیلات بھی موجودہے، تفصیلات کواگر غیر قطعی بھی قرار دیاجائےتب بھی اتنامسلم ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک غیر مادی مخلوق ہے۔

ایمان بالکتب:

اللہ تعالیٰ نے اپنے جن جن انبیاء کرام علیہم السلام پر اپنی کوئی آسمانی کتاب یاصحیفہ نازل فرمایا،اس کی تصدیق بھی ایمان معتبر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اصلاً یہ کتابیں حق تھیں جواللہ تعالیٰ نے اپنےانبیاء کرام علیہم السلام پر نازل فرمائی تھی۔

---

[1] متن الطحاوية بتعليق الألباني،ص٦٤.

ایمان بالانبیاء:

انبیاء کرام ان عظیم اور مبارک شخصیات کو کہا جاتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں تک اپنے احکام پہنچانے کیلئے منتخب فرمایا، سیدنا حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا، ان سب کی بالکل متعین تعداد تو یقینی نہیں البتہ ایمان لانے کیلئے ضروری ہے کہ اتنا اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیاء کرام کو بھیجا وہ سب کے سب برحق تھے، اور انسانیت کے نہایت اعلیٰ صفات واخلاق سے مزین بندے تھے۔

متعدد آیات میں اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام پر ایمان لانے کا ذکر فرمایا بلکہ سورۃ البقرۃ کی آخری آیات میں حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی یہی صورت حال نقل فرمائی کہ وہ سابقہ تمام انبیاء کی تصدیق کرتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔

چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

{آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ}

"اعتقاد رکھتے ہیں رسول ﷺ اس چیز کا جو ان کو پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئ ہے اور مومنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اسکی کتابوں کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے سب پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ اور ان سب نے

یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا اور خوشی سے مانا ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں
اے ہمارے پروردگار اور آپ ہی کی طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے [1]

لہٰذا مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے کہ تمام انبیاء کرام کی تصدیق کی جائے، اگر کوئی شخص کسی بھی ایسی شخصیت کی تکذیب کرے جس کی نبوت قطعی طور پر ثابت ہو یا (نعوذ باللہ) اس کی شان میں کوئی گستاخی کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ایمان بالیوم الاخر:

اس پر ایمان لانا ہے کہ اس دنیا نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی نہیں رہنا، بلکہ ایک دن ساری کائنات کو فناء ہونا ہے جس کو
قیامت کہا جاتا ہے، اس میں ساری جاندار مخلوق پر موت طاری ہوگی اور مرنے کے بعد ایک دن ساری انسانیت نے زندہ ہونا ہے
اور اللہ تعالیٰ کے دربار عالیہ میں حساب و کتاب کیلئے پیش ہونا ہے۔

ایمان بالقدر:

اس سے مقصود یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علم و ارادے کے موافق ہوتا ہے، ان سارے حالات و تغیرات کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم تھا۔

شرائط ایمان:

ایمان کی تعریف سے معلوم ہوا کہ یہ تصدیق بالقلب کا نام ہے، کسی چیز کو دل

---

[1] [البقرۃ:285]

وجان سے مان لینا ایمان کہلاتا ہے، لیکن شریعت کی نگاہ میں یہ ایمان تب ہی معتبر ہوگا جب کہ اس میں مطلوبہ شرائط بھی پائی جائیں، جن کو شرائط ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہو تو اس کے بغیر ایمان کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ سحر کے حکم کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ:

"ان كان ردّ ما لزمه في شرط الايمان فهو كفر والّا فلا."

"(سحر علی الاطلاق کفر نہیں بلکہ یہ تفصیل ضروری ہے کہ) اگر اس کی وجہ شرائط ایمان کے لوازم میں سے کوئی فوت ہو جائے تو کفر ہے ورنہ نہیں۔"[1]

امام ماتریدی رحمہ اللہ نے اگرچہ اس کے بعد شرائط ایمان کی تفصیل ذکر نہیں فرمائی نہ ہی ان کی کسی اور تصنیف میں اس کی کوئی مزید وضاحت ملی، لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہی مندرجہ ذیل شرائط مراد ہوں گے جیسا کہ آئندہ تفصیل سے انشاءاللہ واضح ہو جائے گا۔

یہ کل پانچ شرائط ہیں، جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔اقرار باللسان:

بعض حضرات نے ایمان کی تعریف میں ایک ضروری قید کے طور پر یہ بھی بیان کیا کہ تصدیق بالقلب کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی اس بات کا قرار کرے تب ہی ایمان ثابت ہوگا، اگر کسی نے صرف دل سے مان لیا لیکن زبان سے اس کا اظہار نہیں کیا تو وہ شخص مسلمان ہی نہیں ہوگا۔

---

[1] شرح الفقه الاكبر للعلامة ملا علي القاري، ص٢٤٩، قديمي كتب خانه، كراچي.

چنانچہ محقق علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے "المسایرۃ" میں اس کو تفصیل سے ذکر کیا اور اس موقف کو امام صاحب کے حوالے سے بھی نقل فرمایا، مگر جمہور اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک ایمان کی ماہیت میں یہ کوئی ضروری قید نہیں بلکہ صرف تصدیق بالقلب ہی ایمان ہے۔[1]

یہ اختلاف اپنی جگہ ہے لیکن اس بات میں دونوں فریق کا اتفاق ہے کہ جب کبھی اس سے زبانی اقرار کا مطالبہ کیا جائے تو ضروری ہے کہ وہ اقرار کرے، اگر مطالبہ کے باوجود وہ بلا عذر اقرار نہ کرے تو اس پر مسلمانوں کے احکامات جاری نہیں ہوں گے بلکہ اس کو کفر عناد کہا جائے گا۔

اس لئے کسی شخص کے مسلمان ہونے کیلئے تصدیق بالقلب کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ ضرورت کے وقت وہ اپنے اسلام کا اقرار کرے۔

علامہ ابو المعین نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

فمن اتی بهذا التصديق فهو مؤمن فيما بينه وبين الله تعالي والاقرار يحتاج اليه ليقف عليه الخلق فيجروا عليه احكام الاسلام، هذا هو المروي عن ابي حنيفة رضي الله عنه واليه ذهب الشيخ ابو منصور الماتريدي رحمه الله وهو اصح الروايتين عن ابي الحسن الاشعري

"جو کوئی اس طرح تصدیق (بالقلب) کرے تو وہ اللہ کے نزدیک مسلمان قرار پائے گا، زبانی اقرار کی ضرورت تو اس لئے پیش آتی کہ لوگوں کے اس کے مسلمان

---

[1] امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "تاویلات اہل السنۃ" ج۳ ص ۵۲۰ پر یہی موقف ذکر فرمایا ہے۔

ہونے کا علم ہو جائے تا کہ پھر وہ اس کے ساتھ مسلمانوں والے احکام عمل میں لائیں، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے یہی منقول ہے امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے اور امام اشعری رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت زیادہ صحت کے ساتھ منقول ہے۔"[1]

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

اتفق القائلون بعدم اعتبار الاقرار علی ان یعتقد انه متی طولب به اتی به، فان طولب به فلم یقر فهو کفر عناد.

زبانی اقرار کا اعتبار نہ کرنے والے تمام متکلمین اس بات پر متفق ہیں کہ جب کبھی اس سے اقرار کا مطالبہ کیا جائے تو وہ اقرار کرے، اگر مطالبہ کئے جانے کے باوجود وہ اپنے مسلمان ہونے کا اقرار نہ کرے تو یہ کفر عناد ہوگا۔"[2]

۲۔رضا و محبت:

یعنی دین اسلام اور اس کے تمام تر ضروریات کے ساتھ محبت رکھنا اور اس سے خوش رہنا۔

شریعت کی نظر میں ایمان کے معتبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مومن شریعت اور اس کے ثابت شدہ تمام یقینی احکام کو بنظرِ استحسان دیکھے، اس کے ساتھ محبت اور پسندیدگی کا رویّہ رکھے، اگر کوئی شخص دل سے شریعت کو تسلیم کرتا ہے اور زبان سے کھلم کھلا اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف بھی کرتا ہے مگر اس کے باوجود وہ شریعت سے

---

[1] التمهيد لقواعد التوحيد، ص : ۳۷۸.

[2] المسايرة، الخاتمة في بحث الايمان، ص۲۷۹.

بغض وعداوت رکھے یااس کے کسی ثابت شدہ حکم کوناپسندیدہ سمجھے تووہ مسلمان نہیں کہلائے گابلکہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِلْكَافِرِينَ }

جو (کوئی) شخص خداتعالیٰ کا دشمن ہو اور فرشتوں کا (ہو) اور پیغمبروں کا (ہو) اورجبریل کا(ہو)اورمیکائیل کا(ہو)تواللہ تعالیٰ دشمن ہےایسے کافروں کا۔[۱]

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ساتھ دشمنی کرنے والے کوکافر قرار دیا۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں ذکر کرتے ہیں کہ اصل عبارت یہ ہونی چاہئے کہ "فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لَهُمْ"لیکن اللہ تعالیٰ نے"کافرین"کہہ کراس بات کی طرف اشارہ کیا کہ دراصل ان کے ساتھ عداوت کی اصل وجہ ان کاکافرہوناہےاورنیز اس سےاس

بات کی طرف بھی اشارہ کیاکہ فرشتوں کے ساتھ محبت رکھناضروری ہےاگرکوئی محبت کے بجائےدشمنی رکھے تووہ کافرہے۔[۲]

---

[۱] [البقرة: ٩٨]

[۲] مدارك التنزيل وحقائق التأويل، تفسير الاية المذكورة، ج١ص١١٤.

یہی حکم تمام ضروریات دین اور دین کے قطعی احکام کا ہے کہ ان میں کسی ایک حکم کے ساتھ بھی نفرت رکھنا در اصل خود شریعت سے نفرت رکھنا ہے۔

۳۔ تعظیم واحترام:

یہ بھی ایمان معتبر ہونے کے لئے ایک بنیادی شرط ہے، اگر کوئی شخص دین اسلام کو دل وجان سے درست تسلیم کرتا ہے لیکن اس کی تعظیم نہیں کرتا بلکہ توہین کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج تصور ہو گا کیونکہ تصدیق بالقلب اگرچہ پہلے موجود تھا لیکن اس کی بنیادی شرط تعظیم ہے جس کے نقیض یعنی توہین کا ارتکاب کیا گیا اس لئے یہ تصدیق بھی معتبر نہیں اور محض اس کی وجہ سے کسی کو مسلمان نہیں کہا جائے گا۔

۴۔ تسلیم وانقیاد:

تسلیم کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی ایمان قبول کر کے جملہ شرائط بجالائے، تو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شریعت مطہرہ کے تمام احکامات کو اجمالی یا تفصیلی طور پر قبول کرے اور ان پر عمل کرنے کا جذبہ رکھے۔

قرآن کریم میں بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا کہ شریعت کے فیصلہ کو (بے چون وچرا) تسلیم کرنے اور قبول کے بغیر اسلام کا دعویٰ بے جا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

{فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا}

"پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہ ہونگے جبتک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کروایں پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں"[1]

اس آیت کریمہ میں عربی زبان کے لحاظ سے تاکید کے مختلف طریقوں کے ساتھ اس شخص سے ایمان کی نفی کی گئی جو شریعت کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے، یعنی کوئی شخص مسلمان اور مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ شریعت کے فیصلے اور اس کے احکام کو دل وجان سے تسلیم نہ کرے۔

اس کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ ابو بکر جصاص رازی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

في هذه الآية دلالة على أن من رد شيئا من أوامر الله تعالى أو أوامر رسوله صلى الله عليه وسلم فهو خارج من الإسلام سواء رده من جهة الشك فيه أو من جهة ترك القبول والامتناع من التسليم--لأن الله تعالى حكم بأن من لم يسلم للنبي صلى الله عليه وسلم قضاءه وحكمه فليس من أهل الإيمان.

اس آیت میں اس بات کی رہنمائی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کے احکام میں سے کوئی حکم رد کردے تو وہ اسلام سے خارج ہے، چاہے شک کرنے کی وجہ سے رد کیا یا (یقین کرنے کے باوجود) قبول نہ کرنے کی وجہ سے رد کیا، کیونکہ جو لوگ حضور ﷺ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کو بے ایمان قرار دیا ہے۔"[1]

---

[1] [النساء: ٦٥].

امام اعظمؒ کی تصریح

امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"والاسلام هو التسليم والإنقياد لأوامر الله تعالى فمن طريق اللغة فرق بين الإسلام والإيمان ولكن لا يكون إيمان بلا اسلام ولا يوجد إسلام بلا إيمان

اسلام اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے جھکنے اور سر تسلیم خم کرنے کا نام ہے، لغوی معنی کے اعتبار سے تو ایمان و اسلام میں فرق ہے لیکن ایمان اسلام کے بغیر اور اسلام ایمان کے بغیر موجود نہیں ہو سکتا۔"[۲]

آیتِ تسلیم کی وضاحت پر ایک اشکال کا جواب

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کے معتبر ہونے کے لئے ایک ضروری شرط یہ بیان فرمائی کہ شریعت کے فیصلہ اور حکم کو تسلیم کرے، اس کی تفسیر میں عام طور پر مفسرین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے لکھا کہ ظاہر و باطن سے اس فیصلہ کو قبول کرنا ضروری ہے، یعنی دل سے اس کو درست اور حق و سچ سمجھنا بھی ضروری ہے اور عملی زندگی میں بھی اس کو تسلیم کرنا ضروری ہے، اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو جائے تو آیت کریمہ کے مطابق اس ایمان کا اعتبار نہیں ہوگا۔

---

[۱] أحكام القرآن للجصاص، تفسير سورة النساء، رقم الاية: ٦٥، ج٢ ص ٢٦٨.

[۲] الفقه الاكبر بتحقيق الامام الكوثري ضمن " العقيدة وعلم الكلام" ص: ٦٢٢.

اس پر بعض اوقات یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ اس کے مطابق تو شریعت کے کسی فیصلے کے خلاف عمل کرنا ہی منافی ایمان ہونا چاہیئے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص شریعت کے کسی حکم کے خلاف کام کرے تو وہ کافر ہو جائے، یہی مذہب خوارج اور بعض دیگر مبتدعین کا ہے جو محض کسی گناہ کے ارتکاب کو موجب کفر سمجھتے ہیں اور اسی بناء پر امت کے اکثر طبقے کو کافر قرار دیتے ہیں، جبکہ اہل سنت کا ہر گز یہ موقف نہیں ہے۔

یہ اشکال بظاہر ایک حد تک وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آیتِ مبارکہ کے سیاق وسباق پر غور کیا جائے تو خود بخود حل ہو جاتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ آیت باہمی اختلاف کے متعلق ہے یعنی جب کبھی کسی معاملے میں باہمی تنازع ہو جائے تو حضور ﷺ کے عہد مبارک میں خود آپ ﷺ کو اور آنحضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کو حکم بنانا ضروری ہے اور پھر اس کے فیصلے کو دل وجان سے قبول کرنا بھی لازم ہے۔

یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں: ایک تسلیم وانقیاد ہے یعنی فیصلہ کو قبول کرنا اور دوسری چیز اس پر پوری زندگی عمل کرنا ہے۔

یہ دو چیزیں آپس میں لازم وملزوم نہیں کہ اگر کبھی عملی طور پر فیصلے کے خلاف ہو جائے تو اس سے یہ لازم آئے کہ اس نے فیصلے کو تسلیم ہی نہیں کیا بلکہ بعض اوقات تسلیم کرنے اور اس کو مکمل طور پر حق وسچ سمجھنے کے باوجود بھی عملی کوتاہی ہو جاتی ہے، مثلاً اگر پاکستان کا کوئی باشندہ ہے وہ حکومت کے قوانین کو مانتا ہے، اس کو درست تسلیم کرتا ہے لیکن بعض اوقات اپنے مفاد کی خاطر یا حرص ولالچ کی وجہ سے یا کبھی اپنی

ناسمجھی کی وجہ سے خلاف قانون کوئی کام کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ پاکستانی ہی کہلاتا ہے، اس خلاف قانون اقدام کی وجہ سے اس کو پاکستان کا دشمن نہیں کہا جاتا۔

اس کے مقابل اگر کوئی شخص اعلان کرے کہ میں پاکستان کا قانون نہیں مانتا، حکومت کے سامنے واضح کرے کہ میں اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کرتا، تو اس کو حکومت کے خلاف بغاوت سمجھا جاتا ہے۔

یہی حال آیت کریمہ میں ذکر کردہ تسلیم کا بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان شریعت کے حکم اور اس کے فیصلے کو دل وجان سے درست مانے اور عملی طور پر بھی اس کو رد نہ کرے لیکن اس کے باوجود کبھی کبھار اس کے خلاف گناہ کا ارتکاب کرے تو محض اس گناہ کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج نہیں قرار دیا جاسکتا، ہاں اگر کوئی شخص عناد کے طور پر شریعت کے واضح فیصلے کو رد کرے یا اس کا مقابلہ کرے تو وہ یقیناً کافر ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

الشرط الثالث: قوله تعالى: ويسلموا تسليما واعلم أن من عرف بقلبه كون ذلك الحكم حقا وصدقا قد يتمرد عن قبوله على سبيل العناد أو يتوقف في ذلك القبول، فبين تعالى أنه كما لا بد في الإيمان من حصول ذلك اليقين في القلب. فلا بد أيضا من التسليم معه في الظاهر، فقوله: ثم لا يجدوا في أنفسهم حرجا مما قضيت المراد به الانقياد في الباطن، وقوله: ويسلموا تسليما المراد منه الانقياد في الظاهر والله أعلم.

"جو کوئی دل سے شرعی حکم کو حق وسچ جانے لیکن ضد وعناد کی وجہ سے اس کو قبول نہ کرے یا اس میں توقف کرے، تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ جس طرح ایمان کے حصول کے لئے دلی تصدیق ویقین ضروری ہے اسی طرح ظاہر میں حکم کو تسلیم کرنا

بھی ضروری ہے (لہٰذا عناد کی وجہ سے کسی حکم شرعی کو قبول نہ کرنا یا توقف کرنا کفر ہے)۔۔"[1]

امام جصاص رازی رحمہ اللہ کی تفسیر سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

فأوعد على مخالفة أمر الرسول وجعل مخالف أمر الرسول والممتنع من تسليم ما جاء به والشاك فيه خارجا من الإيمان--- جائز أن يكون المراد التسليم من غير شك في وجوب تسليمه ولا ضيق صدر به بل بانشراح صدر وبصيرة ويقين وفي هذه الآية دلالة على أن من رد شيئا من أوامر الله تعالى أو أوامر رسوله صلى الله عليه وسلم فهو خارج من الإسلام سواء رده من جهة الشك فيه أو من جهة ترك القبول والامتناع من التسليم

"قرآن کریم نے رسول کے حکم کی مخالفت پر وعید بیان فرمائی اور حکمِ رسول کے مخالفت کرنے والے، اس کو قبول نہ کرنے والے اور اس میں شک کرنے والے کو ایمان سے خارج قرار دیا۔۔اس آیت میں اس بات کی رہنمائی ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کے احکام میں سے کوئی حکم رد کر دے تو وہ اسلام سے خارج ہے، چاہے شک کرنے کی وجہ سے رد کیا یا (یقین کرنے کے باوجود) قبول نہ کرنے کی وجہ سے رد کیا، کیونکہ جو لوگ حضور ﷺ کے فیصلہ کو تسلیم نہ کریں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اس کو بے ایمان قرار دیا ہے[2]

---

[1] مفاتيح الغيب، سورة النساء، رقم الاية: ٦٥ ،ج١٠ص١٢٨.

[2] أحكام القرآن للجصاص، سورة النساء، رقم الاية: ٦٥ ج٣ص١٨٠.

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شریعت کے فیصلہ کے خلاف عمل کرنا اگرچہ گناہ اور جرم ہے لیکن محض اس کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر نہیں قرار دیا جا سکتا، تاہم اگر کوئی اس فیصلے کو قبول ہی نہ کرے بلکہ عناد کی وجہ سے اس کو رد کرے یا اس کے مقابلے اور معارضے پر آجائے تو وہ البتہ کافر ہو جائے گا۔

بالفاظ دیگر

اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اعتقاد کی حد تک تو تسلیم ضروری ہے، اگر کوئی اعتقاد ہی میں شریعت کے فیصلے کو تسلیم نہ کرے یعنی اس کو حق نہ سمجھے تو وہ کافر ہے اسی طرح اگر زبانی طور اس کو ناحق کہے، شریعت کے کسی مسلمہ حکم کو ظلم و بے انصافی کہے یا اس کے ساتھ استہزاء واستخفاف کی کوئی اور شکل اختیار کرے تو وہ بھی کافر ہے، اگر یہ دونوں امور مفقود ہوں کہ مثلاً دل میں بھی اس کو حق وصواب سمجھتا ہے اور زبان و عمل سے بھی اس کے متعلق کسی موجب کفر امر کا ارتکاب نہیں کرتا، لیکن اپنے مفاد وغیرہ کی وجہ سے بعض اوقات شریعت کے کسی فیصلہ کے متعلق کوتاہی کر جاتا ہے، خدا اور رسول کے برحق فیصلے اور منصفانہ حکم کے بعد اس طرح کوتاہی کرنا اگرچہ بالکل نامناسب ہے لیکن محض اس کی وجہ سے کوئی کافر بھی نہیں ہوتا۔

حضرت تھانویؒ کی جامع تفسیر

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی آیت کی تفسیر میں حسب معمول بڑی جامع مختصر اور مفید بات ذکر فرمائی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

"تحکیم، عدم حرج اور تسلیم کے مراتب تین ہیں: اعتقاد سے اور زبان سے اور عمل سے۔

اعتقاد سے یہ کہ قانون شریعت کو حق اور موضوع التحکیم جانتا ہے اور اس میں مرتبہ عقل میں ضیق نہیں، اور اس مرتبہ میں اس کو تسلیم کرتا ہوں، اور زبان سے یہ کہ ان امور کا اقرار کرتا ہوں کہ حق اسی طرح ہے اور عمل سے یہ مقدمہ لے بھی جاتا ہے اور طبعی ضیق بھی نہیں اور اس فیصلہ کے موافق کاروائی بھی کرلی۔

سو اول مرتبہ تصدیق وایمان کا ہے اس کا نہ ہونا عند اللہ کفر ہے اور منافقین میں خود اسی کی کمی تھی چنانچہ تنگی کے ساتھ لفظ انکار اسی کی توضیح کے لئے ظاہر کردیا ہے، اور دوسرا مرتبہ اقرار کا ہے اس کا نہ ہونا عند الناس کفر ہے، تیسرا مرتبہ تقویٰ وصلاح ہے اس کا نہ ہونا فسق ہے اور طبعی تنگی معاف ہے۔ پس آیت میں بقرینہ ذکر منافقین مرتبہ اول مراد ہے۔[1]

۵۔ مخالف ادیان و مذاہب سے بیزار ہونا:

یہ بھی ایمان کے معتبر ہونے کے لئے ایک بنیادی شرط ہے جس کے بغیر اسلام کا اعتبار نہیں، اگر کوئی شخص دل سے اسلام کے حقانیت کا یقین کرے اور زبان سے بھی اس کا قرار کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کے علاوہ ادیان مثلاً عیسائیت ، یہودیت وغیرہ کے ساتھ بھی وابستہ رہے اور اس کو بھی مذہب کے طور پر باقی رکھے تو وہ بھی مسلمان نہیں کہلائے گا کیونکہ اسلام میں داخل ہونے کیلئے ضروری ہے کہ اسلام ہی کو حق اور سچ مذہب تسلیم کرے اس کے علاوہ دیگر ادیان کو منسوخ تصور کرے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

{إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ}

---

[1] بیان القرآن، سورة النساء، رقم الایة:٦٥، ج١ص٥٥٩.

"بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔" [1]

اسی بناء پر حضرات فقہاء کرام نے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا کہ اگر کوئی عیسائی یا یہودی مسلمان ہونا چاہے تو صرف کلمہ طیبہ پڑھنے "یعنی توحید ورسالت کا اقرار کرنے" سے وہ مسلمان نہیں ہوگا بلکہ اپنے دین سے براءت بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن قاوان شافعی (المتوفی ۸۸۹ھ) رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

بل الایمان هو التصديق الخاص ولكن لقبوله شرط هو التلفظ بالشهادتين عند القدرة وعدم الاتيان بما هو مكفر.

"ایمان تو خاص قسم کی تصدیق کا نام ہے (جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے) لیکن قبولیت ایمان کے لئے ایک تو یہ شرط ہے کہ اگر قدرت ہو تو زبانی توحید ورسالت کا اقرار کرے، اور دوسری شرط یہ ہے کہ موجب کفر کوئی کام نہ کرے" [2]

علامہ حصکفی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(وإسلامه أن يتبرأ عن الأديان) سوى الإسلام (أو عما انتقل إليه) بعد نطقه بالشهادتين، وتمامه في الفتح؛ ولو أتى بهما على وجه العادة لم ينفعه ما لم يتبرأ بزازية.

مرتد کے اسلام لانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ دین اسلام کے علاوہ تمام ادیان سے یا جو دین اختیار کر رکھا ہے، خاص اس دین سے اپنی براءت کرے اور توحید ورسالت کا اقرار بھی کرے، اگر صرف عام معمول کے طور پر اقرار کرے گا تو اس کا فائدہ نہیں ہوگا جب تک باقی باطل ادیان سے اپنی صفائی نہ کرے۔" [1]

---

[1] [آل عمران: ١٩].

[2] شرح العقائد العضديه، ص:١٠٨.

ان شرائط کو مقرر کرنے کی بنیادی وجہ

اس باب کے شروع میں تفصیل سے گزر چکا ہے کہ ایمان و کفر آپس میں ضدین بلکہ نقیضین ہیں، شریعت نے ایمان کا ایک خاص مفہوم متعین کر رکھا ہے، اگر وہ مفہوم موجود ہو تو آدمی مسلمان کہلائے گا اور اگر کہیں خدانخواستہ وہ مفہوم برقرار نہ رہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا، باہمی تناقض کی وجہ سے دونوں کے درمیان کوئی تیسری صورت نہیں ہے کہ جو نہ ایمان ہو نہ کفر کیونکہ ارتفاع نقیضین محال ہے۔

ایمان ہو یا کفر، ہر ایک دل کے خاص افعال و کیفیات سے عبارت ہے، دنیا جہاں کے دیگر تمام چیزوں کی طرح کفر کے پہچاننے کے بھی دو طریقے ہیں، ایک ذاتیات کے ذریعے پہچاننا ہے اور دوسرا طریقہ لوازم و خواص یا قرائن کی وجہ سے پہچاننے کا ہے مثلاً زید کو یا تو حیوان ناطق سے پہچانا جاتا ہے جو اس کے ذاتیات سے مرکب ہے یا اس کی شکل و شباہت، کردار و گفتار وغیرہ امور کے ذریعے اس کا علم ہوتا ہے جو کہ خواص و قرائن کے قبیل سے ہے۔

ٹھیک یہی صورت حال کفر کی بھی ہے، کفر کی ذات " تکذیب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی شئی مما علم مجیئه به ضرورة" یا " عدم تصدیقه صلی اللہ علیہ وسلم فی شئی مما علم مجیئه به ضرورة" ہے، اگر کوئی بدبخت صراحۃً دین اسلام یا اس کے ضروریات دین میں

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ، كتاب الجهاد، باب المرتد، ج٤ص٢٢٦.

سے کسی کی تکذیب کرے یاان میں سے کسی چیز کی تصدیق بالقلب نہ کرے توایسا شخص کافر ہے اور یہی کفر کی اپنی ذاتی شکل ہے۔

بسااوقات ایسا ہوتا ہے کہ کفر اپنے ذاتیات کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ کچھ قرائن ولوازم اس کی عکاسی کرتے ہیں لیکن جس طرح عام زندگی میں مطلق قرینہ کا اعتبار نہیں کیا جاتا اسی طرح یہاں بھی یہی صورت حال ہے بلکہ شریعت مطہرہ نے تو اس باب میں ظن غالب والے قرائن پر بھی اکتفاء نہیں فرمایا، اس سے بھی بڑھ کر درجہ یقین کو ضروری قرار دیا، یہی وجہ ہے کہ حضرات فقہاء کرام نے یہ متفقہ ضابطہ مقرر فرمایا کہ امر محتمل کی وجہ سے کسی معین شخص کی حتمی تکفیر جائز نہیں، اگر کسی کلمہ میں تمام تر احتمالات موجب کفر بھی موجود ہوں لیکن اگر کوئی ایک ایسا احتمال بھی موجود ہو جو کفر کا موجب نہ بنتا ہو تو حتی الامکان اسی احتمال کو ترجیح دینی چاہئے اور اس کے مطابق تکفیر کا حکم لگانے سے احتراز کرلینا چاہئے۔

اگر مطلقِ قرینہ سے اندرونی کفر پر استدلال کرنا درست ہوتا تو صفحہ ہستی سے اسلام کب کا مٹ چکا ہوتا، اس لئے شریعت مطہرہ نے ہر قرینہ اور ہر دلالت کو اس باب میں کافی قرار نہیں دیا بلکہ دلالت قطعی کو ضروری قرار دیا، لہٰذا ہر گناہ کا ارتکاب کفر نہیں بلکہ صرف انہی امور کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جاسکتی ہے جو دلی کفر پر قطعیت کے ساتھ دلالت کریں، اور فقہاء کرام کے تمام تر جزئیات کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے امور چار ہیں جو لوزام / شرائط ایمان کے عنوان سے ذکر کئے جاچکے، اب ان امور کو ایمان کے اجزء قرار دیا جائے یا شریعت کی نظر میں ایمان کے معتبر ہونے کی شرائط کا نام دیا جائے، لیکن بہر حال حقیقت وہی ہے جو تحریر کی گئی۔

علامہ ابوالیسر بزدوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"الشئي كما يدلّ على شكله يدلّ على خلافه وضدّه عند عامّة اهل السنّة والجماعة وعامّة من يجعل الاستدلال حجة"[1]

"کوئی چیز جس طرح اپنے شکل پر دلالت کرتی ہے یوں ہی اپنے مخالف اور ضد پر بھی دلالت کرتی ہے یہی موقف اکثر اہل سنت والجماعت اور ان لوگوں کا ہے جو استدلال کو حجت تسلیم کرتے ہیں۔"

علامہ ابن الہمام کی عبارت

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے اپنی مفید کتاب "المسایرۃ" کے خاتمہ میں اس پر عمیق بحث فرمائی ہے جو اس موضوع کے لئے کافی حد تک کافی وشافی ہے۔۔

آپ لکھتے ہیں:

اعتبر فى ترتيب لازم الفعل وجود امور عدمها مترتب ضده كتعظيم الله تعالى وانبياءه وكتبه وبيته وترك السجود للصنم ونحوه والانقياد هو الاستسلام الي قبول اوامره ونواهيه الذي هو معنى الاسلام، وقد اتفق اهل الحق وهما فريقا الاشاعرة والحنفية علي انه لا ايمان بلا اسلام وعكسه، فيمكن اعتبار هذه الامور اجزاء لمفهوم الايمان فيكون انتفاء ذلك اللازم عند انتفاءها لانتفاء الايمان ان وجد التصديق.

"اسلام نے ایمان کے احکام واثرات مرتب کرنے میں چند امور کا اعتبار کیا جو اگر موجود نہ ہوں تو ایمان کے ضد یعنی کفر کے احکام مرتب ہوں گے، مثلاً اللہ تعالیٰ، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، آسمانی کتابوں اور بیت اللہ کی تعظیم کرنا، بت وغیرہ کو

[1] اصول الدين للبزدوي، ص٢٠.

سجدہ نہ کرنا، اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی کے قبول کرنے کی طرف جھکنا۔ اہل حق یعنی اشاعرہ اور حنفیہ (ماتریدیہ) کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایمان واسلام ایک دوسرے کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتے، اس تفصیل کے مطابق ان امور کو ایمان کے مفہوم کے اجزاء کہنا بھی درست ہے لہٰذا اگر تصدیق موجود بھی ہو لیکن کہیں ان امور کی وجہ سے ایمان کے لوازم واحکام جاری نہ ہو تو وہ خود ایمان کے منتفی ہونے کی وجہ سے ہوں گے (کیونکہ اجزاء کے نہ ہونے کی وجہ سے گویا ایمان ہی موجود نہیں)[1]

اس کے علاوہ علامہ ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب میں "الفتح المبین" میں ایمان کے تقریباً ان ہی "لوازم" کو ذکر فرمایا۔[2]

مشہور حنبلی متکلم علامہ شمس الدین سفارینی رحمہ اللہ نے بھی جمہور اشاعرہ وماتریہ کے حوالہ سے یہی نقل فرمایا، آپ لکھتے ہیں:

قال جمهور الأشاعرة والماتريدية: الإيمان هو التصديق بالنبي صلى الله عليه وسلم وبكل ما علم مجيئه به من الدين بالضرورة أي الإذعان، والقبول مع الرضا، والتسليم وطمأنينة النفس لذلك؛ تفصيلا فيما علم تفصيلا، وإجمالا فيما علم إجمالا.[3]

رہی یہ بات کہ خاص ان امور ہی کو ایمان معتبر ہونے کے لئے شرائط کے طور پر کیوں مقرر کیا گیا؟ شریعت کے تمام احکام وارکان میں سے انہی امور کا کیونکر انتخاب کیا گیا؟

---

[1] المسايرة ، ص ۲۸۱.

[2] الفتح المبين ، شرح حديث جبرئيل، ص۱۵۶.

[3] لوامع الأنوار البهية ،فصل في الكلام على الإيمان واختلاف الناس فيه،تنبيهات، ج۱ص ۴۲۰.

تو یہ ایک تفصیلی بحث ہے، یہاں مختصراً اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ یہ چاروں ایمان کے لوازم و شرائط ہیں، ایمان اور ان کے درمیان لزوم ذہنی بیّن ہے جس کے انتفاء سے ملزوم کا منتفی ہونا بدیہی ہے، نیز اگر ان لوازم کے ضد یا نقیض کا ارتکاب کیا جائے تو چونکہ اجتماع نقیضین محال ہے اس لئے اس کا ارتکاب ہی اس بات کی یقینی دلیل ہے کہ یہ لوازم منتفی ہو گئے اور ان کے انتفاء سے ملزوم یعنی اصل ایمان کا انتفاء لازم ہے۔

حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ جزئیات کو اگر خوب دقّتِ نظر کے ساتھ دیکھا اور سمجھا جائے تو اس سے اس بات کی پوری تائید حاصل ہو جاتی ہے، اس ناکارہ نے فقہی کتب کے مخطوط و مطبوع بعض کتابوں کے اکثر بلکہ تقریباً تمام کلمات کی تحقیق کی اور سب کو اس ضابطہ کے مطابق پایا، اگر رب کریم کی توفیق شامل حال رہی تو اس کو مستقلاً تطبیقی انداز میں ذکر کر دیا جائے گا۔

کفر کی لغوی تحقیق

کفر کا اصل مادہ "ک ف ر" تین حروف ہیں اور یہ مادہ کلام عرب میں بنیادی طور پر کسی چیز کو چھپانے، ڈھانکنے اور غائب کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، چنانچہ جب سپاہی اپنا زرہ کسی کپڑے وغیرہ میں چھپائے تو عرب کہتے ہیں "كفر درعه" یعنی اس نے اپنا زرہ چھپایا، اسی مناسبت میں سے قرآن کریم میں کاشتکار کو بھی کافر فرمایا گیا کیونکہ وہ بھی تخم کو زمین کے اندر چھپاتا ہے۔

اس مادہ سے بنے ہوئے تقریباً اکثر الفاظ میں یہی "پوشیدگی اور مخفی ہونے" کا معنی کارفرما ہوتا ہے، چنانچہ مقاییس میں ہے:

(كفر) الكاف والفاء والراء أصل صحيح يدل على معنى واحد، وهو الستر والتغطية. يقال لمن غطى درعه بثوب: قد كفر درعه. والمكفر: الرجل المتغطي بسلاحه.[1]

لغوی اور اصطلاحی معنی میں مناسبت

چونکہ اصطلاحی معنی میں لغوی معنی کا کافی حد تک لحاظ رکھا جاتا ہے، اسی طرح جس چیز کو شریعت کی اصطلاح میں کفر کہا جاتا ہے، اس میں بھی اصل لغوی معنی کی رعایت رکھی گئی ہے، اصطلاحی کفر کو بھی اسی لئے کفر کہا جاتا ہے کہ اس کا اختیار کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو چھپاتا اور غائب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتیں منصف مزاج فکر و نظر کے سامنے بالکل واضح اور عیاں ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر عقلاً واجب ہے اس کا وجوب صرف شریعت ہی پر موقوف نہیں۔

لہٰذا جب کوئی شخص اتنی واضح نعمتوں کے باوجود اس کی تکذیب کرے یا دین اسلام کی طرف دعوت دیئے جانے کے باجود اس کو قبول نہ کرے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی ان ساری نعمتوں کو چھپانے کی کوشش کی، اسی لئے اس کو بھی کفر کہا جانے لگا۔

علامہ ابو البقاء الکفوی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

الكفر: كل شيء غطى شيئا فقد كفره، ومنه سمي الكافر لأنه يستر نعم الله

"کفر ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جو دوسری چیز کو ڈھانکے، اسی مناسبت سے کافر کو بھی یہ نام دیا گیا کیونکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں چھپاتا ہے۔"[1]

---

[1] مقاييس اللغة، باب الكاف والفاء، ج٥ص١٩١.

کفر کا اصطلاحی تعارف

پہلی تعریف

اہل سنت والجماعت میں سے امام ابو بکر الباقلانی المالکی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۴۰۳ھ) کفر کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

هو ضد الإيمان وهو الجهل بالله عز وجل والتكذيب به الساتر لقلب الإنسان عن العلم به

"کفر ایمان کی ضد ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جہل اور اس کی تکذیب کا نام ہے جس کی وجہ سے انسان کا دل اللہ تعالیٰ کے بارے میں کچھ جاننے سے مستور رہے۔"[2]

لیکن بعض متکلمین نے اس پر یہ اشکال کیا کہ یہ تعریف اپنے افراد کو جامع ہے نہ ہی دخول غیر سے مانع ہے۔

اگر اللہ تعالیٰ کے ذات وصفات، وجود اور وحدانیت سے کسی بھی قسم کے ناواقفیت کو جہل قرار دیکر کفر کی تعریف میں داخل کیا جائے تو اس کی وجہ سے بہت سے مسلمان بھی کفر کے زمرے میں داخل ہو جائیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذات وصفات کا کامل اور محیط علم مخلوق کو کہاں میسر ہو سکتا ہے؟۔

---

[1] الكليات، فصل الكاف، مادة "كفر"، ج١ص٧٤٢.

[2] تمهيد الأوائل وتلخيص الدلائل، باب القول في معنى الكفر، ص٣٩٤.

اسی طرح بعض کفار بلکہ اکثریت ان لوگوں کی ہے جن کواللہ تعالیٰ کی معرفت کسی نہ کسی درجہ میں حاصل ہے جس کے ہوتے ہوئے ان کو کم از کم جاہل باللہ نہیں کہا جاسکتا، لیکن اس کے باوجود مختلف وجوہات کی بناءپر ان کو بالاتفاق کافر قرار دیا جاتا ہے۔

اگرچہ بعض متکلمین نے اس اعتراض کادفاع بھی کیا تاہم جمہور متکلمین نے اس تعریف کو قبول نہیں فرمایا۔

دوسری تعریف

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کفر کی اصطلاحی تعریف یہ لکھی کہ:

الکفر هوتکذیب الرسول صلی اللہ علیه وسلم فی شئی مماجاءبه[1]

آپ نے کفر کی اسی تعریف کو معیار بنایااوراس کی مطابق اپنی کتابوں میں مسئلہ تکفیر کے تمام پہلووں پر بحث فرمائی۔

تیسری تعریف

امام محمد بن مرتضی الیمانی رحمہ اللہ تعالیٰ ایثار الحق میں فرماتے ہیں:

واعلم أن أصل الكفر هو التكذيب المتعمد لشيء من كتب الله تعالى المعلومة أو لأحد من رسله عليهم السلام أو لشيء مما جاؤوا به إذا كان ذلك الأمر المكذب به معلوما بالضرورة من الدين.

"جان لو کہ کفر کی اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے معلوم (ثابت شدہ) کتابوں میں سے کسی کتاب کی یا اس کے کسی رسول کی یا ان حضرات انبیاء کرام کے لائے ہوئے

---

[1] فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة، ص۲۵.

تعلیمات کی تکذیب کی جائے، بشرطیکہ جس چیز کی تکذیب کی جارہی ہو، اس کا دینی حکم ہونا بداہۃً معلوم ہو۔"[1]

دونوں تعریفات میں یہ بات مشترک ہے کہ کفر ایک وجودی چیز ہے جو کہ حضور ﷺ یا ضروریات دین میں سے کسی ایک حکم کی تکذیب کا نام ہے۔

لیکن اس پر بھی متکلمین نے اشکال کیا کہ کفر صرف تکذیب ہی کا نام نہیں بلکہ عدم تصدیق کی شکل میں بھی کفر موجود ہو سکتا ہے، اگر کسی شخص نے حضور ﷺ کی تصدیق نہیں کی لیکن تکذیب بھی نہیں کی بلکہ اس طرف تعرض ہی نہیں کیا، اب یہ شخص بالاتفاق کافر ہے مگر اس تعریف کے مطابق چونکہ اس نے تکذیب نہیں کی اس لئے اس کو کافر کہنا درست نہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب دیا ہے کہ حضور ﷺ کے لائے ہوئے تعلیمات میں سے ایک ضروری حکم تصدیق بھی ہے کہ آپ کی تصدیق کی جائے، لہذا تصدیق نہ کرنا ہی تکذیب ہے جو کہ کفر ہے، اس لئے مذکورہ صورت میں اگرچہ شخص مذکور کی صراحۃً تکذیب نہیں یعنی حضور ﷺ کی طرف کذب کی نسبت نہیں کی، لیکن چونکہ تصدیق ضروری تھی جو اس نے کی نہیں اس لئے یہ عدم تصدیق ہی تکذیب ہے۔[2]

---

[1] إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات الى المذهب الحق.ص: ٣٧٦.

[2] شرح المقاصد، المقصدالسادس، المبحث السادس فى تعريف الكفر، ج٣ص٤٥٨.

کفر کی راجح تعریف

لیکن متکلمین کا یہ اشکال بھی چونکہ ایک حد تک معقول تھا اس لئے امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کے بعد کے متکلمین نے کفر کی تعریف میں اس نکتے کا لحاظ رکھا اور اس کی تعریف یہ کی کہ:

عدم الایمان عمامن شانه[1]

"جس چیز پر ایمان لانا ضروری ہے اس پر ایمان نہ لانا کفر ہے"

قاضی عضد الدین رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فهو عندنا عدم تصديق الرسول في بعض ما علم مجيئه به ضرورة[2]

آپ نے اپنی دوسری کتاب "العقائد العضدیۃ" میں کفر کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

الكفر عدم الايمان[3]

یعنی شریعت کی طرف سے بندوں کو جن چیزوں پر ایمان لانے کا حکم ہے، ضروری ہے کہ ان تمام اشیاء کی تصدیق کی جائے اور ان پر ایمان لایا جائے، ان اشیاء پر ایمان نہ لانا کفر ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص حضور ﷺ کی تصدیق نہیں کرتا اور تکذیب کی بھی جرأت نہیں کرتا تو اس تعریف کے مطابق وہ یقیناً کافر ہے،

---

[1] شرح المقاصد، المقصدالسادس، المبحث السادس فی تعریف الکفر، ج٣ص٤٥٧.

[2] شرح المواقف، المرصد الثالث، المقصد الثالث: في الكفر، ج٨ص٣٦١.

[3] شرح العقائد العضدية، ص:١٠٨.

کیونکہ ایمان کا اصل دار مدار اس پر تھا کہ حضور ﷺ کی تصدیق کی جائے جو اس نے کی نہیں، اس لئے وہ بلا تردد کافر کہلائے گا۔

ایمان اور کفر کے درمیان نسبت

جیسا کہ ابھی تحریر کیا جاچکا کہ کفر کی تعریف کرتے ہوئے حضرات متکلمین نے دو اسلوب اختیار فرمائے، بعض حضرات " حضور ﷺ کے لائے ہوئے یقینی احکام کے تکذیب و انکار" کو کفر قرار دیتے ہیں جبکہ بعض دیگر محقق متکلمین نے ایمان نہ لانے کو کفر کہا، اور ظاہر ہے کہ انکار و تکذیب تو چونکہ دونوں وجودی اشیاء ہیں، اور ایمان بھی تصدیق ہی کا نام ہے جس کا "وجودی" ہونا بھی بالکل واضح ہے، اس لئے اس تعریف کے مطابق ایمان اور کفر کے درمیان "تقابل" کی چار نسبتوں میں سے "تضاد" کی نسبت ہے۔

اور دوسری تعریف کے مطابق جب خود ایمان نہ لانا ہی کفر ہے تو ایمان و کفر کے درمیان ان چار نسبتوں میں سے تقابل عدم والملکۃ کی نسبت ہے۔

فقہاء حنفیہ میں سے علامہ برکوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کفر کی اسی دوسری تعریف کو ترجیح دی اور ساتھ یہ وضاحت بھی فرمائی کہ کفر کی تعریف انکار کے ساتھ کرنا اس لئے درست نہیں کہ کفر کی بہت سے اقسام پر یہ تعریف منطبق نہیں ہوتی، لہذا ایمان اور کفر کے درمیان یہی دوسری نسبت ہی درست ہے۔

آپ اپنی کتاب "الطریقۃ المحمدیۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:

(الکفر)هو عدم الإيمان عمن من شأنه أن يكون مؤمنا والإيمان هو

التصديق بالقلب بجميع ما جاء به محمد – صلى الله تعالى عليه وسلم – من عند الله تعالى والإقرار به عند عدم المانع حقيقة وحكما أو حكما فقط، وتفسير الكفر بالإنكار ليس بجامع لخروج الشك وخلو الذهن عنه، فعلى الأول بينهما تقابل العدم والملكة وعلى الثاني تقابل التضاد

"جو ایمان لا سکتے ہیں، اس کا ایمان نہ لانا کفر کہلاتا ہے، اور ایمان یہ ہے کہ دل سے ان تمام احکام کی تصدیق کی جائے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے اور جب کہ کوئی مانع نہ ہو تو زبان سے اپنے اس تصدیق کا اقرار بھی کرے، کفر کی تعریف صرف انکار کے ساتھ کرنا اپنے تمام افراد کے لئے جامع نہیں ہے کیونکہ اس تعریف سے شک بھی نکل جائے گا اور اگر ذہن بالکل ایمان و کفر سے خالی ہو تو وہ بھی کفر کی اس تعریف سے نکل جائے گا، پہلی تعریف کے مطابق ایمان و کفر میں تقابل عدم والملکۃ ہے جبکہ دوسری تعریف کے مطابق تضاد کا تقابل ہے۔"[1]

کفر کی مختلف قسمیں

کفر کی مختلف قسمیں ہیں، تمام اقسام میں قدر مشترک وہی ہے جو اوپر "تعریف" کے عنوان سے واضح کیا جاچکا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تعلیمات لے کر آئے ان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق نہ کرنا کفر ہے، اس تصدیق نہ کرنے کی مختلف شکلیں ہیں جن کو کفر کی اقسام کہا جاتا ہے۔

---

[1] الطريقة المحمدية، القسم الثاني في الأخلاق الذميمة،الأول الكفر بالله تعالى، ص:١٦٢.

اس بحث کو اگر مرتب انداز میں کوئی سمجھنا چاہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر انسان یا تو خالق کائنات کا اقرار کرے گا یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اسی کا انکار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل نہیں تو وہ دہری کہلاتا ہے، اور اگر وجود خداوندی کا اعتراف کرتا ہے تو اس کے بعد یہ مرحلہ ہے کہ کیا کائنات کا یہ عظیم خالق اپنی ذات وصفات میں اکیلا ہے یا اس کا کوئی شریک وسہیم بھی موجود ہے؟ جو لوگ خدا تعالیٰ کے ساتھ دوسرے افراد یا اشیاء کو بھی شریک کار بتاتے ہیں ان کو مشرک کہا جاتا ہے۔

خالق کائنات کے وجود اور وحدانیت کے بعد اگلا نکتہ یہ ہے کہ آیا وہ سلسلہ نبوت کا قائل ہے یا نہیں؟ کیا وہ یہ مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی اصلاح وہدایت کے لئے اپنے کچھ برگزیدہ بندوں کا انتخاب کرتا ہے اور پھر ان کو نبی بنا کر بھیجتا ہے یا نہیں؟ براہمہ سرے سے نبوت کے ہی قائل نہیں ہیں اسی طرح بعض فلاسفہ جو اپنے ناقص عقل کے بل بوتے معرفت خداوندی اور وصول الی اللہ کے مدعی ہیں، اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں نبی کو واسطہ بنانے کو اپنی ذلت وتوہین سمجھتے ہیں۔

جو افراد سلسلہ نبوت پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا ان کی آگے دو قسمیں ہیں، ایک قسم ان افراد کی ہے جو اس سلسلہ کے مختلف شخصیات کی نبوت کا یقین کرتے ہیں لیکن سرورِ کائنات ﷺ کے نبوت کا انکار کرتے ہیں کہ یا تو نعوذ باللہ آپ کو نبی ہی تسلیم ہی نہیں کرتے یا نبی تو مانتے ہیں لیکن صرف عرب تک آپ کی بعثت کو محدود تصور کرتے ہیں، اس قسم کے افراد مختلف انبیاء کرام علیہم وعلی نبینا الصلاۃ والسلام پر ایمان لانے اور نہ لانے کی بناء پر یہودی، عیسائی اور مجوسی وغیرہ ناموں کے ساتھ مشہور ہیں۔

اس کے مقابلے میں جو لوگ تمام حضرات انبیاء کرام کی نبوت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور یہ یقین کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کیلئے آپ کو رسول بنا کر بھیجا، ان کو مسلمان کہا جاتا ہے۔

ان مسلمانوں میں سے اگر کوئی شخص کفر اختیار کرے یعنی ایک مرتبہ حلقہ اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد دوبارہ کافر ہو جائے تو اس کو "مرتد" اور اس طرح کرنے کو "ارتداد" یا "ردت" کہا جاتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان کہلانے اور ظاہر کرنے کے باوجود غلط عقائد اور خلاف اسلام نظریات کی پرچار کرے، اسلام و ایمان کے نام پر کفریہ عقائد وخیالات کی تبلیغ کرتا رہے تو اس کو "زندیق" اور اس جرم کو "الحاد" اور "زندقہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

محلِ انکار کے اعتبار سے کفر کی قسمیں

ایمان و کفر کا دارمدار چونکہ انکار و تصدیق پر ہے اور اس انکار کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

بنیادی طور پر اس کی چار شکلیں ہیں کیونکہ یہ انکار یا تو:

۱۔ دل و زبان دونوں سے ہوگا یعنی دل میں بھی دین اسلام کی تصدیق نہ کرے اور زبان سے بھی اس کا اقرار نہ کرے ۲۔ یا صرف زبان سے ہوگا۔

۳۔ اور یا یہ انکار صرف دل ہی دل میں پوشیدہ ہوگا، پہلی صورت میں اس کو "کفر انکار" کہا جاتا ہے جو کہ کفر کی اصل شکل ہے، اور دوسری صورت کو "کفر جحود" سے

تعبیر کیا جاتا ہے، کفر کی اس قسم میں صرف زبانی انکار ہوتا ہے، دل میں حضور ﷺ اور دین اسلام کی تصدیق موجود ہوتی ہے، تیسری صورت کو "کفر نفاق" کہا جاتا ہے۔

۴۔انکار کی چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی دل میں بھی حضور ﷺ اور دین اسلام کی تصدیق کرے اور زبان سے بھی اس کے حقانیت کا اعتراف کرے لیکن اس کے باوجود محض ہٹ دھرمی، ضد اور عناد کی وجہ سے اس کے قبول کرنے سے انکار کرے، اس کو "کفر عناد" کہا جاتا ہے۔[1]

---

[1] شرح المواقف، تذنیب فی اصناف الکفار قبیل المقصدا الرابع ج۸ص۳۶۴. وشرح المقاصد، المقصد السادس فی السمعیات قبیل المبحث الرابع فی حکم من مخالف الحق من اھل القبلة، ج۳ص۴۶۱. فتح الملھم، کتاب الایمان، ج۱ص۵۱۱.

بابِ دوم

تکفیر کے باب میں احتیاط کے متعلق قرآنِ کریم اور حضور ﷺ کی تعلیم وہدایت

فقہاءِ کرام کا قدم بقدم اس کا اہتمام اور اور سلفِ صالحین کا تعامل

لزوم اور التزامِ کفر کا مسئلہ

مختلف نصوص میں لفظ "کفر" کے متعلق اہل سنت کا موقف

بروقت تکفیر نہ کرنے کے نقصانات اور اس کے متعلق حضرات صحابہ کا اجتماعی تعامل

اہل قبلہ کے تکفیر کا مسئلہ

حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ الفاظِ کفر کی حیثیت

باب دوم

اسلام اور کفر دو ایسے حقائق ہیں جن پر دین حق کے بہت سے احکام متفرع ہوتے ہیں، شریعت مطہرہ نے مسلمان اور کافر کے درمیان بہت سے احکامات میں فرق برقرار رکھا ہے، دنیا اور آخرت کے بیسیوں مسائل میں دونوں مختلف ہیں اور احکام کی اس اختلاف کی ایک بڑی بنیاد ایمان و کفر بھی ہے۔

دنیا میں کسی کافر کو سلام کرنا، اس کے ساتھ رشتہ ناطہ کرنا، مودت و محبت کی فضاء قائم کرنا، اس کی نماز جنازہ پڑھنا، اس کو کسی مسلمان کی میراث دینا یا اس کا ترکہ میراث میں لینا، اس کے حق میں دعائے مغفرت کرنا وغیرہ وغیرہ شرعاً جائز نہیں، جبکہ یہی امور کسی مسلمان کے ساتھ بالکل جائز بلکہ ان میں سے بعض تو اس کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی کا شریعت نے حکم دیا۔

یہ تو دنیوی زندگی کے اندر فرق تھا اور آخرت کا معاملہ تو بالکل واضح ہے کہ ایمان وکفر کے اصل نتیجہ کا اعلان وہی جاکر ہوگا، ایمان کے بنیادی ثمرات و برکات اور کفر کے اصل انجام و عاقبت کا نظارہ بھی وہی ہونا ہے، وہاں تو اسلام اور کفر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مختلف ہو جائیں گے۔

جب ان جیسے بنیادی امور میں تفریق کا واحد مدار اسلام و کفر ہی ہے تو کسی کو کافر کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ان تمام حقوق سے محروم ہے، اسلامی معاشرے کے اندر اس کے ساتھ ان تمام امور میں امتیازی سلوک کیا جائے اور آخرت میں بھی وہ اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمت سے نکل کر جہنم کا ایندھن بنے، اس کے ساتھ کسی مسلمان کا رشتہ وناطہ

جائز نہ رہے، مسلمان کی مودت ومحبت اور دوستانہ تعلقات سے وہ یکسر محروم رہے، نماز جنازہ پڑھے جانے کی سعادت سے وہ قاصر رہے اور دعائے مغفرت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی رحمت میں شامل ہو جانے کا وہ مستحق نہ ٹھہرے وغیرہ وغیرہ۔

اگران تمام احکامات کی اصل اساس اور بنیاد پر غور کیا جائے تو وہ یہی "تکفیر" ہی ہے، کافر ہونے یا قرار دینے کی وجہ سے شریعت کے ان تمام احکامات میں فرق آیا، اس لئے شریعت مطہرہ میں اس بات پر انتہائی زور دیا گیا کہ تکفیر کے سلسلہ میں انتہائی رعایت برتی جائے، حتی الامکان کسی مسلمان کو کافر کہنے سے قطعی گریز کی جائے تاکہ ایک لمحہ کی غلطی صدیوں کی سزا کا سبب نہ بنے۔

اس باب میں شریعت مطہرہ کے اسی احتیاطی پہلو اور اس کے مختلف مظاہر بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تکفیر میں افراط کرنا

کسی کو کافر کہنے کے بارے میں قرآن کریم کی ہدایت

قرآن کریم میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ جب تک پوری طرح تحقیق نہ ہو جائے تب تک کسی کو بلاوجہ کافر/غیر مسلم نہ کہا کریں، بلکہ اولاً پوری طرح تحقیق کر لیا کریں، اس کے نتیجہ میں اگر واقعۃً ایسے شواہد ملیں جس سے واضح طور پر اس کا کفر واضح ہو جاتا ہو تو پھر اس کے مطابق عمل کریں۔

ارشادِ خداوندی ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللَّهِ

مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَٰلِكَ كُنْتُمْ مِنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوا إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا}

"اے ایمان والو جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو ہر کام کو تحقیق کر کے کیا کرو اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے اطاعت ظاہر کرے۔ دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش میں یوں مت کہدیا کرو کہ تو مسلمان نہیں کیونکہ خدا کے پاس بہت غنیمت کے مال ہیں پہلے تم بھی ایسے ہی تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا سو غور کرو بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔" [1]

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "تحقیق" کرنے کا حکم دیا کہ کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح تحقیق کیا کرو، مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں "سفر" کی قید اتفاقی ہے جس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ عام طور پر اس قسم کے واقعات سفر ہی میں پیش آجاتے ہیں۔

اگلے جملہ میں یہ ہدایت کی گئی کہ جو کوئی بھی آپ کو سلام کرے یا مسلمانوں کے سامنے اپنی اطاعت ظاہر کرے تو اگرچہ سلام کرنے کے علاوہ اس کے مسلمان ہونے کی کوئی اور دلیل موجود نہ ہو لیکن اس کے باوجود اس کو کافر مت کہو بلکہ پہلے خوب تحقیق کرو، کیونکہ سلام کرنا یا مسلمانوں کی اطاعت میں داخل ہونا بظاہر اس بات کی علامت ہے کہ ایسا کرنے والا مسلمان ہے اور ایمان و کفر کا دار و مدار ظاہر ہی پر ہوتا ہے، لہٰذا جب تک اس ظاہر کے خلاف کوئی یقینی دلیل نہ ملے تب تک اس کو کافر کہنے کا حق حاصل نہیں۔

---

[1] [النساء : ٩٤]

امام جصاص رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی تفسیر میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا کہ اگرچہ قرآن کریم کے ظاہری اسلوب سے یہ واضح نہیں ہو رہا کہ ایسے شخص کو مسلمان کہا جائے بلکہ صرف غیر مسلم کہنے سے ممانعت کی گئی اور مزید تحقیق کرنے کا حکم دیا، لیکن متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مسلمان ہی کہا جائے گا، چنانچہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ نے اس حالت میں ایک شخص کو قتل کیا تو حضور ﷺ نے اس پر سخت عتاب کیا اور ارشاد فرمایا: اقتلت مسلما؟ گویا آپ ﷺ نے اس کو مسلمان قرار دیا[1]۔

تکفیر میں نہایت احتیاط کے متعلق حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیم

آپ ﷺ نے متعدد احادیث میں بے جا کسی کو کافر کہنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، متعدد روایات سے ثابت ہے کہ جو کوئی شخص کسی مسلمان کو کافر کہتا ہے تو اگر واقعۃً اس سے کوئی کفریہ قول و فعل سرزد ہوا ہو تب تو کوئی حرج نہیں، لیکن اگر اس سے اس طرح کسی عمل کا صدور نہیں ہوا جو موجب کفر ہو اور اس کے باوجود کسی نے اس کو کافر کہا تو یہ کفر خود کہنے والے کی طرف لوٹتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ نقل فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إذا قال الرجل لأخيه يا كافر، فقد باء به أحدهما

---

[1] احکام القرآن للجصاص الرازی، سور النساء، ج۲ص۳۵۰، دارالکتاب، کوئٹہ۔

"جب کوئی مسلمان اپنے (مسلمان) بھائی کو کافر کہہ کر پکارتا ہے تو یقیناً یہ لفظ دونوں میں کسی ایک کے سر پڑا (یعنی دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کافر ہوا)۔"[1]

مسند احمد کی روایت سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے، چنانچہ امام احمد رحمہ اللہ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ:

حدثنا نافع، أن عبد الله بن عمر أخبره، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: " إذا قال الرجل لصاحبه: يا كافر، فإنها تجب على أحدهما، فإن كان الذي قيل له كافر فهو كافر، وإلا رجع إليه ما قال[2]

حضور ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص اپنے مسلمان ساتھی کو کافر کہہ کر پکارتا ہے تو یہ (کافر ہونے کی بات) ان دونوں میں سے کسی کے حق میں ضرور ثابت ہو جاتی ہے، جس شخص کو کافر کہا گیا ہے، اگر وہ حقیقت میں بھی کافر تھا تب تو وہی کافر ہے ورنہ تو کہنے والے کی طرف یہ بات واپس لوٹتی ہے (اور اس کی وجہ سے وہ کافر ہو جاتا ہے۔)

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالی نے نقل فرمایا ہے کہ:

عن أبي ذر قال: سمعت النبي عليه السلام يقول: " لا يرمي رجل رجلا بالفسق، أو الكفر إلا ارتدت عليه إن لم يكن صاحبه كذلك

---

[1] (صحيح البخاري، كتاب الادب، باب من كفراخاه بغيرتاويل فهو كماقال، رقم الحديث: ٦١٠٤.

[2] مسند أحمد ،مسند عبد الله بن عمر رقم الحديث: ٥٨٢٤،ج١٠ص ٨٤، موسسة الرسالة.

کوئی شخص دوسرے پر فسق یا کفر کی تہمت نہیں لگاتا مگر اگر مخاطب اس تہمت کا مستحق نہ ہو تو یہ کلمہ کہنے والے ہی پر واپس لوٹتا ہے۔"[1]

ان احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو کافر کہنے میں انتہائی احتیاط رکھنی ضروری ہے، اگر اس میں ذرا سی بے احتیاطی کی جائے اور کسی ایسے شخص کو کافر کہا جائے جو واقعۃً کافر نہ ہو تو خود کہنے والا ہی کافر بن جاتا ہے، بعض حضرات محدثین کرام نے اس کی یہ توجیہ فرمائی ہے کہ کہنے والے کی طرف کفر نہیں لوٹتا بلکہ اس کہنے کا وبال اور گناہ اس کے سر آجاتا ہے، لیکن امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد جو روایت نقل فرمائی اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ توجیہ صحیح نہیں۔

چنانچہ آپ اپنی سند کے ساتھ مزید روایت نقل کرتے ہیں:

قال النبي عليه السلام: " ما شهد رجل على رجل بالكفر إلا باء بها أحدهما إن كان كافرا فهو كما قال، وإن لم يكن كافرا فقد كفر بتكفيره إياه "

"حضور ﷺ نے فرمایا: جب بھی کوئی شخص دوسرے کے کافر ہونے کی گواہی دیتا ہے تو دونوں میں سے کوئی ایک ضرور اس کا مستحق ٹھہرتا ہے، اگر مخاطب حقیقت میں کافر تھا تب تو وہی کافر ہے اور اگر وہ کافر نہ تھا تو خود کہنے والے (مسلمان کو) کافر کہنے کی وجہ سے کافر ہو چکا۔"[2]

معلوم ہوا کہ تکفیر کے باب میں ذرا سی بے احتیاطی انسان کو کفر کے حدود تک

---

[1] شرح مشكل الآثار ،باب بيان مشكل ما روي عنه عليه السلام فيمن قال لأخيه: يا كافر، ج٢ص٣٢٢.

[2] نفس المصدر.

لے جاسکتی ہے،اور کسی مسلمان کو ذرا ذرا سی بات پر کافر کہنے کی وجہ سے خود کہنے والا اسلام سے نکل سکتا ہے، وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ کسی مسلمان کو کافر کہنے کا مقصد یہی ہے کہ وہ جس دین و نظریہ کا حامل ہے وہ کفر ہے، اور جب وہ مسلمان ہے کوئی کفریہ بات اس سے صادر نہیں ہوئی تو گویا اس کے اسلام و ایمان ہی کو کفر کہا جارہا ہے، اور یہ یقیناً کفر ہے۔

امام طحاوی کی ذکر کردہ توجیہ

امام طحاوی رحمہ اللہ نے بھی اس قسم کے تمام احادیث کو تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کے بعد یہی نتیجہ نکالا، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

فتأملنا ما في هذا الحديث طلبا منا للمراد به ما هو؟ فوجدنا من قال لصاحبه: يا كافر معناه أنه كافر لأن الذي هو عليه الكفر فإذا كان الذي عليه ليس بكفر، وكان إيمانا كان جاعله كافرا جاعل الإيمان كفرا، وكان بذلك كافرا بالله تعالى؛ لأن من كفر بإيمان الله تعالى فقد كفر بالله، ومنه قول الله: {ومن يكفر بالإيمان فقد حبط عمله، وهو في الآخرة من الخاسرين} فهذا أحسن ما وقفنا عليه من تأويل هذا الحديث والله نسأله التوفيق۔[1]

"ہم نے اس حدیث کے اصل مقصود جاننے کے لئے غور کیا تو یہ بات واضح ہوئی کہ کسی کو کافر کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس دین پر وہ قائم ہے وہ کفر ہے، لہذا اگر کسی کا دین کفر نہ ہو بلکہ ایمان ہو تو اس کو کافر قرار دینے والا گویا خود ہی ایمان کو کفر

[1] نفس المصدر.

قرار دے رہا ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کا منکر ہوا کیونکہ جو کوئی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے

کا انکار

کر تو اس نے خود اللہ ہی کا انکار کیا۔۔۔ ہماری معلومات کے مطابق یہ اس حدیث کی

سب سے بہتر توجیہ ہے۔"

بلا تحقیق کفر کا حکم جاری کرنے پر حضور ﷺ کی سخت سرزنش

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اگر میں جنگ کے دوران کسی کافر سے لڑنے لگوں اور وہ تلوار سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے پھر کسی درخت وغیرہ کے سہارے مجھ سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرے اور یہ کہے کہ میں اسلام لایا یا کلمہ پڑھے، تو کیا ایسی سنگین صورت حال میں اس کو قتل کر سکتا ہوں؟

حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: کہ نہیں، آپ اس کو قتل نہ کرے، حضرت مقداد نے دوبارہ استفسار کیا کہ حضور ﷺ: اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کے بعد ہی یہ کلمہ کہا (اسلام میں واقعی رغبت رکھنے کی وجہ سے نہیں کہا بلکہ جان بچانے کا ایک حیلہ ہے) حضور ﷺ نے فرمایا:

لا تقتله فإن قتلته فإنه بمنزلتك قبل أن تقتله، وإنك بمنزلته قبل أن يقول كلمته التي قال.

"اس کو قتل نہ کرو کیونکہ اگر تم نے اس کو قتل کیا تو وہ اس درجہ پر ہوگا جس پر آپ قتل کرنے سے پہلے تھے اور تم اس درجہ پر ہو جائیں گے جس پر وہ اس کلمہ کہنے سے پہلے تھا۔"[1]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب تحريم قتل الكافر بعد أن قال: لا إله إلا الله، رقم الحديث: ١٥٥.

بظاہر تو یہاں قتل کرنے کی ممانعت ہے مگر چونکہ یہ قتل کا جواز اور عدم جواز ایمان کے قبول ہونے اور نہ ہونے پر ہے، اگر اس کہنے سے وہ مسلمان بنا تو اس کو قتل کرنا ناجائز ہے اور اگر محض اس کہنے کی وجہ سے اس کو مسلمان قرار نہ دیا جائے بلکہ بدستور کافر ہی کہا جائے تو اس کو قتل کرنا بھی جائز ہے، اس لئے اس حدیث شریف سے ایمان و کفر کا حکم لگانے کے متعلق احتیاط کی ضرورت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی شخص میں اسلام کا کوئی قرینہ موجود ہو تو وہاں کافر قرار دینے اور اس کے احکامات جاری کرنے میں جلد بازی سے کام لینا جائز نہیں۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ کے واقعہ سے اس کی مزید تاکید ثابت ہو جاتی ہے، جو اسی روایت کے بعد امام مسلم رحمہ اللہ تعالیٰ نے نقل فرمایا ہے، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ خود فرماتے ہیں کہ جہینہ سے لڑائی کے دوران میرا ایک کافر سے مقابلہ ہوا جب میں نے اس کو بالکل قابو کر لیا اس نے جٹ" لا الہ الا اللہ" کہا میں نے یہ سمجھ کر نیزہ مارا کہ یہ اسلام لانے کے لئے کلمہ نہیں پڑھ رہا بلکہ جان بچانے کی ایک جنگی سازش کرتا ہے اس لئے اس کہنے کی پرواہ نہیں کی بلکہ نیزہ مار کر قتل کر دیا، وہ نیزہ مارنے سے مرا لیکن میرے دل میں خلش باقی رہی۔

واپسی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار عالیہ میں یہی کچھ عرض کر دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں فرمایا:

أقال لا إله إلا الله وقتلته؟ قال: قلت: يا رسول الله، إنما قالها خوفا من السلاح، قال: أفلا شققت عن قلبه حتى تعلم أقالها أم لا؟

"کیا اس نے لا الہ الا اللہ کہا اور تم نے پھر بھی اس کو قتل کر دیا؟ (حضرت اسامہ نے عرض کیا کہ) اس نے یہ کلمہ اسلحہ کے ڈر سے کہا تھا (دل سے ایمان لانا مقصود نہ تھا)

حضور ﷺ نے فرمایا: تو تم نے اس کا دل کیوں نہیں چھیرا کہ تم جان لیتے کہ اس نے یہ کلمہ (دل سے) کہا تھا یا نہیں؟

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ نے یہ معذرت بھی پیش کر دی تھی کہ یہ شخص کوئی معمولی کافر نہ تھا بلکہ کئی ایک مسلمانوں کو اس نے قتل کر دیا اور کفر کی خاطر بڑی جرأت اور دلیری کے ساتھ لڑا، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ اس پر نہایت غمگین ہوئے اور حضرت اُسامہ کو بار بار سرزنش کرتے رہے۔

کئی بار تنبیہ اور عتاب کی وجہ سے خود حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ حال ہو گیا کہ وہ یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش: میں آج ہی حلقہ اسلام میں داخل ہو جاتا تا کہ اسلام لانے کی وجہ سے یہ گناہ مٹ جاتا۔

اس روایت سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ کفر اور کافر کہنے میں اور کفر کے احکامات جاری کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، مسلمان قرار دینے کے لئے تو اتنا کہنا کافی تھا کہ اس نے لا الہ الا اللہ پڑھا لیکن کافر قرار دینے کے متعلق واضح دلیل کی ضرورت تھی، صرف یہ احتمال ہر گز کافی نہ تھا کہ یہ جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھ رہا ہے کیونکہ ایمان و کفر کا دار مدار اگرچہ اصلاً دل پر ہے لیکن دنیا میں چونکہ دل کی حقیقی صورت حال اور تصدیق و تکذیب ہم کو یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی، اس لئے شریعتِ مطہرہ نے زبان پر اس کی بنیاد رکھی، لہٰذا جو کوئی بھی اپنے مسلمان ہونے کا مدعی ہو یا زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرے تو اس کو بلاوجہ کافر کہنا سخت جرم ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت اسامہ سے یہ بھی فرمایا تھا:

فكيف تصنع بلا إله إلا الله إذا جاءت يوم القيامة؟ قال: يا رسول الله، استغفر لي، قال: كيف تصنع بلا إله إلا الله إذا جاءت يوم القيامة؟

"تو قیامت کے دن جب لاالہ الااللہ آئے گا تو آپ اس کے ساتھ کیا کروگے؟ اسامہ نے عرض کیا کہ میرے لئے استغفار کرے، حضور ﷺ نے (پھر) فرمایا کہ تو قیامت کے دن جب لاالہ الااللہ آئے گا تو آپ اس کے ساتھ کیا کروگے؟[1]

حضور ﷺ کے ان کلمات سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس شخص کے "لاالہ الااللہ" کہنے کا اعتبار فرمایا تبھی بار بار دہرا کر عتاب فرماتے رہے۔

دربار نبوت کی خصوصی ہدایت

بعض احادیث میں حضور ﷺ نے خصوصی ہدایت فرمائی کہ کسی گناہ کی وجہ سے مسلمان کی تکفیر ہرگز نہ کی جائے، امام ابوداؤد رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی سند کے ساتھ روایت نقل فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " ثلاث من أصل الإيمان: الكف عمن قال: لا إله إلا الله، ولا نكفره بذنب، ولا نخرجه من الإسلام بعمل--

تین چیزیں اصل ایمان میں سے ہیں، جو کوئی لاالہ الااللہ کہے، اس سے رکنا (یعنی) اس کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر قرار نہ دینا اور نہ ہی کسی (غلط یا ناجائز) کام کی وجہ سے اس کو اسلام سے خارج سمجھنا"[1]

---

[1] نفس المصدر.

اس حدیث میں یہ بنیادی سبق دیا گیا کہ کلمہ گو مسلمانوں کی تکفیر سے حتی الامکان بچنا ضروری ہے، کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر قرار دینا یا کسی غلطی کی بنیاد پر اس کو دائرہ اسلام سے نکالنا، مسلمانوں کے حقوق سے محروم کرنا ہر گز جائز نہیں، تکفیر مسلم کے حوالہ سے احتیاط واعتدال ہی ایمان کے بنیادی احکام میں سے ہے۔

ایک اور حدیث مبارکہ میں بھی یہی تعلیم دی گئی کہ جو شخص اپنے اسلام وایمان کا دعوی کرے اس کو بلاوجہ کافر نہ کہا جائے، جو کوئی اس طرح کرے گا اس کی وجہ سے مخاطب تو کافر نہیں بنے گا لیکن خود یہ کہنے والا کفر کے حدود تک پہنچ جائے گا۔

امام طبرانی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل فرماتے ہے کہ :

عن ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كفوا عن أهل لا إله إلا الله لا تكفروهم بذنب، فمن أكفر أهل لا إله إلا الله فهو إلى الكفر أقرب.

"لا الہ الا اللہ (کہنے) والوں سے رکو، ان کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہ کہو کیونکہ جس کسی نے اس کو کافر کہا وہ خود مخاطب سے زیادہ کفر کے قریب ہے"[2]

ان ہی جیسی متعدد احادیث کی وجہ سے حضرات سلف صالحین نے اس معاملہ میں انتہائی حزم واحتیاط سے کام لیا، اور جب تک کسی کا کفر بالکل واضح نہ ہوا، تو ان کو مختلف

---

[1] سنن أبي داود، باب في الغزو مع أئمة الجور، رقم الحديث: ٢٥٣٢.

[2] المعجم الكبير للطبراني، باب العين، سعيدبن المسيب عن عبدالله بن عمر، رقم الحديث: ١٣٠٨٩.

گمراہیوں اور منکرات کے ارتکاب کی وجہ سے اگرچہ فاسق وگمراہ سمجھتے رہیں لیکن کافر کہنے سے ہمیشہ احتراز ہی کیا۔

بے بنیاد تکفیرِ مسلم کے ناجائز ہونے کے متعلق متواتر احادیث

علامہ محمد بن المرتضی الیمانی (المتوفی ۸۴۰ھ) رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان جیسے تمام احادیث پر بڑی تفصیل کے ساتھ محققانہ بحث فرمائی ہے اور یہ ثابت فرمایا ہے کہ "تکفیرِ مسلم" انتہائی خطرناک جرم ہے، بہت سے احادیث میں اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا گیا بلکہ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے حضور ﷺ سے نقل فرمایا ہیں کہ کسی دلیل واستحقاق کے بغیر کسی کو کافر قرار دینا خود موجب کفر ہے اور اس طرح کرنے سے خود کافر قرار دینے والا ہی کافر بن جاتا ہے۔

صحابہ کرام میں سے حضرت سیدنا ابوذر غفاری، ابوہریرہ، عبداللہ بن مسعود، عبد اللہ بن عمر بن الخطاب، ابوسعید خدری رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ حضرات نے یہ روایت نقل فرمائی اور اس روایت کے اتنے طرق اور مؤیدات ہیں جس کی وجہ سے یہ حدیث محققین کے نزدیک درجہ تواتر تک پہنچ جاتی ہے۔[1]

تکفیرِ مسلم میں احتیاط ایک بنیادی فقہی اصول کی روشنی میں

اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ جب کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر احکام اسلام کو قبول کرلیتا ہے تو وہ یقیناً دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے، اس کے بعد اس

---

[1] راجع للتفصيل كتابه: ايثار الحق علي الخلق في ردالخلافات الي المذهب الحق من اصول التوحيد، ص۴۲۰ تا۴۲۷.

پر مسلمانوں ہی کے احکامات جاری ہوتے ہیں، لہٰذا جب تک اس سے اس کے خلاف کوئی امر سرزد نہ ہو تب تک استصحاب حال کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کو مسلمان ہی کہا جائے گا، اگر خدا نخواستہ اس سے کوئی ایسا قول و فعل صادر ہو جائے جس میں کفر اور اسلام دونوں کا احتمال ہو تب بھی محض اس کی بنیاد پر اس کو کافر قرار دینا درست نہیں کیونکہ اس قول و فعل سے پہلے وہ یقیناً مسلمان تھا اور اس کے بعد اس کے اسلام میں شک ہو گیا کہ آیا وہ مسلمان رہا یا نہیں؟

اور یہ اصول تمام حضرات فقہاء کرام کے درمیان مسلم ہے کہ "الیقین لا یزول بالشک" لہٰذا اس محتمل عمل کے صدور کی وجہ سے اس کو کافر قرار دینا جائز نہیں۔

مشہور حنفی فقیہ علامہ محمود بن اسرائیل بن قاضی سماوہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "جامع الفصولین" میں کفریہ کلمات وافعال کے متعلق ایک مستقل باب باندھا ہے جس میں متقدمین اور متاخرین تقریباً اکثر فقہاء احناف کے ذکر کردہ الفاظ نقل کئے، اس باب کے شروع میں بطورِ میزان کے یہی اصول ذکر فرمایا ہے:

آپ تحریر فرماتے ہیں:

روى الطحاوي عن "ح" رحمه الله وأصحابنا أنه لا يخرج الرجل من الإيمان إلا جحود ما أدخله فيه ثم ما يتقين بأنه ردة يحكم بها له وما يشك بأنه ردة لا يحكم بها إذ الإسلام الثابت لا يزول بشك مع أن الإسلام يعلو.

"امام طحاوی رحمہ اللہ امام ابو حنیفہ اور ہمارے دیگر ائمہ احناف سے نقل کیا ہے کہ انسان ایمان سے انہی چیزوں کے انکار کی وجہ سے نکلتا ہے جن (پر ایمان لانے) کی وجہ سے وہ ایمان میں داخل ہوا تھا، پھر (تکفیر کا ضابطہ یہ ہے کہ) جن چیزوں کے کفر

وارتداد ہونے کا یقین ہو اس پر کفر کا حکم لگایا جائے گا اور جن امور کے بارے میں شک ہو تو اس کو بنیاد بنا کر کفر کا فیصلہ نہ کیا جائے کیونکہ ثابت شدہ اسلام شک کی وجہ سے ختم نہیں ہوتا، ساتھ یہ بھی ہے کہ اسلام ہی غالب ہوتا ہے۔"[1]

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے رسالہ "العقیدۃ الطحاویہ" میں اہل سنت والجماعت کے ضروری عقیدے کے طور پر یہ عبارت ذکر فرمائی۔

فقہاء کرام کا تکفیر کے متعلق نہایت درجہ احتیاط

تکفیر کے بیسوں احتمالات کے باوجود کافر نہ قرار دینا اور اس کی وجہ

ان ہی مذکور بالا روایات واصول کی روشنی میں حضرات فقہاءِ کرام نے بھی اس باب میں خصوصی احتیاط کا اہتمام کیا کہ جب تک کسی شخص کا کفر بالکل واضح نہیں ہوا تب تک اس کو کافر کہنے سے گریز ہی کرتے رہیں، اور متعدد فقہی جزئیات کا مدار ہی اس احتیاط پر رکھا۔

چنانچہ اکثر فقہاءِ حنفیہ نے یہ مسئلہ ذکر فرمایا ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جائے جس میں تمام ممکنہ احتمالات کفر ہی کا تقاضا کرتے ہوں، اور صرف ایک احتمال اس کے مسلمان باقی رہنے کا موجود ہو تو مفتی کے لئے ضروری ہے کہ جب تک اس کا واضح موقف سامنے نہ آئے اس وقت تک اسی ایک احتمال ہی کو ترجیح دے اور اس کو کافر نہ کہے۔

---

[1] جامع الفصولين، الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية. ج٢ص١٦٣.

علامہ ابنِ قاضی سماوہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اعلم أنه لو كان في المسألة وجوه توجب الكفر ووجه واحد يمنع التكفير فعلى المفتي أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير تحسيناً للظن بالمسلم ثم لو كانت نية القائل ذلك فهو مسلم ولو كانت نيته الوجه الذي يوجب الكفر لا ينفعه حمل المفتي كلامه فيؤمر بالتوبة وتجديد النكاح

"یاد رکھو کہ اگر کسی مسئلہ میں ایسے متعدد احتمال ہو جو موجب کفر ہوں اور ایک احتمال تکفیر سے بچنے کا بھی موجود ہو تو مفتی کی ذمہ داری ہے کہ مسلمان پر اچھا گمان کرتے ہوئے اسی احتمال کی طرف جھکے جو تکفیر سے مانع ہے، اگر کہنے والی کی نیت بھی یہی احتمال ہو تو اس کے مطابق وہ حقیقت میں بھی مسلمان رہے گا اور اگر اس کا ارادہ اسی احتمال کا ہو جو موجب کفر ہے تو مفتی کی توجیہ اس کے حق میں مفید نہیں ہو گی بلکہ اس کو دوبارہ توبہ کرنا اور نکاح کی تجدید کرنے کا حکم دیا جائے گا۔"[1]

فقہاء کرام کے نزدیک کفر اور تکفیر میں فرق کی رعایت

اس سے معلوم ہوا کہ کفر اور چیز ہے اور تکفیر اس سے بالکل الگ چیز ہے، اگر کہنے والا کا مقصود وہی کفریہ توجیہ تھی اور اسی مقصد کے لئے اس نے یہ کلمہ کہا تھا تو کہتے ہی وہ کافر ہوا لیکن مفتی ظاہر کا مکلف ہے وہ محض احتمال کی بنیاد پر اس کو کافر نہیں قرار دے سکتا، کیونکہ اس کلمہ کہنے سے پہلے اس کا اسلام یقینی تھا اور اس پر تلفظ کرنے کے بعد اس میں شک پیدا ہو گیا جو یقین کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں، لہٰذا جب تک خود متکلم کسی کفریہ احتمال کا التزام نہ کرے تب تک مفتی اس کو حتمی طور پر کافر نہیں قرار دے سکتا۔

[1] نفس المصدر.

لزوم اور التزام کفر کی تفریق: احتیاط کا ایک مظہر

اسی سے ملتا جلتا لزوم اور التزامِ کفر کا مسئلہ بھی ہے جو فقہاءِ کرام کے اس باب میں انتہائی احتیاط کا ایک مظہر ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص سے کوئی ایسا کلمہ صادر ہو جائے جو بذات خود تو موجب کفر نہ ہو لیکن اس سے کفر لازم آ رہا ہو یا کوئی ایسا کام کرے جس کی وجہ سے تو کسی شخص کو کافر قرار نہ دیا جا سکتا ہو لیکن اس فعل کا لازمی نتیجہ کفر ہے تو کیا اس لازم کو دیکھتے ہوئے اس شخص کی تکفیر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

اگر اس پہلو پر نظر رکھی جائے کہ جب کوئی شخص کسی کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کے لوازم پر بھی عام طور پر نظر ہوتی ہے، کام کرنے کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ کرنے والے نے اس کام کو کرتے ہوئے اس کے تمام لوازم بھی اپنے اختیار سے سرانجام دئے ہے، اور جب لازم کفر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جس قول و عمل کے ساتھ یہ لازم متعلق ہے اس کا مرتکب بھی کافر ہو کیونکہ "اذا ثبت الشئی ثبت بلوازمه" کا قاعدہ مسلم ہے، اب کیا اس قاعدہ کے مطابق اس کو کافر قرار دیا جائے یا نہیں؟

محققین فقہاءِ کرام اور اصولیین حضرات کا موقف یہ ہے کہ یہ شخص کافر نہیں ہو گا، جب تک خود اس کفر کا التزام نہ کرے تب تک محض لزوم کی وجہ سے اس کو کافر قرار دینا درست نہیں، مثلاً معتزلہ کا مشہور موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صفت علم قائم نہیں، جب کہ یہ بات بے شمار نصوص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ جو خالق کائنات ہے وہ عالم ہے۔

اللہ تعالیٰ سے اس صفتِ علم کے انکار کرنے کا لازم یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی

موجود نہیں (نعوذ باللہ تعالیٰ) کیونکہ اللہ تعالی تو اسی ہستی کا نام ہے جو دیگر صفات کمال کے ساتھ ساتھ صفت علم سے بھی متصف ہے، غیر عالم تو خدا ہے نہیں، لہذا جب کوئی اس صفت کے قیام بذاتہ تعالیٰ کا منکر ہے تو گویا وہ وجود خداوندی ہی کا منکر ہے جو کہ کھلم کھلا کفر ہے۔

اسی طرح بعض متقدمین اور متعدد معاصرین کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جہت ثابت ہے، خود امام ذہبی اور علامہ ابن قدامہ نے اس پر پوری پوری کتابیں لکھی ہیں اوراس بات کے بڑے شد و مد سے دلائل پیش کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لئے کم از کم جہت علو ثابت ہے، جب کہ یہ بات اتفاقی ہے کہ جہت کا ثبوت جسمیت اور تحدید کو مستلزم ہے، جو چیز کسی طرف یا جہت میں ہوتا ہے وہ لازماً چیز (جسم) ہی ہوتا ہے اوراس کے طول و عرض عمق بالکل متعین اور محدود ہوتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ان ناروا خیالات کا اثبات یقیناً ایسا کفر ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن ان تمام لوازم کے باوجود امت کے معتمد فقہاءِ کرام اور اصولیین نے معتزلہ کی تکفیر کی، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ جہت کو زور و شور سے ثابت کرنے والے افراد کو کافر قرار دیا، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ جو حضرات ان نظریات کے قائل ہیں وہ ان کے لوازم سے انکار کرتے ہیں، جب ان لوگوں کے سامنے اس کے لوازم پیش کئے جاتے ہیں تو وہ اس سے برملا براءت کا اظہار کرتے ہیں۔

مثلاً اگر کسی معتزلی سے کہا جائے کہ جب آپ صفت علم کے منکر ہے تو اس کا لازمی نتیجہ تو انکار خدا ہے تو وہ قطعاً اس سے انکار کرتا ہے، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے جہت فوق

کے قائل ہیں، جب ان کو یہ الزام دیا جاتا ہے کہ اس سے تو اللہ تعالیٰ کا جسم ہونا ثابت ہو جاتا ہے جو کہ احتیاج کو مستلزم ہے اور یہ یقیناً کفر ہے تو وہ پورے قوت کے ساتھ اس لازم کا انکار کرتے ہیں، اس لئے امت کے مستند فقہاء کرام اور معتمد متکلمین ہمیشہ ان کی تکفیر سے باز رہیں۔

فقہاءِ کرام کے اس احتیاط کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ یہاں دو الگ الگ چیزیں ہیں، ایک کسی عمل سے کفر کا لازم ہونا اور دوسرا خود اس شخص کا کسی کفریہ قول و عمل کا التزام کرنا۔

ان دونوں میں واضح فرق ہے، لزوم کفر کو یہ حضرات موجب کفر نہیں قرار دیتے کیونکہ یہ ایک احتمال ہی کے درجہ میں ہے اس سے یقینی استدلال نہیں کیا جاسکتا جب کہ سابقہ مباحث میں تفصیل کے ساتھ یہ بات گزر چکی کہ تکفیر کے لئے کسی واضح اور یقینی بنیاد کا ہونا ضروری ہے، احتمالی امور کو بنیاد بنا کر تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

اور دوسری صورت بالاتفاق کفر ہے کیونکہ جب کوئی شخص از خود کسی کفریہ قول وعمل کا التزام کرتا ہے تو یہ اس بات کی واضح دلیل اور یقینی قرینہ ہے کہ اس کے دل میں تصدیق موجود نہیں ہے۔

لزوم اور التزام کفر میں فرق امام عزالدین کی نظر میں

امام عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ تعالیٰ ایک اعتراض کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

فإن قيل: يلزم من الاختلاف في كونه سبحانه في جهة أن يكون حادثا؟ قلنا: لازم المذهب ليس بمذهب، لأن المجسمة جازمون بأنه

في جهة وجازمون بأنه قديم أزلي ليس بمحدث فلا يجوز أن ينسب إلى مذهب من يصرح بخلافه وإن كان لازما من قوله.

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے جہت ثابت کرنے اور اس متفقہ مسئلہ میں اختلاف کرنے سے تولازم آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حادث ہے (جو کہ یقیناً موجب کفر ہے) ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کسی مذہب سے جو لازم آرہا ہو وہ اصل مذہب کی طرح نہیں ہے کیونکہ مجسمہ جہت میں ہونے پر یقین رکھتے ہیں اور ساتھ قدیم اور ازلی غیر حادث ہونے کا بھی یقین رکھتے ہیں، لہٰذا کسی کی طرف ایسا قول منسوب کرنا درست نہیں جس کے خلاف وہ خود صراحت کررہا ہو اگرچہ اس کی بات سے غلط قول لازم بھی آرہا ہو۔"[1]

امام شاطبیؒ رحمہ اللہ کا موقف

امام ابو اسحاق شاطبیؒ رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

الذي كنا نسمعه من الشيوخ أن مذهب المحققين من أهل الأصول أن الكفر بالمآل، ليس بكفر في الحال، كيف والكافر ينكر ذلك المآل أشد الإنكار ويرمي مخالفه به، ولو تبين له وجه لزوم الكفر من مقالته لم يقل بها على حال.

"ہم شیوخ سے یہی سنتے رہے ہیں کہ محققین اصولیین کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی قول کا مآل یعنی لازم کفر ہو تو ابھی اس کو کفر کہنا درست نہیں، اس کو کفر کیونکر

---

[1] قواعد الأحكام في مصالح الأنام، قاعدة في بيان متعلقات الأحكام، ج١ص ٢٠٣.

کہا جاسکتا ہے حالانکہ وہ اس لازم کا شدید انکار بھی کرتا ہے اور اگر اس کو واضح ہو جائے کہ اس قول سے کفر لازم آرہا ہے تو کبھی ایسا قول اختیار نہ کرلیتا۔"[1]

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

لا يلزم إذا كان القول كفرا أن يكفر كل من قاله مع الجهل والتأويل ; فإن ثبوت الكفر في حق الشخص المعين، كثبوت الوعيد في الآخرة في حقه، وذلك له شروط وموانع.

"کسی قول کے کفریہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے ہر کہنے والے کو کافر بھی قرار دیا جائے اگرچہ وہ اس سے ناواقف ہو یا تاویل کر رہا ہو، کیونکہ کسی خاص آدمی کے حق میں کفر کا ثابت ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ آخرت میں اس کے لئے سزا ثابت کرنا، ان دونوں باتوں کے لئے کچھ شرائط اور کچھ موانع ہیں۔"[2]

علامہ شامی رحمہ اللہ کی نظر میں لزوم اور التزام کا فرق

علامہ محمد امین ابن عابدین شامی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اہل کتاب کے ساتھ نکاح کے مسئلہ میں ضمناً اس کی مختصر سی وضاحت فرمائی، آپ لکھتے ہیں:

أما المعتزلة فمقتضى الوجه حل مناكحتهم؛ لأن الحق عدم تكفير أهل القبلة، وإن وقع إلزاما في المباحث اهـ. وقوله: وإن وقع إلزاما في المباحث معناه، وإن وقع التصريح بكفر المعتزلة ونحوهم عند البحث

---

[1] الاعتصام للشاطبي، مسائل في حديث افتراق الأمة على ثلاث وسبعين فرقة، ج٢ص٧٠٨.

[2] منهاج السنة النبوية، فصل كلام الرافضي على دلالة العقل عنده على الأفعال الاختيارية والرد عليه، ج٥ص٢٤٠.

معهم في رد مذهبهم بأنه كفر أي يلزم من قولهم بكذا الكفر، ولا يقتضي ذلك كفرهم؛ لأن لازم المذهب ليس بمذهبهم.

دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ معتزلہ کے ساتھ نکاح حلال ہو کیونکہ حق مسلک یہی ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر نہ کی جائے اگرچہ (بعض اوقات) مباحث میں الزاماً تکفیر کی گئی ہے یعنی اگر معتزلہ وغیرہ کے ساتھ بحث و مناظرہ کے دوران ان کی مذہب کی تردید کرتے ہوئے بعض اوقات ایسا کہا گیا ہے کہ یہ بات تو کفریہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے موقف سے کفر لازم آرہا ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوں گے کیونکہ لازمِ مذہب اصل مذہب کی طرح نہیں ہے (کہ اس کی بنیاد پر تکفیر کی جاسکے)[1]

لزوم بیّن التزام کی طرح ہے

اس ساری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ لزوم کفر اور التزام کفر کے درمیان بڑا فرق ہے، کسی شخص کو التزام کفر کے بنیاد پر ہی کافر قرار دیا جاسکتا ہے لزوم کفر کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا جمہور امت کے نزدیک خلاف احتیاط ہے جیسا کہ امام ابن عبد السلام، امام شاطبیؒ، علامہ ابن تیمیہ اور علامہ شامی رحمہم اللہ تعالیٰ کے حوالے سے ابھی ذکر ہوا۔

لیکن یہ ساری تفصیل تب ہے جب یہ لزوم پوری طرح یقینی نہ ہو اور اس کے نتیجے میں جو کفریہ احتمال لازم آتا ہے، وہ بھی مکمل طور پر واضح اور معلوم نہ ہو تبھی اس کی بنیاد پر تکفیر سے بچے رہنا ضروری ہے، لیکن اگر لزوم بالکل یقینی اور لازم بالکل واضح اور معلوم ہو تو وہ لزوم بھی التزام کے حکم میں ہے جس طرح کفریہ قول و عمل کا التزام کفر

---

[1] حاشية ابن عابدين على الدر المختار كتاب النكاح،فصل فى المحرمات، ج٣ص ٤٥ .

ہے اسی طرح ایسے عمل کا ارتکاب بھی کفر ہے جس کے ساتھ کفریہ احتمال اس درجہ لازم ہو کہ اس کا لزوم ہر عقل مند کو معلوم ہو۔

علامہ ابو البقاء کفوی (المتوفی ۱۰۹۴ھ) رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

لزوم الكفر المعلوم كفر، لأن اللزوم إذا كان بينا فهو في الالتزام لا اللزوم مع عدم العلم به.

"اگر کفر کا کوئی لازم معلوم ہو تو اس لازم چیز کا ارتکاب بھی کفر ہے کیونکہ جب لازم بالکل واضح ہو تو وہ بھی التزام کے حکم میں ہے، البتہ اگر لزوم کا علم نہ ہو تو وہ التزام کی مانند موجب کفر نہیں۔"[1]

سلفِ صالحین کا تعامل اور طریقہ کار

سابقہ نُصوص اور فقہاءِ امت کی تصریحات سے شریعت مطہرہ کا عمومی مزاج واضح ہو جاتا ہے کہ تکفیر مسلم میں نہایت احتیاط مطلوب ہے، سلف صالحین کو بھی مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کا خوب خوب احساس تھا اس لئے ان حضرات نے بھی اس باب میں نہایت حزم و احتیاط کا ثبوت دیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق صحیح روایات میں ہے کہ حضور ﷺ نے اس سے فرمایا کہ آپ سے مومن ہی محبت کرے گا اور منافق شخص ہی آپ سے بغض رکھے گا، سنن ابن ماجہ میں بھی یہ روایت مذکور ہے لیکن اس کے باوجود جب خوارج نے آپ کے خلاف یلغار کیا، یہ لوگ آپ کے ساتھ نہایت بغض و نفرت کرتے تھے بلکہ سب و شتم پر اتر آئے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر آپ کو صاف صاف الفاظ

---

[1] الكليات، فصل الكاف، الكفر، ص: ٧٦٦.

میں کافر کہا کرتے تھے، اس حدیث کے مطابق ان کو منافق قرار دینا بظاہر کوئی مشکل نہ تھا کیونکہ حدیث کے الفاظ اس مفہوم میں بالکل واضح تھے لیکن اس کے باوجود آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت فقاہت اور احتیاط کا ثبوت دیا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نفیس جواب

چنانچہ جب آپ سے خوارج کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے بڑا عجیب جواب دیا، حافظ عبدالرزاق صنعانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سند کے ساتھ یہ پورا مکالمہ نقل فرمایا ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

لما قتل علي رضي الله عنه الحرورية , قالوا: من هؤلاء يا أمير المؤمنين أكفار هم؟ قال: من الكفر فروا، قيل: فمنافقون؟ قال: إن المنافقين لا يذكرون الله إلا قليلا وهؤلاء يذكرون الله كثيرا، قيل: فما هم؟ قال: قوم أصابتهم فتنة, فعموا فيها وصموا.

"جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ حروریہ (خوارج) سے قتال کر رہے تھے تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کیا یہ کافر ہیں؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کفر ہی سے تو یہ بھاگ نکلے ہیں؟ کہا گیا کہ پھر منافق ہیں کیا؟ آپ نے فرمایا کہ منافقین تو اللہ تعالیٰ کو تھوڑا ہی یاد کرتے ہیں جبکہ یہ لوگ اللہ کو زیادہ یاد کرتے ہیں (لہٰذا منافقین بھی نہیں ہیں)۔ کہا گیا کہ پھر (آخر) ہیں کون؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ کچھ لوگ ہیں جو فتنے میں مبتلا ہوئے اور اس میں اندھے و بہرے ہو گئے ہیں"۔

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اس حکیمانہ جواب سے امت کو یہ عظیم سبق دیا کہ ذاتی دشمنی اور آپس کی رنجشوں کی بنیاد پر شریعت کے حدود پامال نہ کریں، اور کسی کو کافر قرار دینے میں انتہائی احتیاط سے کام لیا جائے۔

علامہ محمد بن المرتضی رحمہ اللہ کا ذکر کردہ ایک نفیس نکتہ

علامہ محمد بن المرتضی الوزیر الیمانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "ایثار الحق علی الخلق" میں ایک بڑا ہی قیمتی اشکال اٹھایا۔

اشکال یہ ہے کہ جیسا کہ سابقہ ابحاث میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا کہ متعدد احادیث میں حضور ﷺ نے کسی مسلمان کو کافر قرار دینے سے سختی سے منع فرمایا بلکہ یہاں تک ارشاد فرمایا کہ اس کی وجہ سے خود تکفیر کرنے والے کی طرف کفر واپس لوٹتی ہے اور یہ روایات درجہ تواتر تک بھی پہنچی ہیں، ان احادیث کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جو شخص کسی مسلمان کو کافر کہے تو اس کو ایسا کافر قرار دیا جائے کہ جس کے کفر میں کوئی اختلاف نہ ہو، لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء کرام ایسے شخص کی تکفیر نہیں کرتے اور محض اس جرم بے احتیاطی کی وجہ سے اس کو دائرہ اسلام سے خارج تسلیم نہیں کرتے۔

ایک علمی اشکال اور اس کا جواب

تو اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان متواتر احادیث کے باوجود فقہاءِ کرام ایسے شخص کی تکفیر کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ متواتر احادیث بھی کفر کے ثابت کرنے سے قاصر ہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر اسے کافر نہ کہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

متواتر احادیث کے باوجود تکفیر نہ کرنے کی تین بنیادی وجوہات

اس اشکال کی طرف متوجہ کرنے کے بعد علامہ مرتضی یمانی رحمہ اللہ نے خود ہی اس پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور تقریباً بیس پچیس صفحات میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس بات کی وجوہات ذکر فرمائی ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلف صالحین اور فقہاء کرام مندرجہ ذیل چند وجوہات کی وجہ سے ایسے شخص کی تکفیر میں احتیاط کرتے رہیں:

ا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ان جیسے لوگوں کی تکفیر نہیں کی۔

لیکن اس پر یہ اشکال عائد ہوتا ہے کہ متواتر احادیث کی موجودگی میں صحابہ کرام نے کیوں خاموشی اختیار کی؟ ان صاف احادیث کی موجودگی میں حضرات صحابہ کرام نے کیوں ان جیسے لوگوں کو کھلم کھلا کافر نہیں کہا؟

حقیقت یہ ہے کہ عمومی تکفیر اور شخص معین کی تکفیر میں بڑا فرق ہے، کسی خاص قول و عمل کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ کفریہ کام ہے، اور چیز ہے اور خاص زید و بکر کو اس کی بنیاد پر کافر قرار دینا اس سے بالکل مختلف ایک اور معاملہ ہے، خود صاحب شریعت ﷺ سے ان دونوں معاملوں کے درمیان فرق ثابت ہے جو تیسرے باب میں ان شاء اللہ ذکر کیا جائے گا۔

۲۔ حضور ﷺ کے طرز عمل کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان مختلف گناہوں کے کرنے والوں کو کافر قرار دینے کا یہ حکم ہر حال میں جاری نہیں ہوتا بلکہ کسی مسلمان کے بارے میں یہ حکم تب ہی متوجہ ہوگا جب بلا تاویل قصداً کسی مسلمان کی تکفیر کی جائے

جیسا کہ امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب "مشکل الاثار" کے حوالہ سے پہلے ذکر کیا جاچکا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو منافق کہا، حضرت معاذبن جبل رضی اللہ عنہ نے لمبی نماز پڑھانے والے ایک شخص کو منافق کہا، دونوں واقعات حضور ﷺ کے روبرو ہوئے، آپ ﷺ مشاہدہ فرمارہے تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تجدید ایمان کا حکم دیا نہ ہی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو کلمہ پڑھ کر دوبارہ اسلام میں داخل ہونے کا ارشاد فرمایا۔

۳۔ان احادیث میں تکفیر مسلم پر کفر کا اطلاق بالکل بجا ہے، لیکن لفظ کفر شریعت کی اصطلاح اور قرآن وسنت کے استعمال میں ہمیشہ دائرہ اسلام سے خروج کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ متعدد مواقع پر کفر دون کفر کے لئے بھی یہ کلمہ استعمال ہوا ہے اس لئے حضرات محدثین نے اپنی کتابوں میں اس پر تفصیل سے بحث فرمائی ہے، تو ممکن ہے کہ یہاں بھی لفظ کفر کا یہی استعمال مراد ہو۔[1]

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ایثار الحق علی الخلق، ص۴۲۹ تا۴۵۲.

مختلف نصوص میں لفظ "کفر" کے استعمال کے متعلق اہل سنت کا موقف

قرآن وسنت میں مختلف اعمال کے لئے لفظ کفر کا استعمال ہوا، متعدد گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کو "کافر" فرمایا گیا، مثلاً اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرنے والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

{وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ}.

"جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں۔"[1]

کسی مسلمان کے ساتھ قتل وقتال کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفر کہا:

سباب المسلم فسوق، وقتاله كفر

مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے جبکہ اس کے ساتھ لڑنا کفر ہے"[2]

جو شخص غیر اللہ کی قسم اٹھائے اس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

من حلف بغير الله فقد كفر أو أشرك.

"جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی وہ یقیناً کافر ہو گیا، ایک روایت میں ہے کہ مشرک ہو گیا"[3]

بلاوجہ نماز چھوڑنے والے کے بارے میں ارشاد فرمایا:

---

[1] [المائدة: ٤٤].

[2] صحيح البخاري،باب خوف المؤمن من أن يحبط عمله وهو لا يشعر، رقم الحديث:٤٨.

[3] سنن الترمذي ت شاكر، باب ما جاء في كراهية الحلف بغير الله، رقم الحديث: ١٥٣٥.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: العهد الذي بيننا وبينهم الصلاة، فمن تركها فقد كفر.

"ہمارے اور ان کے درمیان عہد نماز ہے، لہٰذا جو کوئی اس کو چھوڑے تو وہ کافر ہو گیا" [1]

یہ ان گناہوں کا ایک نمونہ ہے جن کے متعلق قرآن وسنت میں کفر کا لفظ استعمال ہوا۔ [2]

ان نصوص کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان امور کا ارتکاب کرے تو وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے، نصوص کے اس ظاہری تقاضا کو دیکھ کر بعض لوگوں نے یہ موقف اپنایا بھی تھا۔

لیکن جمہورِ امت نے ان کے ساتھ اتفاق نہیں کیا بلکہ یہاں بھی خاص احتیاط کا دامن تھامے رکھا جس سے تکفیر مسلم کے باب میں احتیاط کے نئے دروازے روشن ہوتے ہیں، امت مسلمہ کے مستند حضرات متکلمین اور فقہاءِ کرام نے ان چند نصوص کی بناء پر کسی کی تکفیر کا فیصلہ نہیں کیا بلکہ تمام نصوص کو مجموعی طور پر دیکھا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بہت سے نصوص میں متعدد کبائر کے ارتکاب کرنے والوں کو مسلمان قرار دیا گیا، مثلاً قتل مسلم ایک عظیم جرم ہے مگر قرآن کریم میں خطاب کرتے ہوئے قاتل کو کافر نہیں کہا بلکہ "یاایہاالذین امنوا" کے ساتھ خطاب کیا

---

[1] سنن ابن ماجه، باب ما جاء فيمن ترك الصلاة، رقم الحديث: ١٠٧٩.

[2] علامہ ابن ابی زمنین مالکی رحمہ اللہ نے اس قسم کے احادیث کو کافی تفصیل ووضاحت کے ساتھ جمع فرمایا، ملاحظہ فرمائیں: أصول السنة لابن أبي زمنين ، باب في الأحاديث التي فيها نفي الإيمان بالذنوب، ص: 227تا ۲۵۲۔

اور پھر اسی آیت کریمہ میں قاتل اور مقتول کے ورثاء کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا گیا۔

مسلمانوں کا آپس میں جنگ و قتال کرنا نہایت عظیم گناہ ہے لیکن قرآن کریم میں لڑنے والے دونوں فریقوں کو مومن فرمایا گیا، زنا اور چوری کرنا دونوں کبیرہ گناہ ہیں لیکن اس کے باوجود دونوں کے ارتکاب کرنے والے کے متعلق حضور ﷺ نے ایک بار ضرور جنت جانے کی خوشخبری دی، جس پر سیدنا حضرت ابوذر غِفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کافی حیرت و تعجب بھی رہا۔

اسی طرح زنا، لواطت، قتل، چوری، کسی پر بہتان لگانا، شراب نوشی اور ڈاکہ زنی کرنا وغیرہ وغیرہ بڑے بڑے گناہ ہیں لیکن صحابہ کرام، تابعینِ عظام اور آج تک امت مسلمہ کے مستند علماء اور فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی مسلمان شخص ان گناہوں کا ارتکاب کرے تو اس کی وجہ سے اس کو ارتداد کے جرم کی پاداش میں قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ شریعت مطہرہ میں اس کے متعلق جو سزائیں مقرر فرمائی گئی ہیں، وہی سزا دی جائے گی۔

امت مسلمہ کے اندر عہد نبوی سے لے کر آج تک ایسے لوگ ضرور رہے جن سے دانستہ یا نادانستہ بعض بڑے بڑے گناہ کا صدور ہوا لیکن پوری امت نے آج تک ان جیسے لوگوں کے لئے جدا قبرستان کا انتظام نہیں فرمایا، حالانکہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عام حالات میں مرتد کو مسلمانوں کی قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا۔

اب اگر ان چند نصوص کے ظاہر کو دیکھا جائے تو ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں کو کافر کہنا چاہئے لیکن دوسری طرف شریعت کے یہ مندرجہ بالا احکام اور

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر آج تک امت مسلمہ کے اس اجتماعی تعامل و توارث کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے لوگ اگرچہ گناہ گار ہیں جن کو قانون کے مطابق سزا ملے گی لیکن محض اس عمل کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوئے، نہ ہی ان جیسے لوگوں پر کفر اور کافروں کے احکام جاری کرنا درست ہے۔

اہل سنت والجماعت کا موقف

اہل سنت والجماعت نے ان دونوں امور پر پورے اخلاص اور مکمل دیانتداری کے ساتھ گہرے غور و فکر کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ محض گناہ کبیرہ کا ارتکاب کفر اور ارتداد نہیں، اس کی وجہ سے کسی شخص کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا درست نہیں۔

مختلف نصوص میں تطبیق کی صورتیں

اور تمام نصوص و دلائل میں تطبیق دینے کے لئے ان حضرات نے یہ راہ اختیار فرمائی کہ جن نصوص میں بعض گناہوں کو کفر فرمایا گیا یا کسی گناہ کے کرنے والے کو کافر قرار دیا گیا، ان نصوص میں لفظ "کفر" سے عام متبادر معنی مراد نہیں یعنی دین اسلام سے نکلنا مقصود نہیں بلکہ لغوی معنی یعنی ناشکری مراد ہے، کہ اللہ اور رسول ﷺ پر ایمان لانے کا شکریہ یہ تھا کہ ان کے تمام احکام پر عمل کیا جاتا جب کہ اس شخص نے گناہ کا ارتکاب کر کے ناشکری کا ثبوت دیا۔

بعض حضرات نے تمام نصوص میں تطبیق کی دوسری صورت یہ اختیار فرمائی کہ ان نصوص میں کفر کا عام متبادر معنی ہی مراد ہے لیکن یہ سارے نصوص استحلال پر محمول ہے یعنی اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کرے تو واقعتاً وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو

جائے گا، لیکن صرف گناہ کرنے کی وجہ سے کفر لازم نہیں ہو گا، بلکہ اگر کرنے والا اس گناہ کرنے کو جائز سمجھے تب یہ حکم ہو گا۔

اور ظاہر ہے کہ جب ایک عمل کی ممانعت قرآن وسنت میں صراحت کے ساتھ موجود ہے تو اس کو جائز سمجھنا درحقیقت ان نصوص کی تکذیب ہی ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی کلام نہیں۔

تطبیق کے تمام صورتوں کا خلاصہ

بعض حضرات نے تطبیق کی اسی مقصد کے پیش نظر دوسرے تاویلات بھی کئے ہیں، علامہ شوکانی رحمہ اللہ جمہور امت کے ان جیسے تمام تاویلات کو بڑے اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وسائر أحاديث الباب على أنه مستحق بترك الصلاة عقوبة الكافر وهي القتل، أو أنه محمول على المستحل، أو على أنه قد يئول به إلى الكفر، أو على أن فعله فعل الكفار.

"اس باب کی تمام احادیث اس پر محمول ہیں کہ نماز چھوڑنے کی وجہ سے کافر جیسی سزا کا مستحق ہے (نہ یہ کہ وہ کافر ہے) یا جو کوئی اس (نماز چھوڑنے) کو حلال سمجھے، یا اس پر محمول ہیں کہ یہ عادت اس کو کفر کے حدود تک لے جائے گی (یعنی فی الحال صرف اس عمل کی وجہ سے کافر نہیں) یا یہ توجیہ کی جائے کہ یہ کام مسلمانوں کا نہیں ہو سکتا بلکہ کفار جیسا ہے۔"[1]

---

[1] نيل الأوطار، كتاب الصلاة، باب حجة من كفر تارك الصلاة، ج١ ص٣٦١.

واضح رہے کہ خود علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اگرچہ جمہور متقدمین اور متاخرین کے اس موقف کے ساتھ اتفاق نہیں کیا بلکہ اسی مبحث کے آخر میں اپنا یہ نقطہ نظر بیان کیا کہ بلا عذر نماز نہ پڑھنے والا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، لیکن دیگر ائمہ کرام کے مذاہب ذکر کرتے ہوئے اسی سابقہ موقف کو جمہور سلف وخلف کا مسلک کہا۔

نیز یہ بات بھی واضح ہونی چاہئے کہ جمہور کی بات بھی صرف نماز وغیرہ ایک دو مسائل کی حد تک ہے، ورنہ ان چند مسائل کے علاوہ باقی احکام میں یہ صرف جمہور ہی کا موقف نہیں بلکہ اہل سنت والجماعت کا اتفاقی مسلک ہے جیسا کہ آئندہ ابواب میں اس کی وضاحت کر دی جائے گی انشاءاللہ تعالیٰ۔

گناہ کبیرہ سے تکفیر کے متعلق ایک مفید تحقیق

امام ابو عبید قاسم بن سلاّم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الایمان" میں اس پر بڑے تحقیق وتفصیل کے ساتھ گفتگو فرمائی ہے، آپ نے پہلے تو ان روایات کو جمع کیا جن میں کسی گناہ پر کفر اور شرک کا اطلاق کیا گیا ہو یا حضور ﷺ نے کسی عمل کرنے والے کے بارے میں فرمایا ہو کہ ایسا کام کرنے والا ہم میں سے نہیں ہے، ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد آپ نے لکھا ہے کہ ان احادیث کے متعلق امت کے اندر پانچ موقف ہیں:

پہلا موقف:

ان روایات میں کفر سے اصطلاحی معنی میں کفر مراد نہیں بلکہ کفرانِ نعمت یعنی ناشکری مقصود ہے، یعنی جس نے فلاں فلاں کام کیا تو وہ اللہ تعالیٰ کا ناشکر ہے۔

لیکن یہ موقف درست نہیں کیونکہ اہل عرب کفر سے ہر جگہ کفران نعمت مراد نہیں لیتے تھے، اگر کہیں اللہ تعالیٰ کے نعمتوں اور احسانات کے سیاق وسباق میں یہ لفظ استعمال ہو جائے وہاں تو یہ تاویل کرنا بالکل درست ہے مگر اس کے بغیر ہر جگہ کفر سے ناشکری کا معنی مراد لینا اہل عرب کے نزدیک معروف نہیں۔

دوسرا موقف:

یہ تمام نصوص تغلیظ وترہیب پر محمول ہیں۔

لیکن یہ موقف بھی غلط ہے کیونکہ اس سے حقیقی معنی کی نفی کرنا مقصود ہے یعنی حقیقت میں یہ اعمال کفر نہیں، ان کی وجہ سے کوئی کافر نہیں ہوتا بلکہ صرف لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے ایسا کہا گیا، حضور ﷺ کے شان اقدس سے یہ احتمال بعید ہے خصوصاً کفر واسلام جیسے اہم اور بنیادی مسائل میں۔

تیسرا موقف:

ان نصوص کا ظاہری اور حقیقی معنی ہی مقصود ہے یعنی جو شخص بھی ایسا کوئی کام کرے تو وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے، یہی موقف خوارج نے اپنایا تھا۔

لیکن یہ موقف بھی بالکل غلط ہے، ذخیرہ احادیث میں ایسی بہت سی روایات موجود ہیں جس میں قتل، زنا اور شرب خمر سے کم تر گناہوں پر بھی کفر وشرک وغیرہ کا اطلاق فرمایا گیا ہے، اگر ہر جگہ حقیقی کفر ہی مراد لیا جائے تو ایک بڑا اشکال یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ جب ان نصوص کے مطابق قتل اور زنا وغیرہ جرائم کفر ہیں تو اگر کوئی مسلمان شخص ان امور کا ارتکاب کرے تو اس پر ارتداد کی شرعی سزا جاری کرنا کیوں لازم بلکہ جائز نہیں؟

ارتداد کی سزا قتل کرنا ہے لیکن اس کے باوجود زانی غیر محصن کے قتل کرنے کو شریعت نے حرام قرار دیا، مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں حالانکہ ارتداد کی سزا حتمی ہے جس میں اس طرح اختیار نہیں، شراب خور کو قتل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ صرف کوڑے لگوانے ہی پر اکتفاء فرمایا گیا، اگر سچ مچ یہ سارے امور کفریہ ہیں اور اس کی وجہ سے ایمان برقرار نہیں رہتا تو پھر حدود و تعزیرات کو مقرر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ یہ تو ان متواتر نصوص کے خلاف ہے جن میں ارتداد کی سزا قتل قرار دی گئی ہے۔

چوتھا موقف:

ان نصوص کے متعلق امت کے اندر ایک طبقہ میں یہ موقف اپنایا جاتا رہا کہ ان سارے نصوص کو رد کر دیا جائے۔

لیکن اس موقف کے غلط ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ امت کے مستند اسلاف واخلاف میں سے کسی نے اس کو قبول نہیں فرمایا بلکہ بعض اہل بدع ہی اس کو اختیار کرتے رہے ہیں جن کو حدیث اور علم حدیث کے باب میں کوئی خاص درک حاصل نہیں تھا۔

پانچواں موقف:

علامہ ابن سلام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ان اعمال کی وجہ سے بالکلیہ کسی مسلمان کا ایمان زائل ہوتا ہے نہ ہی محض ان امور کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے، البتہ ان گناہوں کی وجہ سے ایمان کے حقیقت واخلاص اور اس کے ثمرات و برکات کے اندر کمی آجاتی ہے، شریعت کی نظر میں گناہوں کی صغر و کبر اور

ثقل وخفت کے بقدر ایمان کے برکات سے محرومی ہو جاتی ہے، جس کا ایک بڑا قرینہ یہ بھی ہے کہ خود قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر ایمان کے فوائد و ثمرات کے لئے عمل صالح کی قید لگائی گئی ہے۔[1]

"اہلِ قبلہ" کے تکفیر سے متعلق حضرات صحابہ کرام کا طرزِ عمل

جو لوگ دین اسلام اور اس کے تمام تر "ضروریات" کے قائل اور معترف ہوں، ان کو "اہل قبلہ" کہا جاتا ہے، اسی باب کے شروع میں کئی روایات ذکر ہوئے جن میں ایسے لوگوں کو کافر کہنے سے ممانعت کی گئی تھی، انہی روایات کی روشنی میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا یہ معمول تھا کہ وہ تکفیر کے باب میں خاصی احتیاط سے کام لیا کرتے تھے اور حتی الامکان کسی مسلمان کو کافر اور مشرک کہنے سے گریز کرتے تھے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے اسی مسئلہ کے متعلق سوال پوچھا کہ کیا آپ لوگ (یعنی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) اہل قبلہ میں کسی شخص کو کافر بھی کہتے تھے؟ آپ نے معاذاللہ کہہ کر نفی میں جواب دیا، علامہ ابن زمنین رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

عن أبي سفيان قال: سأل رجل جابر بن عبد الله هل كنتم تسمون أحدا من أهل القبلة كافرا؟ قال: معاذ الله، قال: فهل تسمونه مشركا؟ قال: لا.

---

[1] الإيمان للقاسم بن سلام ،باب الخروج من الإيمان بالمعاصي،من ص: ٣٦الى ص٤٨-المكتب الاسلامي.

"ایک شخص نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا آپ لوگ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر کہتے تھے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی پناہ(یعنی ہم نے کبھی ایسا جرم نہیں کیا)، سائل نے کہا کہ کیا مشرک کہتے تھے؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔"[1]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے اس جواب سے حضرات صحابہ کرام کا احتیاط معلوم ہوا کہ وہ بلاوجہ کسی کی تکفیر نہیں کرتے تھے حالانکہ ان حضرات کے آپس میں اختلافات بھی واقع ہوئے، بعض سیاسی اور مذہبی مسائل میں ایک دوسرے کے خلاف رائے رکھنے کے مواقع سے بھی ان حضرات کا سامنا ہوا، بعض حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان یہ اختلافات باہمی جنگ کی صورت بھی اختیار کر گئے چنانچہ "مشاجرات صحابہ" کی ایک پوری تاریخ موجود ہے۔
لیکن اس سب کچھ کے باوجود ایک دوسرے کے لئے یا کسی بھی مسلمان کے حق میں لفظ "کفر" استعمال کرنے سے حتی الامکان گریز ہی کرتے رہیں جب تک کوئی شخص دین اسلام کے قطعی اور یقینی دلائل کا انکار نہ کرتا، اس وقت اس کو مسلمان ہی سمجھا جاتا رہا۔

اور یہ صرف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہی معمول نہ تھا بلکہ امت محمدیہ نے ہمیشہ رشد وہدایت کے ان تابندے ستاروں سے رہنمائی لی اور ان ہی کے نقش قدم پر چلے ہیں، علامہ عضد الدین اِیجی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

جمهور المتكلمين والفقهاء على أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة.

---

[1] أصول السنة لابن أبي زمنين (ص: ٢٢٠).

"اکثر متکلمین اور فقہاء کرام کا مسلک یہ ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہا جائے۔"[1]

تکفیر کے باب میں تفریط کرنا

کسی کافر کو مسلمان قرار دینے کے متعلق احتیاط کا پہلو

یہاں تک یہ بیان کیا گیا کہ کسی کو کافر قرار دینے میں خاصی احتیاط کی ضرورت ہے، تکفیر کے معاملے میں جلد بازی اور جذباتیت سے بچنا اور بچے رہنا ضروری ہے جب تک کسی کے قول وفعل میں ایمان واسلام کا پہلو موجود ہو تب تک اس کی تکفیر سے گریز کر لینا چاہئے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ تکفیر کا دروازہ بالکل بند ہے کسی کو کافر قرار دینا ناجائز ہے، نہ ہی اس کا یہ مقصد ہے کہ کفر کی شرائط اگر موجود بھی ہو جائے تب بھی کافر نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ بے دھڑک کسی مسلمان کو کافر کہنا اور کفر کے تمام تر شرائط کی موجودگی کے باوجود کسی کو مسلمان کہنے پر اصرار کرنا، یہ دونوں افراط و تفریط کے مظاہر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں معاملے انتہائی خطرناک اور بہت ہی غور و فکر کے متقاضی ہیں، کیونکہ اسلام و کفر کے بنیاد پر دنیا اور آخرت کے بیسیوں احکام مبنی ہیں، کسی مسلمان کو کافر کہنے کا معنی یہ ہے کہ اس پر دنیا میں بھی کفر ہی کے احکام جاری ہوں اور آخرت میں بھی اس کا حشر و نشر کفار کے ساتھ ہو۔

---

[1] شرح المواقف، المرصد الثالث، المقصد الخامس في أن المخالف للحق من أهل القبلة هل يكفر أم لا، ج٨ص٣٧٠.

اسی طرح اگر مسلمان شخص کوئی ایسا قول و فعل کرے جو واقعی کفر وارتداد کا موجب ہو اور موانع وغیرہ بھی موجود نہ ہوں بلکہ خود ہی کفریہ پہلو کا التزام کرے جس کی وجہ سے وہ یقینی طور پر کافر ہو جائے، اس کے باوجود اگر اس کو "بے جا احتیاط" کے نام پر مسلمان ہی کہا جائے تو اس کا تقاضا یہی ہو گا کہ اس پر دنیا اور آخرت دونوں میں مسلمانوں کے احکام جاری ہوں ، التزامِ کفر کے باوجود دنیا میں بھی اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کیا جائے اور آخرت میں بھی مسلمانوں کی فہرست میں اس کا نام درج ہو۔

تکفیر کے متعلق اہل سنت والجماعت کا راہ اعتدال

ان وجوہات کی بناء پر اہل سنت والجماعت کا مسلک یہ ہے کہ اولاً تو کسی مسلمان کو کافر کہنے سے گریز کرنا ضروری ہے، اگر کوئی ایسا کام اس سے سرزد ہو جائے جس میں اکثر پہلوؤں کفر کے موجب ہوں لیکن کوئی ایسا پہلو موجود ہے جو اس کے ایمان کا متقاضی ہے تو حتی الامکان کافر قرار دینے سے احتراز ہی ضروری ہے، البتہ اگر وہ خود کسی کفریہ احتمال کا التزام کرے یا کوئی مسلمان شخص کوئی ایسا قول و فعل اختیار کرے جو یقینی طور پر موجب کفر ہو اور شخص مذکور کے حق میں اس کے کوئی موانع وغیرہ بھی موجود نہ ہوں تو ایسی صورت میں اس کی تکفیر کرنی ضروری ہے تاکہ ایمان واسلام کے حدود بالکل واضح اور دوٹوک باقی رہے اور دونوں کے احکام جاری کرنے میں عوام الناس کو کوئی دقت نہ پیش آئے۔

بروقت تکفیر نہ کرنے کا نقصان

کفر کے التزام کے باوجود کافر نہ کہنے میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص کفر اختیار کرے تو اس کو مسلمان کہنے کا مطلب اس کے دین و نظریہ کو اسلام کہنا ہے اور جب اس کا موجودہ نظریہ کفر ہے تو اس کو اسلام کہنا گویا کفر کو اسلام کہنا ہے جس کی شناعت محتاج بیان نہیں، جس طرح امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو کافر کہنے کے کفر ہونے کی یہی توجیہ لکھی ہے کہ اسلام کے باوجود اس کو کافر کہنا در حقیقت اسلام کو کفر کہنا ہے جو کہ کفر ہے۔

یہی صورت حال یہاں بھی ہے کہ اگر کسی کا کفر یقینی طور پر ثابت ہو تو اس کو مسلمان کہنے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس کا نظریہ و مذہب اسلام ہے اور ظاہر ہے کہ کفر کو اسلام کہنا خود موجب کفر ہے۔

امام الحرمین کا ایک زریں ملفوظ

علامہ قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۵۴۴ھ) نے نقل فرمایا ہے کہ کسی نے امام الحرمین رحمہ اللہ تعالیٰ سے اسی قسم کے ایک مسئلہ کے متعلق دریافت کیا جس میں اسلام و کفر دونوں کا پہلو موجود تھا تو آپ نے سائل کو اس بنا پر جواب دینے سے معذرت کی کہ ان جیسے مسائل میں معمولی غلطی بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ:

لأن إدخال كافر في الملة وإخراج مسلم عنها عظيم في الدين.

"کسی کافر کو ملت اسلام میں داخل کرنا اور کسی مسلمان کو اس سے نکالنا دینی لحاظ سے بڑا (اور نہایت نازک) معاملہ ہے[1]

تکفیر کی ذمہ داری بروقت ادا کرنے کے متعلق حضرات صحابہ کرام کا طرزِ عمل

رسول اللہ ﷺ جب دنیا سے تشریف لے گئے اور آپ ﷺ کی جگہ سیدنا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسند خلافت کے لئے حضرات صحابہ کرام کے باہمی اتفاق سے نامزد ہوئے، تو اس وقت عرب دنیا کے اندر شیطان نے ایک انقلاب برپا کیا جس میں دیکھتے ہی دیکھتے بستیوں کی بستیاں مرتد ہوتی چلی گئی، کوئی اپنے آبائی دین کی طرف لوٹنے لگے کوئی مسیلمہ کذاب اور اسود عنسی کی نبوت پر ایمان لانے کی وجہ سے ختمِ نبوت کے منکر ہوئے اور حضور نبی کریم ﷺ کے بعد نئے نبی پر ایمان لانے کی وجہ سے مرتد ہوئے۔

ارتداد کی ان مختلف شکلوں میں ہزاروں افراد دینِ اسلام سے نکل گئے، ایک گروہ ان لوگوں میں سے ان افراد کی بھی تھی جو نماز اور زکوۃ میں تفریق کرتے تھے اور بعض نصوص کے ظاہر کی وجہ سے زکوۃ کے حکم کو حضور ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص سمجھتے تھے۔

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، فصل فى تحقيق القول فى اكفارالمتأولين، ج۲ص۲۷۷.

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سب افراد کے خلاف فوراً فیصلہ کیا اور ان کے خلاف مجاہدین کے لشکر بھیجے جس میں ہزاروں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شریک ہوئے، تقریباً تمام صحابہ کرام بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام کے ساتھ بالکل متفق تھے، صرف ان آخری افراد کے متعلق سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابتداء میں اشکال پیش آیا لیکن مختصر سی بحث و تمحیص سے وہ اشکال بھی کافور ہو گیا اور انجام کار صحابہ کرام کے اتفاق سے مرتدین کے خلاف جہاد عمل میں آیا۔

حضرات شیخین کا باہمی مکالمہ

حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا باہمی مکالمہ مختلف کتب میں اجمال اور تفصیل کے ساتھ درج ہے، ایک روایت کے مطابق حضرت فاروق نے نرمی برتنے کا مشورہ دیا جس پر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو رہتی دنیا تک آبِ زر سے لکھا جائے گا، آپ نے فرمایا:

إنه قد انقطع الوحي، وتم الدين، أينقص وأنا حي؟.

"یقیناً وحی کا سلسلہ ختم ہوا اور دین پورا ہو چکا ہے، تو کیا دین میں سے کچھ کمی جائے گی اور میں زندہ ہوں گا۔"[1]

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس طرز عمل اور فوری اقدام سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کہیں کسی فرد یا جماعت سے اسلام و ایمان کے خلاف کوئی ایسا عمل وجود

---

[1] صحیح البخاري، کتاب الصلاة، باب فضل استقبال القبلة، رقم الحدیث: ۳۹۱.

میں آئے جو شریعت کی نظر میں موجبِ کفر ہو تو علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ بروقت اس کی تشخیص کریں اور امت کو اس فتنے سے آگاہ کریں، تاکہ عام مسلمانوں کا دین و ایمان محفوظ رہے۔

حضرات شیخین کے اس مکالمہ سے یہ رہنمائی بھی مل جاتی ہے کہ کسی شخص یا کسی قوم کو کافر قرار دینے یا کفر کے احکام جاری کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، اگر اس حوالے سے اہل علم کو ذرا بھی شبہ ہو تو مل بیٹھ کر شرعی اصول کی روشنی میں اس کا حل نکالنا چاہئے۔

ایک مسلم ضابطہ

تکفیر کے تمام تر شرائط موجود ہونے اور پوری طرح تحقیق کرنے کے بعد بھی تکفیر نہ کرنا متعدد مفاسد کا ذریعہ ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر متکلمین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ جب کسی شخص کے بارے میں متحقق ہو جائے کہ وہ کسی کفریہ عقیدہ کا حامل ہے اور تکفیر کے لئے متکلمین وفقہاء کرام نے جو ضروری شرائط لکھے ہیں (جو اسی کتاب کے باب سوم میں تفصیل وترتیب سے مذکور ہیں) وہ بھی مکمل طور پر موجود ہوں، تو ان تمام امور کے بعد ایسے شخص کو کافر سمجھنا ہی ضروری ہے، اس کو مسلمان کہنا حرام ہے بلکہ قاضی عیاض رحمہ اللہ ایک ایسے ہی مسئلہ کے بارے میں اجماع نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (یقینی) کافر کی تکفیر نہ کرنا کفر ہے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

قال محمد بن سحنون أجمع العلماء أن شاتم النبي صلى الله عليه وسلم المتنقص له كافر والوعيد جار عليه بعذاب الله له وحكمه عند الأمة قتل ومن شك في كفره وعذابه كفر.

"فقیہ محمد بن سحنون (مالکی) فرماتے ہیں کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں گستاخی اور تنقیص کرنے والا کافر ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے عذاب کی وعید (جو قرآن کریم میں مذکور ہے) ثابت ہے اور امت مسلمہ کے نزدیک ایسے شخص کا حکم قتل کرنا ہے، اور جو کوئی اس کے کفر اور عذاب میں تردد کرے وہ بھی کافر ہے۔"[1]

اہلِ قبلہ کی تکفیر کا مسئلہ

یہاں تک جو تفصیلات ذکر کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تکفیر کے باب میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے، کسی مسلمان کو کافر کہنا بھی گناہ کبیرہ اور امت مسلمہ کے حق میں عظیم جرم ہے اور جس شخص کا کفر یقینی دلائل سے ثابت ہو اس کو مسلمان کہنے کا بھی یہی حکم ہے کہ ایک طرف کہنے والے کے حق میں بلادلیل ایسا کہنا گناہ کبیرہ ہے اور دوسری طرف عام مسلمانوں کے دین وایمان کی سلامتی کو بھی اس سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، اس لئے جس طرح تکفیر میں پیشگی احتیاط کی ضرورت ہے اسی طرح بروقت اقدام بھی ضروری ہے، بلاوجہ خاموش بنے رہنا خود خلاف احتیاط ہے۔

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، القسم الرابع، الباب الأول في بيان ما هو في حقه صلى الله عليه وسلم سب أو نقص من تعريض أو نص، ج٢ص٢١٥.

بعض اوقات اس پر یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ اہل قبلہ کے تکفیر سے احادیث میں منع فرمایا گیا، چنانچہ سنن ابوداؤد کی روایت ہے:

عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا، وأكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذي له ذمة الله وذمة رسوله، فلا تخفروا الله في ذمته.

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی ہماری جیسی نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرکے نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے جس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا ذمہ حاصل ہے لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ میں بدعہدی نہ کرو۔"[1]

اہل سنت والجماعت کے حضرات متکلمین نے اس حدیث کی روشنی میں متفقہ قاعدہ ذکر فرمایا کہ " لانکفّر احدا من اهل القبلة"۔

امام اعظم ابوحنیفہ، امام طحاوی، امام ابوالحسن اشعری رحمہم اللہ وغیرہ حضرات نے بڑی وضاحت کے ساتھ یہی اصول بیان فرمایا ہیں، اس لئے جب تک کوئی شخص رخ قبلہ نماز پڑھتا رہے اور کلمہ وغیرہ کہتا رہے تو اس وقت تک اس کو کافر کہنا بے احتیاطی ہے۔

لیکن یہ شبہ انتہائی سطحی ہے، محققین کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں، حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے "اکفار الملحدین "میں اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسالہ "ایمان وکفر قرآن وسنت کی روشنی میں "میں اس

---

[1] سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، رقم الحديث: ٢٥٣٢.

کی تفصیلی ذکر بحث فرمائی ہیں جس کو انہی کتابوں میں ملاحظہ کرنا مفید ہے، یہاں ان حضرات اکابر کے تحقیق کے خلاصہ کے طور پر اتنا سمجھ لیناضروری ہے کہ یہاں دو باتیں ہیں، جن کو پوری طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے اس قسم کے اشکالات پیدا ہو جاتے ہیں:

ا۔اہل قبلہ کا مفہوم

۲۔اہل قبلہ کو کافر نہ قرار دینے کی اصل وجہ

اہل قبلہ کا مفہوم

ایک اس لفظ کا لغوی معنی ہے اور دوسرا اس کا اصطلاحی مفہوم۔

لغوی اعتبار سے اس سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں، یا جو خانہ کعبہ کو قبلہ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن یہاں "اہلِ قبلہ" سے یہ ظاہری معنی مراد نہیں کہ جو بھی شخص قبلہ کی طرف منہ کرے وہ اہل قبلہ ہے، بلکہ یہ ایک شرعی اصطلاح ہے جو اہل اسلام کے مرادف ہے۔

حضرات متکلمین اس اصطلاح میں ان ہی لوگوں کو شامل کرتے ہیں جو دین اسلام اور اس کے تمام ضروریات کی تصدیق کرتے ہوں اور اس کی حقانیت کے معترف ہوں، اگر کوئی شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک حکم کا بھی انکار کرے تو متکلمین حضرات اس کو اہلِ قبلہ میں سے شمار نہیں کرتے۔

علامہ فرہاروی کی تشریح

علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ رقم طراز ہے:

معناه اللغوي من يصلي الي الكعبة اويعتقدها قبلة، وفي اصطلاح المتكلمين من يصدق بضروريات الدين اي الامور التي علم ثبوتها في الشرع واشتهر فمن انكر شيئا من الضروريات كحدوث العالم وعلم الله سبحانه بالجزئيات لم يكن من اهل القبلة ولو كان مجاهدا في الطاعات، وكذلك من باشر شيئا من امارات التكذيب كسجود الصنم والاهانة بامر شرعي والاستهزاء عليه فليس من اهل القبلة.

"اہل قبلہ لغوی اعتبار سے وہ لوگ ہیں جو قبلہ کی طرف نماز پڑھے یا اس کو قبلہ خیال کرے، اور متکلمین کی اصطلاح میں یہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو ضروریات دین کی تصدیق کرتے ہیں یعنی ان تمام باتیں جو شریعت میں ثابت (اور لوگوں میں) مشہور ہو، لہٰذا جو کوئی ان ضروریات دین میں سے کسی ایک چیز کا انکار کرے گا مثلاً عالم کے حادث ہونے کا انکار کرے یا اللہ تعالیٰ کے جزئیات جاننے کا انکار کرے تو وہ اہل قبلہ میں سے نہیں اگرچہ عبادات میں محنت بھی کرتا ہو۔"[1]

امام مزنی کی تصریح

امام مزنی رحمہ اللہ تعالیٰ اہل سنت والجماعت کے عقائد ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

الإمساك عن تكفير أهل القبلة والبراءة منهم فيماأحدثوا ما لم يبتدعوا ضلالا فمن ابتدع منهم ضلالا كان عن أهل القبلة خارجا ومن الدين مارقا ويتقرب إلى الله عز وجل بالبراءة منه ويهجر ويحتقر وتجتنب غدته فهي أعدى من غدة الجرب.

---

[1] النبراس، ص۳٤۱.

"اہل قبلہ کی تکفیر سے رکے رہنااور جو گمراہی وہ ایجاد کریں، اسے براءت کرنا (ضروری ہے)ان میں سے جو کوئی بھی گمراہی ایجاد کرے گا وہ اہل قبلہ ہونے سے اور دین اسلام سے نکلے گا ایسی صورت میں اس سے براءت اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے، ایسے آدمی کے ساتھ تعلقات بھی ختم کئے جائیں اور اس کی حقارت کی جائے اور اس سے بالکل پرہیز کیا جائے۔"[1]

علامہ تفتازانی کی وضاحت

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ اس اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ومعناه أن الذين اتفقوا على ما هو من ضروريات الإسلام كحدوث العالم وحشر الأجساد وما أشبه ذلك واختلفوا في أصول سواها كمسألة الصفات --وإلا فلا نزاع في كفر أهل القبلة المواظب طول العمر على الطاعات باعتقاد قدم العالم ونفي الحشر ونفي العلم بالجزئيات ونحو ذلك وكذا بصدور شيء من موجبات الكفر عنه.

"اہل قبلہ سے مقصود وہ لوگ ہیں جو ضروریات اسلام پر متفق ہیں جیسے عالم کا حادث ہونا، اور قیامت وغیرہ۔ ورنہ اگر کوئی اہل قبلہ میں سے پوری عمر عبادات کی پابندی بھی کرے اور اس کے باوجود عالم کے قدیم ہونے، قیامت قائم نہ ہونے یا اللہ تعالیٰ کو جزئیات کا علم نہ ہونے کا عقیدہ رکھے تو اس کے کفر میں کوئی اختلاف نہیں، اسی طرح اگر اور موجب کفر کام کا ارتکاب کرے۔"[2]

---

[1] شرح السنة للمزني (ص: ٨٤).

[2] شرح المقاصد في علم الكلام، المبحث السابع في حكم مخالف الحق من أهل القبلة في باب الكفر والإيمان ،ج٢ص٢٦٩.

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ "اہل قبلہ" سے مراد وہ لوگ نہیں جو قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہی اہل قبلہ کی تکفیر سے ممانعت کا یہ معنی ہے کہ ہر قبلہ رخ ہو کر عبادت کرنے والے کی تکفیر ممنوع ہے بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے جس کا درست مفہوم وہی ہے جو اس اصطلاح کو استعمال کرنے والے حضرات متکلمین کے حوالے سے تحریر کیا جا چکا۔

اہلِ قبلہ کو کافر قرار نہ دینے کی اصل وجہ

دوسری بات جس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات غلط فہمی پیش آتی ہے، وہ اس مسئلہ کی اصل بنیاد ہے یعنی اہل قبلہ کی تکفیر کیوں ممنوع ہے؟

جن احادیث مبارکہ سے متکلمین حضرات میں اس اصطلاح کا فروغ ہوا، وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالی عنہ کی مندرجہ ذیل دو روایات ہیں:

عن أنس بن مالك، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا، وأكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذي له ذمة الله وذمة رسوله، فلا تخفروا الله في ذمته.

"حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو ہماری طرح نماز پڑھے ہمارے قبلہ کی طرف رخ (کر کے نماز پڑھا) کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلمان ہے۔[1]

سنن ابی داؤد میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی سے روایت نقل کی گئی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الصلاة، باب فضل استقبال القبلة، رقم الحديث: ٣٩١.

ثلاث من أصل الإيمان: الكف عمن قال: لا إله إلا الله، ولا نكفره بذنب، ولا نخرجه من الإسلام بعمل، والجهاد ماض منذ بعثني الله إلى أن يقاتل آخر أمتي الدجال لا يبطله جور جائر، ولا عدل عادل، والإيمان بالأقدار"

"تین چیزیں ایمان کی بنیاد میں سے ہے۔ ۱: لا الہ الا اللہ کہنے والے (کو کافر کہنے) سے اپنے آپ کو باز رکھنا، ہم کسی گناہ کی وجہ سے اس کی تکفیر نہیں کرتے نہ ہی کسی بد عملی کی وجہ اس کو دائرہ اسلام سے نکالتے ہیں۔۔۔[1]

انہی دو روایات کی وجہ سے علم کلام میں اس اصطلاح کو رواج ملا، اگر ان دونوں روایات کے مفہوم پر غور کیا جائے تو اس سے یہ نکتہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر کی ممانعت کیوں ہے؟

لفظِ "بذنب" کی قید

اس دوسری روایت میں جہاں مسلمانوں کو یہ ہدایت دی گئی کہ کلمہ طیبہ پڑھنے والے اور توحید و رسالت کا اقرار کرنے والے کو کافر نہ کہا جائے، وہاں ساتھ یہ لفظ بھی ارشاد فرمایا گیا "بذنب" یعنی "لا الہ الا اللہ" پڑھنے والوں کو جو کافر کہنا ممنوع ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ کسی گناہ کی وجہ سے اس کو کافر نہ کہا جائے، اگر کوئی شخص مسلمان ہے اور ایمان و رسالت کی تصدیق کرتا ہے لیکن اس کے باوجود بشری تقاضے کے تحت

[1] سنن أبي داود، كتاب الجهاد، باب في الغزو مع أئمة الجور، رقم الحديث: ٢٥٣٢.

اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو محض اس گناہ کی وجہ سے اس کو کافر کہنے کی اس حدیث میں ممانعت فرمائی گئی اور اس کو اصل ایمان قرار دیا گیا۔

اس روایت میں لفظ "بذنب" کی قید سے ہی یہ اصول معلوم ہوتا ہے کہ ان دو احادیث میں مسلمانوں کی جو نشانیاں بیان کی گئی، اگر کسی شخص میں یہ نشانیاں موجود بھی ہوں مگر اس کے باوجود وہ کسی ایسے عمل کا ارتکاب کرے جس سے یقینی طور پر کفر لازم آتا ہو تو ان روایات کا ایسے شخص کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، شرعی دلائل کی روشنی میں اگر وہ عمل واقعتاً کفر کا موجب ہو اور امت کے ذمہ دار فقہاء کرام اور مفتیان عظام ایسے شخص کی تکفیر کا فیصلہ کریں تو کسی کو اس اصطلاح کی آڑ لے کر اس شوشہ چھوڑنے کا کوئی حق نہیں کہ یہ تو باقاعدہ قبلہ کی طرف نماز پڑھنے کی وجہ سے اہل قبلہ میں داخل ہے جس کو کافر قرار دینا ناجائز ہے۔

فقہاء اور متکلمین کے تصریحات

حضرات متکلمین نے بھی اس بات کی پوری پوری وضاحت کی کہ اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مسئلہ تب ہی کارآمد ہے جب اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے، اگر کسی نے صرف گناہ ہی نہیں بلکہ اپنے اختیار اور رضامندی سے کسی کفریہ قول و عمل کا ارتکاب کیا تو ایسا شخص یقیناً کافر قرار پائے گا۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لا يكفر أحد من أهل القبلة إلا بجحود ما أدخله فيه.

"اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں کہا جاسکتا مگر انہی چیزوں کے انکار کرنے کی وجہ سے جن کی وجہ سے وہ اسلام میں داخل ہوا تھا (یعنی ضروریات دین)"[1]

ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

ان المراد بعدم تكفير احد من اهل القبلة عند اهل السنة انه لايكفر احدما لم يوجد شئي من امارات الكفر وعلاماته ولم يصدر عنه شئي من موجباته.

"اہل سنت کے نزدیک اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جب تک کفر کی کوئی (یقینی) علامت ونشانی نہ پائی جائے اور کوئی موجب کفر اقدام صادر نہ ہو تو اس وقت تکفیر نہ کی جائے۔"[2]

علامہ فرہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ومعنى عدم تكفيراهل القبلة ان لايكفر بارتكاب المعاصي ولا بانكار الامور الخفية غير المشهورة، هذا ماحققه المحققون فاحفظه

"اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں کے ارتکاب یا غیر مشہور دقیق باتوں کے انکار کرنے کی وجہ سے کسی (کلمہ گو) کی تکفیر نہ کی جائے، محققین کی یہی تحقیق ہے۔"[3]

---

[1] الأشباه والنظائر لابن نجيم، كتاب السير،باب الردة (ص: ١٥٩).

[2] شرح الفقه الاكبر لملا علي القاري،ص٢٥٨. قديمي كتب خانه، كراچي.

[3] النبراس شرح شرح العقائد،ص٥٤٩.

بروقت تکفیر کرنا اہل علم کی ذمہ داری ہے

حنبلی متکلم علامہ حسن بن علی بربہاری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی یہی مسئلہ لکھا کہ عام حالات میں اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں، لیکن اگر رسمی طور پر اہل قبلہ ہونے کے باوجود کوئی شخص کسی ایسے قول و عمل کا ارتکاب کرے جو موجب کفر ہو تو اس صورت میں اس کی تکفیر صرف جائز ہی نہیں بلکہ اہل علم کی ذمہ داری اور ان کا فرض منصبی ہے کہ اس کو کافر قرار دے۔

چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

لا نخرج أحدا من أهل القبلة من الإسلام حتى يرد آية من كتاب الله، أو يرد شيئا من آثار رسول الله صلى الله عليه وسلم، أو يذبح لغير الله، أو يصلي لغير الله، فإذا فعل شيئا من ذلك فقد وجب عليك أن تخرجه من الإسلام، وإذا لم يفعل شيئا من ذلك فهو مؤمن مسلم بالاسم لا بالحقيقة.

"ہم اہل قبلہ میں کسی شخص کو دائرہ اسلام سے نہیں نکالتے، الّا یہ کہ قرآن کریم کی کوئی آیت یا حضور ﷺ (سے ثابت شدہ) کسی حدیث کو رد کر دے یا غیر اللہ کے نام ذبح کرے، غیر اللہ کے لئے نماز پڑھے، اگر ایسا کوئی کام کرے تو اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینا ضروری ہے اور اگر ایسا کوئی اقدام نہ کرے تو وہ مسلمان ہے۔[1]

امام ابن دقیق العید کی تصریح

امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عام حالات میں تو اہل قبلہ کی تکفیر جائز

---

[1] شرح السنة للبربهاري (ص: ٦٤).

نہیں ہے لیکن اگر کوئی شخص اس وصف کے باوجود دین اسلام کے کسی قطعی اور یقینی حکم کا انکار کر بیٹھے تو اس صورت میں چونکہ وہ شریعت کی تکذیب کر رہا ہے اس لئے کافر ہو جائے گا۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

الحق أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة، إلا بإنكار متواتر من الشريعة عن صاحبها، فإنه حينئذ يكون مكذبا للشرع.

"حق بات یہ ہے کہ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کی جائے مگر ایسے حکم کے انکار کی وجہ سے جو تواتر کے ساتھ صاحب شریعت ﷺ سے ثابت ہو کیونکہ اس جیسے حکم کے انکار کی وجہ سے وہ مکذب ہوا۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ تعالیٰ بھی ذکر فرماتے ہیں کہ اہل قبلہ میں سے اگر کسی شخص کے متعلق کفر کی کوئی مستقل دلیل ملے (اور وہ تسلی بخش بھی ہو) تو اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی۔

المسألة العشرون المختار عندنا أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة إلا بدليل منفصل ويدل عليه النص والمعقول

"ہمارے نزدیک راجح یہ ہے کہ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کی جائے مگر کسی مستقل دلیل کی بنیاد پر، عقل و نقل سے یہ بات ثابت ہے"[2]

---

[1] إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام، كتاب اللعان، من وصف غيره بالكفر ج٢ص٢١٠.

[2] معالم أصول الدين (ص: ١٣٧).

خلاصہ کلام

ان تمام عبارات کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق کوئی مستقل اور یقینی دلیل کفر کی مل جائے تو اس کے مطابق حکم جاری ہو جائے گا، صرف اہلِ قبلہ ہونے کی وجہ سے تکفیر کا دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا۔

حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ الفاظِ کفر کی فقہی حیثیت

ہمارے فقہی ذخیرہ کتب کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ "کتاب السیر" میں ارتداد کے متعلق ایک باب باندھتے ہیں جس میں اس موضوع سے متعلق مختلف مسائل ذکر ہوتے ہیں، دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ ان ابواب کا اکثر حصہ کلمات الکفر اور الفاظ الکفر پر مشتمل ہوتا ہے جس میں عربی اور فارسی زبان کے مختلف الفاظ ہوتے ہیں اور اس کا حکم ذکر کیا جاتا ہے کہ آیا یہ لفظ بولنا موجب کفر ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص ان کلمات میں سے کسی کلمہ کا تلفظ کرے تو اس کی وجہ سے اس کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

ہمارے فقہ حنفی کے مصادر میں ان الفاظ کو کافی توجہ دی جاتی ہے اور تقریباً ہر کتاب میں اس قسم کے بیسیوں الفاظ اور ان کا حکم مذکور ہوتا ہے بلکہ بعض مفصل کتابوں میں تو ان جیسے الفاظ کی تعداد بہت ہی بڑھ جاتی ہے، اگر ایک فتاوٰی ہندیہ میں ذکر کردہ الفاظ کو ٹھیک ٹھیک شمار کیا جائے تو شاید تین چار سو سے یہ تعداد کسی طرح کم نہ ہو۔

پہلا موقف

ان الفاظ کے حوالے سے لوگوں کے مختلف نقطہ نظر ہیں۔

بعض حضرات اس کو بالکل قطعی تصور کرتے ہیں اور اس تصور کے نتیجہ میں اگر کسی شخص سے کوئی ایسا کلمہ صادر ہو جائے جس کے موجب کفر ہونے اور نہ ہونے کا

سوال زیر غور ہو تو یہ حضرات علم کلام اور فقہ کے اصول و قواعد کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتے بلکہ ان ہی کلمات الکفر میں اس جملہ کے نظائر تلاش کرتے ہیں اور جو قریب تر نظیر ملے، اس کے مطابق حکم بیان کرتے ہیں۔

گویا ان حضرات کے نزدیک جس طرح طلاق کے کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے فقہاء کرام کے ذکر کردہ کلمات میں سے اس جیسی نظیر تلاش کرنی ضروری ہے اسی طرح کفریہ کلمات کے حکم جاننے کے لئے بھی کلمات الکفر میں سے کوئی نظیر ڈھونڈنا کافی ہے۔

دوسرا موقف

اس کے بالکل برعکس بعض حضرات کا موقف یہ ہے کہ فقہی کتابوں کا یہ باب سرے سے قابل توجہ ہے ہی نہیں، یہ حضرات فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ ان تحقیقات کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور جب کبھی ان کلمات کے متعلق سوال اٹھتا ہے تو اس موقف کے حامل حضرات کی طرف سے فقہاء کرام کے اس ذکر کردہ تفصیلات کے متعلق یہ معذرت پیش کی جاتی ہے کہ ان الفاظ سے کوئی حقیقتاً کافر نہیں ہوتا، فقہاء کرام نے اس باب میں جو احکام ذکر کئے وہ تغلیظ پر محمول ہے۔

علامہ بزازی رحمہ اللہ کا موقف

مشہور حنفی فقیہ علامہ بزازی رحمہ اللہ نے اس دوسرے موقف کی سختی کے ساتھ تردید فرمائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ تغلیظ یا تشدید پر ہرگز محمول نہیں بلکہ مجتہد نے جس کلمہ کو بھی موجبِ کفر کہا، اس سے حقیقتاً کافر ہونا اور دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہی مراد ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

یحکی عن بعض من لاسلف له انه کان یقول: ماذکر في الفتاوی انه یکفر بکذا وکذا فذلك للتخویف والتهویل لا لحقیقة الکفر، وهذا کلام باطل وحاشا ان یلعب امناء الله اعني علماء الاحکام بالحلال والحرام والکفر والاسلام بل لایقولون الا الحق الثابت عن سید الانام علیه الصلاة والسلام وما ادي اجتهاد الامام اخذا من نص القران-وما حررته هو مختار مشائخ الشافین لداء العقام -وکل من اتي بعدهم من علماء الدهر والایام مابقي دین الاسلام.

"بعض لوگوں سے منقول ہے جن کے پاس (اپنی اس بات کی تائید میں) کوئی سلف نہیں، کہ کتب فتاویٰ میں جو کلمات کفر ذکر کئے جاتے ہیں وہ ڈرانے دھمکانے کے لئے ہوتے ہیں حقیقتاً کفر کے لئے نہیں ہوتے، یہ بات بالکل غلط ہے علماء کے حق میں بالکل بعید ہے کہ وہ حلال و حرام اور کفر واسلام کے الفاظ کو کھیل کا ذریعہ بنائیں، وہ تو حق بات ہی کرتے ہیں جو حضور ﷺ سے ثابت ہو یا امام نے اپنے اجتہاد کے ساتھ قرآن کریم سے اخذ کیا ہو، میں نے یہ جو کچھ ذکر کیا یہ تمام مشائخ اور ہر زمانے کے تمام علماء کا پسندیدہ قول ہے۔"[1]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ مجتہد نے جس کلمہ کے بارے میں یہ کہا کہ یہ کفریہ کلمہ ہے تو اس سے حقیقی معنی میں کفر ہی مقصود ہوتا ہے۔

لیکن کلمات الکفر کے مطالعے کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان تمام کلمات کے احکام مجتہدین سے ثابت نہیں بلکہ ان الفاظ میں ایک بڑی تعداد ان الفاظ کی بھی

---

[1] الفتاوي البزازیة علي هامش الهندیة، فصل في المتفرقات، قبیل کتاب الکراهیة، ج٦ص٣٥٠.

ہے جس میں غیر مجتہدین نے کفر کا فیصلہ فرمایا، نیز ان تمام الفاظ الکفر پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہوں میں ایک لفظ کو صرف اس لئے کفر کہا گیا کہ اس میں کفریہ معانی کے احتمالات موجود تھے، لیکن ظاہر ہے کہ صرف کسی کفریہ احتمال کی وجہ سے کسی مسلمان شخص کو کافر قرار دینا اصول کے خلاف ہے۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کا فیصلہ

شاید انہی وجوہات کی بناء پر علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے بڑی وضاحت کے ساتھ اپنا یہ فیصلہ بیان کیا کہ میں ان الفاظ کی بنیاد پر کسی کے کفر کا فتویٰ نہیں دیتا، آپ نے اولاً فقہاء کرام کے عام معمول کے مطابق بہت سے کلمات کفر بیان فرمائے، ان کے شرعی حکم کی مکمل تفصیل ذکر فرمائی، ان تمام تفصیلات سے فارغ ہونے کے بعد بالکل آخر میں تکفیر کے متعلق احتیاط برتنے کے لئے چند اقوال نقل کئے۔

اس کے بعد فرمایا:

فعلى هذا فأكثر ألفاظ التكفير المذكورة لا يفتى بالتكفير بها ولقد ألزمت نفسي أن لا أفتي بشيء منها.

"فقہاء کرام کے ذکر کردہ الفاظ کفر ایسے ہیں کہ ان میں سے اکثر کی بنیاد پر فتویٰ نہیں دیا جاتا، میں نے اپنے اوپر لازم کیا ہے کہ ان میں کسی لفظ کے بنیاد پر فتویٰ نہ دوں۔"[1]

---

[1] البحر الرائق مع منحة الخالق ،كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ج٥ص ١٣٥.

اسی طرح بہت سے مقامات پر لزوم کفر کی وجہ سے بھی کفر کا اطلاق کیا گیا حالانکہ جمہور کے نزدیک لزومِ کفر اور التزامِ کفر میں فرق ہے اور محض لزوم کفر کی وجہ سے کسی کی تکفیر درست نہیں۔

اعتدال پسندانہ موقف

اس لئے زیادہ معتدل اور درست موقف وہی ہے جو محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا کہ ان کلمات کی دو قسمیں ہیں:

الف: وہ کلمات جن کا حکم صراحۃً مجتہدین سے ثابت ہے، اس میں تو کفر کا حکم بیان کیا جائے۔

ب: جن کلمات کا حکم صراحۃً حضرات مجتہدین سے ثابت نہیں، اس میں احتیاط کرنی ضروری ہے۔

علامہ فرماتے ہیں:

نعم يقع في كلام أهل المذاهب تكفير كثير ولكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون بل من غيرهم، ولا عبرة بغير الفقهاء، والمنقول عن المجتهدين ما ذكرنا.

"اہل مذہب کے کلام میں بہت تکفیر موجود ہیں، لیکن یہ مجتہد فقہاء کرام کا قول نہیں ہے جبکہ دوسروں کا اعتبار نہیں ہے اور مجتہدین کا وہی مسلک ہے جو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔"[1]

---

[1] فتح القدير ، كتاب السير، باب البغاة، ج٦ص١٠٠.

لیکن واضح رہے کہ احتیاط کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ جن کلمات کا حکم مجتہدین سے ثابت نہیں ، اس کو کفر قرار دینا جرم ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان جیسے کلمات کے بارے میں فوراً فیصلہ نہ کیا جائے بلکہ اصول و قواعد کی روشنی میں اس پر غور وخوض کیا جائے،اگر کہیں اصول کے تحت تکفیر سے کوئی مانع موجود ہو تو بلاوجہ کسی کو کافر قرار دینے سے احتیاط کی جائے اور اگر کسی کا کفر بالکل یقینی ہو تو اس کے کفر کا فیصلہ کیا جائے۔

باب سوم

تکفیر کا رکن اور اس کی شرائط

جس شخص کی تکفیر کی جا رہی ہے، اس کے اعتبار سے شرائط

کفریہ قول و عمل کے اعتبار سے شرائط

تکفیر مطلق اور معین میں فرق اور اس کی وضاحت

موانع تکفیر اور اس کی مکمل وضاحت

تاویل کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق

تاویل کے معتبر ہونے کی شرائط اور اس کا شرعی حکم

باب سوم

پچھلے باب میں کفر کی تعریف وتوضیح اور اس کے متعلق چند ضروری مباحث ذکر کئے گئے، اب اس باب میں تکفیر کا رکن، اس کا شرعی حکم، شرائط اور اس کے متعلق چند آداب ذکر کئے جائیں گے، پھر شرائط کی مختلف نوعیتیں ہیں، ایک قسم ان شرائط کی ہے جس کا مکفِّر میں موجود رہنا ضروری ہے، اس سے مراد وہ شخص ہے جو کسی کے کافر ہونے کا فتویٰ یا فیصلہ جاری کرتا ہے، دوسری قسم وہ شرائط ہیں جس کا مکفَّر میں پایا جانا ضروری ہے یعنی جس شخص کو کافر قرار دیا جارہا ہے، اور تیسری قسم شرائط کا تعلق خود اسی قول وعمل کے ساتھ ہے جس کے بنیاد پر کسی کو کافر کہا جارہا ہوتا ہے۔

کفر کا حکم

چونکہ کفر و تکفیر دو الگ الگ امور ہیں اس لئے دونوں کا حکم بھی جدا جدا ہے، کفر کا حکم تو واضح ہے کہ یہ کبیرہ گناہوں میں سے سر فہرست وہ عظیم جرم ہے جس کے اوپر اور کوئی گناہ نہیں، اس کا انجام جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہے، اس لئے دین ودنیا اور آخرت کی حفاظت کے لئے اس جرم کے قریب پھٹکنے سے بھی گریز کرتے رہنا لازم ہے۔

تکفیر کا حکم

دنیا اور آخرت سے متعلق شریعت کے احکام میں سے بیسیوں احکام ایسے ہیں جن میں مسلمان اور کافر کے درمیان فرق رکھا گیا ہے، یہ احکام مختلف نوعیتوں کے ہیں بعض فرض وواجب کے درجہ میں ہیں اور بعض سنت و مستحب ہیں، ان تمام احکام میں

فرق کا اصل دار و مدار ایمان و کفر ہی ہے ، اگر کوئی شخص ایمان کا حامل ہے تو اس کے متعلق شریعت کا حکم اور ہے اور اگر کوئی اس نعمت سے محروم اور کافر ہے تو اس کے متعلق حکم کچھ اور ہے، شریعت مطہرہ میں جن احکام پر عمل کرنے کو فرض یا واجب قرار دیا ہے، جس طرح اس پر عمل کرنا مکلف کی ذمہ داری ہے اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ جن مقدمات پر یہ فرض موقوف ہے ان کو بھی عمل میں لایا جائے کیونکہ واجب کا مقدمہ واجب اور حرام کا مقدمہ حرام ہوتا ہے۔

لہٰذا ایمان و کفر پر مبنی ان احکام پر عمل کرنے کے لئے پہلے اسی بات کا فیصلہ کرنا لازم ہے اس سے معلوم ہوا کہ تکفیر بھی دیگر فرائض کی طرح ایک فرض کفایہ ہے، اگر خدانخواستہ کوئی شخص حقیقت میں کافر ہو جائے اور تکفیر کے تمام تر شرائط موجود ہوں تو پوری امت کا اس سے تغافل برتنا درست نہیں، بلکہ یہ علماء امت کا فرض منصبی ہے۔

تکفیر کا فیصلہ کون کرے؟

قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے بیسیوں نصوص میں اہل علم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ دین کے احکام و مسائل کی تبلیغ کیا کریں اور شریعت کے حدود و قیود کی حفاظت کریں، کبھی صاف الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا گیا، کبھی اہل کتاب کے علماء کے کرتوت اور اس کے انجام بد ذکر کر کے اس جانب تنبیہ کی گئی، کہیں کتمان علم پر سخت وعیدیں سنائی گئی تو کہیں دین کی نشر و اشاعت کے خوب خوب فضائل بتائے گئے، الغرض مختلف اسالیب کے ساتھ علماء کے سر یہ ذمہ داری عائد کی گئی کہ وہ دینی احکام کی تبلیغ و تبیین کریں اور دین اسلام کے حدود و قیود کی حفاظت کریں تا کہ قیامت تک آنے والے تمام نسل انسانی کو دین اپنی اصلی صورت میں چمکتا دمکتا برقرار رہے۔

ایمان واسلام اور کفر وانکار بھی شریعت اسلامیہ کے دائرہ کار سے خارج نہیں ہے بلکہ یہی تو بنیادی امور ہیں اور کسی کے کفر یا اسلام کا فیصلہ بھی شریعت کے احکام کے ذیل میں داخل ہیں اس لئے جہاں عام مسائل میں حلال وحرام اور جائز وناجائز بیان کرنا اہل علم کے ذمہ لازم ہے، بالکل اسی طرح شریعت کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی رعایت رکھتے ہوئے کسی کی تکفیر کرنا بھی ان کا فرض منصبی ہے بلکہ بعض پہلو کے اعتبار سے دیگر احکام کی بنسبت اس ذمہ داری کی اہمیت اور ضرورت کہیں زیادہ ہے، اگر ضرورت کے باوجود اہل علم اس ذمہ داری کو نبھانے میں سستی یا غفلت سے کام لیں تو خطرہ ہے کہ عنداللہ یہ خطرناک جرم شمار ہوگا۔

علامہ آجُرّی رحمہ اللہ ایک روایت نقل کرتے ہے کہ:

عن معاذ بن جبل قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا حدث في أمتي البدع وشتم أصحابي فليظهر العالم علمه فمن لم يفعل ذلك منهم فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين.[1]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب میری امت میں بدعات پیدا ہو جائے اور میرے صحابہ کو گالم گلوچ دیا جانے لگے تو عالم کو چاہئے کہ اپنے علم کا اظہار کرے جس نے (اس وقت میں بھی) ایسا نہیں کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ، اس کی فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو۔"

البتہ جہاں اس کی اہمیت زیادہ ہے وہاں اس مسئلہ کی نزاکت بھی کچھ کم نہیں، اس لئے تکفیر کے فیصلہ کرنے سے پہلے ان تمام امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو شریعت

---

[1] الشريعة للآجري ،باب عقوبة الإمام والأمير لأهل الأهواء، رقم الحديث: ٢٠٧٥،ج٥ ص ٢٥٦٢.

نے اس کے لئے مقرر فرمائے ہے ورنہ تو اس باب میں معمولی غلطی اور بے احتیاطی بھی نہایت سنگینی اختیار کر سکتا ہے، لہٰذا اس باب میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ارتداد و کفر کا رکن

جو شخص ایک بار دائرہ اسلام میں داخل ہوا اور اس کے بعد وہ کفر کو اختیار کرے تو اس کو مرتد اور اس جرم کو ارتداد کہا جاتا ہے، مرتد کہنا تو چونکہ کافر قرار دینا ہے جس سے عام حالات میں شریعتِ مطہرہ میں منع فرمایا ہے جیسا کہ باب دوم میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا اس لئے کسی شخص کو تبھی مرتد کہا جا سکتا ہے جب اس میں ارتداد کے تمام شرائط پوری ہو جائیں جس کے بعد وہ بالکل مسلمان نہ رہے بلکہ کفر کے حدود میں داخل ہو جائے۔

ارتداد دین حق کو قبول کرنے کے بعد اس سے پھرنے کا نام ہے اور چونکہ جمہور کے نزدیک ایمان تصدیق بالقلب کا نام ہے اس لئے ارتداد اسی تصدیق بالقلب سے اعراض کرنے کو کہا جاتا ہے، یعنی ایمان متحقق ہونے کے لئے جن امور کی تصدیق ضروری ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کی تکذیب کرنا یا پوری شریعت کے انکار کرنے کی جسارت کرنا ارتداد اور کفر ہے، بسا اوقات ایک شخص صراحت کے ساتھ تو اس طرح انکار نہیں کرتا لیکن کوئی ایسا اقدام کرتا ہے جو اس انکار کی واضح اور صریح عکاسی کرے، ایسا اقدام بھی موجب کفر ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ کفر کا رکن مندرجہ بالا امور کی تصدیق نہ کرنا ہے اور ارتداد کی اصل جڑ اور رکن ان امور کی تصدیق کے بعد تکذیب و انکار ہے جو یا تو اس شخص کی صراحت سے معلوم ہو جائے اور یا کوئی ایسا اقدام کر بیٹھے جس سے پوری وضاحت اور

مکمل قطعیت کے ساتھ اس کا انکار معلوم ہو جائے اور اس میں مزید کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

شرائط

تکفیر متحقق ہونے کے لئے تین چیزیں ضروری ہوتی ہیں، مکفِّر یعنی کسی کے کافر ہونے کا فیصلہ کرنے والا۔ مکفَّر جس شخص کے کافر ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ تیسری چیز وہ اقدام ہے جس کو بنیاد بنا کر کسی کو کافر کہا جاتا ہے، تکفیر کے لئے جن شرائط کا پایا جانا ضروری ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق اس پہلی جانب کے ساتھ ہے جبکہ بعض کا تعلق باقی دو امور کے ساتھ ہے، یہاں آسانی کے لئے اس کو ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

مکفِّر کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

کسی مسلمان کو کافر قرار دینا صرف ایک زبانی بات ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دنیاوآخرت کے بیسیوں مسائل کا تعلق ہے،ایسے مسائل کی ایک فہرست ہے جس میں مسلمان اور کافر کے درمیان فرق ہے لہٰذا کافر قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے شخص کا حکم ان تمام مسائل میں مسلمانوں کے بر خلاف ہے اوراس پر کفار کے احکام جاری ہوں گے، اس لئے کسی کے کافر ہونے کا فیصلہ کرنا درحقیقت افتاء ہی کا ایک نہایت نازک اور حساس مرحلہ ہے جس میں معمولی سے غلطی اور جذباتیت کی وجہ سے وہ تمام احکام بے جاثابت ہوں گے جو اس فیصلہ کے بعد مرتب ہوں گے۔

چونکہ تکفیر بھی افتاء ہی کا ایک حصہ ہے اس لئے اس میں تکفیر کے فیصلہ کرنے والے میں ان تمام شرائط کا پایاجاناضروری ہے جو حضرات فقہاء کرام نے مفتی کے لئے ضروری قرار دئے ہیں، یہاں اختصار کے ساتھ ان کو ذکر کیا جاتا ہے۔

مکلف ہونا

جو شخص کسی کے کفر کا فیصلہ کر رہا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ خود مکلف ہو، یعنی عاقل، بالغ اور مسلمان ہو، بے وقوف اور نابالغ شخص کی بات کا یہاں کوئی اعتبار نہیں،اسی طرح غیر مسلم شخص خواہ کتنا ہی ماہر ہو لیکن تکفیر کے باب میں اس کے فیصلہ کی کوئی قیمت نہیں، محض اس کے فیصلہ کی وجہ سے کسی مسلمان کو کافر قرار دینا درست نہیں۔

عدالت

بہت سے ائمہ کرام کے نزدیک مفتی کے لئے یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ وہ عادل ہو، لہٰذا ان کے نزدیک فاسق شخص کے فتویٰ کی کوئی حیثیت نہیں، ہمارے بعض فقہاء احناف کے نزدیک مفتی کے لئے عادل ہونا تو نہایت مناسب بلکہ منصب افتاء میں کمال پیدا کرنے کے لئے اس صفت کو اپنانا ضروری ہے تاہم فی نفسہ مفتی ہونے کے لئے یہ کوئی شرط لازم نہیں بلکہ اگر فاسق شخص بھی اصول افتاء کے مطابق کوئی فتویٰ دے تو اس کا بھی اعتبار ہوگا۔

یہ تو ایک اصولی اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی "مفتی" تکفیر کے باب میں بھی فسق کا مظاہرہ کرے تو اس کا یہ فیصلہ بالکل ناقابل قبول ہے، بلکہ علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ وغیرہ اصولیین نے لکھا ہے کہ ایسے فاسق شخص سے استفتاء بھی جائز نہیں، خصوصاً کفر واسلام جیسے نازک مسائل میں۔

تیقظ

بہت سے حضرات نے منصب افتاء کے لئے یہ شرط بھی ذکر فرمائی ہے کہ وہ متیقظ اور بیدار مغز ہے، غلطی وغفلت جس شخص کی عادت ہو وہ اس منصب کا اہل نہیں، موجودہ حالات کے لحاظ سے اس شرط کا لحاظ رکھنا کافی مفید اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

> "بعض حضرات نے مفتی کے لئے تیقظ کی شرط بھی ذکر کی ہے۔۔ میں کہتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں یہ شرط لازم ہے کیونکہ لوگوں کی عادت یہ ہے کہ جس کو بھی فتویٰ دیا جاتا ہے وہ اپنے خصم پر چڑھائی کرنا شروع کرتا ہے اور صرف اس دلیل پر

اس کو مجبور کرتا ہے کہ مجھے مفتی نے فتویٰ دیا ہے کہ میں حق پر ہوں، مخاطب (اس کی بات سے مجبور ہو کر بات مان لیتا ہے حالانکہ) اس کو اس بات کا کوئی پتہ نہیں کہ فتویٰ میں لکھا کیا ہے، لہٰذا مفتی کا ایسا متیقظ ہونا ضروری ہے جو لوگوں کے حیلہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں سے واقف ہو۔۔۔"[1]

زمانہ کے عرف سے واقفیت

تکفیر کے بہت سے امور کا تعلق لوگوں کے عرف وعادت کے ساتھ بھی ہے، خصوصاً یہ بحث کہ کونسے کلمات کفریہ ہیں جن کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جا سکتا ہے اور کونسے ایسے کلمات ہیں جن کے بنیاد پر یہ فیصلہ کرنا درست نہیں، اس کا بڑی حد تک دار مدار ماحول ومعاشرے کے ساتھ ہے، حضرات فقہاء کرام خصوصاً فقہاء احناف نے ان جیسے کلمات کی ایک طویل فہرست مرتب فرمائی ہے لیکن اس میں بھی بہت سے الفاظ کے موجب کفر ہونے کا دار مدار لوگوں کے استعمال اور ان کے عرف وعادت پر ہی ہے، اس لئے مفتی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ماحول و معاشرہ، زمانے، لوگوں کے عرف وعادت اور ان جیسے کلمات کے محل استعمال سے پوری طرح واقف ہو، ان امور سے ناواقفیت کی وجہ سے کئی ایسی خامیاں پیدا ہو سکتی ہیں جس کے بعد اصل حکم شرعی تک رسائی یقینی نہیں رہ پاتی۔

---

[1] حاشیة ابن عابدين على الدر المختار، كتاب القضاء، ج٥ص٣٥٩.

زمانہ کے عرف وعادت سے واقفیت کی اہمیت ایک مثال کی روشنی میں

عبادت اور نماز وغیرہ دین اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہیں، اس کا استہزاء اور توہین کرنا یا اس کو گالی دینا کفر ہے لیکن ہر زبان میں بعض الفاظ کئی احتمالات کے حامل ہوتے ہیں جس کی وجہ سے کفر کا فیصلہ کرنا بالکل خلاف احتیاط بن جاتا ہے لیکن اگر مفتی کو ان الفاظ کا محل استعمال سے واقفیت نہ ہو تو وہ تکفیر ہی کا ارتکاب کرے گا۔

فتاویٰ حقانیہ میں اسی قسم کا ایک دلچسپ سوال وجواب موجود ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ :

> سوال: ایک دیندار شخص مسجد میں اللہ کی عبادت کر کے فارغ ہو کر جب گھر آیا تو کسی بات پر بیوی سے جھگڑا ہو گیا، تو غصے کی حالت میں اس کی زبان سے پشتو کے یہ الفاظ نکل گئے "چہ مونگہ۔۔"مسجد میں عبادت کر کے جب گھر آتا ہوں تو سب کچھ تم چو دیتی ہو" تو کیا اس شخص کا یہ کہنا کلمہ کفر تو نہیں؟ اور اس سے یہ آدمی کافر بن جائے گا یا نہیں؟
>
> جواب: اگرچہ ظاہری لحاظ سے مذکورہ الفاظ درست نہیں ہیں مگر پشتو زبان کے محاورہ میں کسی چیز کو برباد کرنے اور اس کو لغو کرنے کے معنی میں مستعمل ہوتے ہیں لیکن ان سے کسی چیز کی تحقیر وتوہین مقصود نہیں ہوتی۔۔۔ لہٰذا صورت مسئولہ میں یہ دیندار شخص مسلمان ہے اس پر کفر کا کوئی شک وشبہ نہ کیا جائے۔" (فتاویٰ حقانیہ، کتاب العقائد، ج ۱ ص ۱۷۲)۔

مکفَّر کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

یہاں تک توان شرائط کا ذکر تھا جس کا مکفِّر میں موجود ہونا ضروری تھا، اب ان شرائط کو ذکر کیا جاتا ہے جن کا تعلق اس شخص کے ساتھ ہے جس کو کافر قرار دیا جارہا ہے۔

اس قسم کی شرائط کل تین ہیں جس کی ضروری تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

پہلی شرط: عاقل ہونا

جس شخص کے مرتد ہونے کا فیصلہ کیا جارہا ہے، ضروری ہے کہ وہ عاقل بھی ہو یعنی جس وقت اس سے کفریہ قول و عمل صادر ہوا اس وقت اس کا عاقل ہونا ضروری ہے، لہٰذا اگر کسی دیوانہ اور پاگل آدمی نے کوئی کفریہ کلمہ بکا تو اس کو مرتد نہیں کہا جائے گا اور اس پر ارتداد کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

اگر کوئی شخص بے ہوش ہے یا نشہ میں مست وہ شخص جس کے عقل و حواس بالکل ٹھکانے نہ ہوں، اس سے اگر اس قسم کی کوئی بے ہودہ حرکت سرزد ہو جائے تو بھی اس کو کافر یا مرتد نہیں کہا جائے گا کیونکہ جس وقت یہ کفریہ عمل کر رہا ہے اس وقت عقل موجود ہی نہیں۔

دوسری شرط: بالغ ہونا

یہ بھی ضروری ہے کہ کفریہ کام کرنے والا بالغ بھی ہو، اگر بلوغ کے بعد کوئی کفریہ عمل سرزد ہو جائے تب ہی اس کو کافر کہا جائے گا، بلوغ سے پہلے اس طرح حرکات کرنے کی وجہ سے اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

بلوغ کے شرط ہونے کے متعلق فقہاء کرام کے مختلف مذاہب کا خلاصہ

اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس باب میں حضرات ائمہ کرام کے کل تین مذاہب ہیں:

الف: بلوغ ایمان و کفر دونوں کے لئے ضروری ہے، یعنی نابالغ شخص اگر ایمان لائے یا کوئی کفریہ کام کرے تو دونوں صورتوں میں اس کے ایمان و کفر کا کوئی اعتبار نہیں بلکہ اپنی اصلی حالت پر رہے گا، اگر پہلے وہ مسلمان سمجھا جارہا تھا تو اب بھی مسلمان ہی شمار ہوگا اور اگر پہلے کی صورتِ حال اس کے خلاف تھی تو اب بھی وہی حکم برقرار رہے گا۔

ب: ایمان و کفر دونوں کے لئے بالغ ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ عقل و تمیز ہی کافی ہے، اگر کوئی نابالغ بچہ سن تمیز کو پہنچ جائے اور وہ عقل و شعور بھی رکھتا ہو تو اس عمر میں اگر وہ ایمان لائے یا خدانخواستہ کوئی کفریہ موقف اختیار کرے تو دونوں صورتوں میں اس پر ایمان و کفر کے احکام جاری ہوں گے، پہلی صورت میں اس کو باقاعدہ مسلمان اور دوسری صورت میں کافر کہا جائے گا، صرف نابالغ ہونے کی وجہ سے اس کی اس حرکت کو غیر معتبر نہیں کہا جائے گا۔

ج: ایمان کے لئے تو بالغ ہونا کوئی ضروری نہیں لیکن کفر کے لئے یہ شرط ہے، لہٰذا نابالغ شخص کو اس کے ایمان لانے کی وجہ سے مسلمان تو کہا جاسکتا ہے لیکن اس کی کسی حرکت کی وجہ سے اس کو مرتد نہیں کہا جاسکتا۔

پہلا موقف حضرت امام شافعی اور امام زفر رحمہما اللہ تعالیٰ کا ہے، دوسرا موقف حضرت امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا ہے جبکہ تیسرا مسلک حضرت

امام ابویوسف رحمہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔[1]

تیسری شرط: اختیار و رضامندی

کفر وارتداد کے لئے یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ حالت اختیار ہی میں یہ قول و فعل صادر ہو جائے، اگر کسی شخص کو کسی کفریہ عمل کرنے پر مجبور کیا گیا اور اس کے پاس اس کام کو کرنے کے سوا بچنے کی کوئی اور تدبیر میسر نہ ہو اور مجبوری کی حالت میں وہ کفریہ کام کرے تو اس صورت میں اگر دل مطمئن ہے اور اس کام کرنے پر دلی رضا مندی بالکل نہیں تھی تو اس کو کافر نہیں کہیں گے۔

حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں کئی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا، امام طبری رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ روایت نقل کی ہے کہ مشرکین نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پکڑ کر سخت اذیتیں پہنچائی اور اس بات پر مجبور کیا کہ حضور ﷺ کی برحق رسالت کا انکار کر بیٹھے، انہوں نے زبان سے اس طرح کوئی کلمہ کہا لیکن چونکہ دل میں راسخ ایمان اور مضبوط اعتقاد موجود تھا اس لئے حضور ﷺ کے دربار عالیہ میں اسی پریشانی کی شکایت

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: المغنی لابن قدامۃ، کتاب المرتد ج۹ ص ۱۳، بدائع الصنائع، کتاب السیر، باب احکام المرتدین، ج۶ ص ۱۱۷، المکتبۃ الحقانیۃ بشاور، التشریع الجنائی الاسلامی مقارنا بالقانون الوضعی، الکتاب السادس: الردۃ ج ۲ ص ۵۸۷.

لے کر آئے،اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

{مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ وَلَكِنْ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللَّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ}

"جو شخص ایمان لائے پیچھے اللہ کے ساتھ کفر کرے مگر جس شخص پر زبردستی کی جاوے بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو لیکن ہاں جو جی کھول کر کفر کرے تو ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا اور ان کو بڑی سزا ہوگی۔"[1]

حضور ﷺ نے حضرت عمار سے پوچھا کہ "كيف تجد قلبك؟" حضرت عمار نے جواب دیا کہ "مطمئنا بالإيمان" حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: فإن عادوا فعد".[2]

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کو کسی کفریہ کلمہ کہنے پر مجبور کیا جائے اور وہ بادل نخواستہ وہ کلمہ کہہ گزرے تو محض اس کہنے سے وہ کافر نہیں ہوگا، لیکن اس صورت میں بھی ان تین باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے جو موانع کے ذیل میں مذکور ہوں گی۔

غلطی سے کوئی کفریہ کلمہ کہنے کا حکم

اسی طرح اگر کوئی شخص کلمہ کفر کہے لیکن رضامندی سے نہ ہو بلکہ غلطی سے کہے مثلاً کوئی جائز بات کہنے کا ارادہ تھا لیکن غلطی کی وجہ سے زبان سے کفریہ بات نکلی

---

[1] [النحل: ١٠٦]

[2] جامع البيان ت شاكر ،تفسير سورة النحل، رقم الاية: ١٠٦،ج١٧ص ٣٠٤.

توچونکہ یہ کفریہ بات اس نے اپنی رضامندی سے نہیں کہی، اس لئے اس کی وجہ سے وہ کافر بھی نہیں ہوگا۔

علامہ قاضی خان رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

أما الخاطئ إذا جرى على لسانه كلمة الكفر خطأ بأن كان أراد أن يتكلم بما ليس بكفر فجرى على لسانه كلمة الكفر خطأ لم يكن ذلك كفرا عند الكل بخلاف الهازل لأن الهازل يقول قصدا إلا أنه لا يريد حكمه و الخاطئ من يجري على لسانه من غير قصد كلمة مكان كلمة.

"اگر غلطی کے ساتھ کسی کے زبان پر کوئی کفریہ بات جاری ہو جائے کہ وہ کوئی اور بات کرنا چاہتا تھا مگر زبان سے غلطی کے ساتھ کفریہ بات نکلی تو یہ بالاتفاق کفر نہیں، بخلاف مذاق کرنے والے کے، کیونکہ مذاق کرنے والا خود اس کفریہ بات کا ارادہ کرتا ہے (اس لئے وہ کافر ہے) مگر (زیادہ سے زیادہ) اس کے حکم یعنی کفر کا قصد نہیں کرتا، اور خاطی کے تو زبان ہی سے ایک بات کے بجائے دوسری بات نکلتی ہے"[1]

کفریہ کلمہ کہا اور معنی معلوم نہیں

اسی طرح اگر کوئی کفریہ کلمہ زبان پر آجائے لیکن کہنے والے کو اس کا معنی و مفہوم کچھ معلوم نہ ہو، نہ ہی اس کو یہ علم ہو کہ یہ کفریہ کلمہ ہے جس کے کہنے سے انسان دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے، تو کیا اس کلمہ کہنے سے بھی کوئی کافر ہو جائے گا یا نہیں؟

---

[1] فتاوى قاضيخان، باب ما يكون كفرا من المسلم وما لا يكون، ج٣ ص٣٦٢.

اس باب میں فقہاء حنفیہ کا اختلاف ہے، بعض فقہاء نے تو اس کو بھی کفر قرار دیا جبکہ دیگر فقہاء کرام اس بناء پر تکفیر کے قائل نہیں ہیں بلکہ اس لاعلمی کو عذر قرار دیدیتے ہیں۔

چونکہ کفر کا دار و مدار دل کے تکذیب پر ہے، کلمہ کفر کو اسی لئے موجب کفر قرار دیا گیا ہے کہ وہ دل کی تکذیب پر دلالت کرتا ہے، اور جب قوی قرائن سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ اس کلمہ کا معنی و مفہوم بالکل نہیں جانتا اور ساتھ ساتھ اس بات سے بھی ناواقف ہے کہ یہ کفریہ بات ہے تو اس کے بعد محض اس کلمہ کو دلی تکذیب کا ترجمان قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے متعدد فقہاءِ کرام نے اسی دوسرے موقف کو ترجیح دی کہ ایسے شخص کی تکفیر نہ کی جائے۔

علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فتاویٰ ظہیریہ میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ کے نزدیک ایسے کلمہ کہنے والا کافر ہو جائے گا چاہے اس کا معنی معلوم ہو یا نہیں، اس معنی کا ارادہ کیا ہو یا نہیں (بہر حال کافر ہو جائے گا)۔ میں کہتا ہوں کہ یہ (ہر حال میں کافر کہنا) مشکل ہے کیونکہ جب اس نے کوئی عجمی کلمہ سنا جبکہ اس کا معنی معلوم نہ تھا اور اس کو یوں ہی عجم کی طرح استعمال کیا تو اس کو کیسے کافر قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ اس کلام کا معنی کہنے والا کا مقصود نہ تھا۔"[1]

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے الفاظِ طلاق کے مبحث میں اسی کو ترجیح دی، چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] شرح الامام علی القاری علی الفاظ الکفر، ص۲۲۹.

ولا خلاف أنه لو جرى على لسانه الكفر مخطئا لا يكفر كما في الخانية أيضا وكذا إذا تلفظ به غير عالم بمعناه.

"اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جس شخص کی زبان پر غلطی سے کلمہ کفر جاری ہو جائے تو وہ کافر نہیں ہے جیسا کہ فتاویٰ خانیہ میں ہے، اگر کسی نے کلمہ کفر کہا اور اس کا معنی معلوم نہ تھا تو بھی یہی حکم ہے۔"[1]

علامہ عزالدین بن عبدالسلام رحمہ اللہ نے بھی اسی بات کو اختیار فرمایا کہ متکلم کو ایسی صورت میں کافر قرار دینا درست نہیں۔[2]

کافر ہونے کا قصد ضروری نہیں بلکہ قصد فعل کافی ہے

اس شرط کا حاصل یہ ہوا کہ کسی کو کافر کہنا تب درست ہے جبکہ بنائے تکفیر اس کے قصد واختیار سے صادر ہو جائے، اگر اختیار کے بغیر اکراہ کی حالت میں کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے تو اس کو بنیاد بنا کر تکفیر کرنا جائز نہیں، تاہم قصد واختیار سے مراد یہ نہیں ہے کہ کرنے والا کافر ہونے کا بھی ارادہ کرے بلکہ اتنا ہی کافی ہے کہ جس حرکت کی وجہ سے اس کو کافر قرار دیا جا رہا ہو، وہ اس نے اپنے ارادے واختیار سے کی ہو یعنی قصدِ کفر شرط نہیں بلکہ قصدِ امرِ مکفّر بھی کافی ہے۔

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق، كتاب الطلاق، باب الفاظ الطلاق، ج٣ص٢٧٧.

[2] قواعد الأحكام في مصالح الأنام، فصل فيمن أطلق لفظا لا يعرف معناه لم يؤاخذ بمقتضاه، ج٢ص١٢٠.

لہٰذا اگر کوئی جبر و اکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے ایسا کام کرے جس کے بناء پر اس کو کافر قرار دینا ضروری ہو تو اس کی تکفیر کی جائے گی، اگرچہ خود کا فر ہونا اس کا مقصود نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ فقہاء کرام نے کلمات کفریہ کی وجہ سے تکفیر کا حکم لکھا ہے اگرچہ کہنے والے نے کافر ہونے کا ارادہ نہیں کیا بلکہ محض تفریح خاطر کے لئے ایسے کلمات کہے ہو۔[1]

عام تکفیر اور شخصِ معین کی تکفیر میں فرق

یہاں تک جو تین شرائط ذکر کی گئیں، یہ کسی قول و فعل کے کفریہ ہونے کی ضروری شرائط ہیں، اگر کسی شخص نے کوئی کفریہ کام کیا لیکن ان تین امور میں سے کوئی ایک مفقود تھا تو کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا جس کی وضاحت ہر شرط کے ذیل میں ذکر ہو چکی۔

یہ ساری تفصیل صرف کسی چیز کے موجب کفر ہونے کے متعلق ہے یعنی ان شرائط کی موجودگی میں کوئی کفریہ قول و عمل موجب کفر بنتا ہے جس کے نتیجے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس شخص نے کفریہ عمل کیا اور مندرجہ بالا شرائط موجود تھی تو وہ کافر ہے، لیکن اگر کسی خاص شخص مثلاً زید نے اس قسم کی کوئی حرکت کی تو اس کو کافر قرار دینے کے لئے صرف مندرجہ بالا شرائط ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے لئے مزید ایک شرط

---

[1] الدر المختار وحاشية ابن عابدين ،كتاب الجهاد، باب المرتد، ج٤ص ٢٢٤.

اور بھی ہے، اوروہ یہ ہے کہ سابقہ تمام شرائط کے موجود ہونے کے ساتھ ساتھ تکفیر کے موانع بھی موجود نہ ہوں۔

لہٰذا اگران شرائط کے موجود ہونے کے باوجود کسی نے کفریہ قول اختیار کیا یا کفریہ عمل کیا لیکن وہاں تکفیر سے کوئی مانع بھی موجود تھاتواس کی وجہ سے اس کو کافر نہیں کہیں گے، خلاصہ یہ ہے کہ یہ شرائط توعام تکفیر کے لئے کافی ہیں لیکن کسی خاص شخص کو کافر قرار دینے کے لئے صرف یہ شرائط کافی نہیں ہیں بلکہ موانع کاموجود نہ ہونا بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی تصریح

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

اعلم أن الحكم بكفر من ذكرنا من أهل الأهواء مع ما ثبت عن أبي حنيفة والشافعي رحمهم الله من عدم تكفير أهل القبلة من المبتدعة كلهم محمله أن ذلك المعتقد نفسه كفر، فالقائل به قائل بما هو كفر، وإن لم يكفر بناء على كون قوله ذلك عن استفراغ وسعه مجتهدا في طلب الحق.

"یادرکھو کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہمااللہ سے اہل قبلہ کی تکفیر نہ کرنا منقول ہے،اس کے باوجود اہل بدعات کو کافر کہنے کا محمل یہ ہے کہ خود یہ عقیدہ کفریہ ہے لہٰذاایسا شخص کفریہ عقیدہ رکھ رہاہے اگرچہ بعض موانع کی وجہ سے اس کو کافر نہیں کہاجاتامثلایہ کہ وہ حق کے جستجو میں اپنی پوری طاقت صرف کرے"[1]

---

[1] فتح القدیر، کتاب الصلاۃ، باب الامامۃ، ج۱ص۱۳۵.

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی توضیح

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اپنی کئی کتابوں میں اس پر بڑا زور دیا کہ مطلق اور عمومی تکفیر سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے تحت آنے والے ہر ہر فرد کو ہر حال میں کافر قرار دیا جائے، بلکہ دونوں قسم کی تکفیر میں بڑا فرق ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ فقہاء کرام کے ذکر کردہ موجبات کفر کا محمل بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قد ينقل عن أحدهم أنه كفر من قال بعض الأقوال، ويكون مقصوده أن هذا القول كفر ليحذر، ولا يلزم إذا كان القول كفرا أن يكفر كل من قاله مع الجهل والتأويل ; فإن ثبوت الكفر في حق الشخص المعين، كثبوت الوعيد في الآخرة في حقه، وذلك له شروط وموانع، كما بسطناه في موضعه.

بسااوقات کسی سے منقول ہوتا ہے کہ جو کوئی ایسا کلمہ کہے وہ کافر ہے، اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ کفریہ بات ہے جس سے بچنا چاہئے، اور کسی بات کے کفریہ ہونے سے یہ کہیں لازم نہیں آتا کہ اس کا ہر کہنے والے کو کافر ہی کہا جائے اگرچہ وہ جہالت یا تاویل کے ساتھ بھی وہ کلمہ کہے، کیونکہ کسی خاص شخص کے حق میں کفر کا ثبوت ایسا ہی ہے جیسا کسی معین آدمی کے لئے آخرت میں عذاب ثابت کرنا، ان (دونوں باتوں) کے لئے کچھ شرائط اور کچھ موانع ہوتی ہیں (جس کی رعایت رکھے بغیر اس طرح اقدام کرنا جائز نہیں۔)[1]

---

[1] منهاج السنة النبوية، فصل الله أمر بالاستغفار لأصحاب محمد فسبهم الرافضة، ج٥ص٢٤٠.

اس عبارت کا حاصل بھی یہی ہے کہ ایک ہے کسی عقیدے کا کفریہ ہونا، اور دوسری چیز اس عقیدے رکھنے والے کو کافر کہنا ہے، یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں، کسی عمل کے کفریہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتکب ہر حال میں کافر ہے یعنی تکفیر مطلق تکفیر معین کو مستلزم نہیں۔

تکفیر مطلق اور معین میں فرق کرنے کی دلچسپ نظیر احادیث کی روشنی میں

امام عبدالرزاق صنعانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے یہ روایت نقل فرمائی ہے کہ حضور ﷺ کے دربار اقدس میں ایک شخص کو اس جرم میں لایا گیا کہ اس نے شراب نوشی کی تھی، اس سے پہلے بھی اسی جرم میں اس کو بار بار حاضر کیا گیا تھا لیکن کئی بار سزا پانے کے باوجود وہ باز نہیں آرہا تھا، اس لئے حاضرین میں سے ایک شخص نے بددعاء دی کہ اس پر خدا کی لعنت ہو، یہ کتنا ہی زیادہ شراب پیتا ہے! کہ بار بار سزا پانے کے باوجود شراب نوشی کو چھوڑنے کا نام تک نہیں لے رہا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا:

لا تلعنه فإنه يحب الله ورسوله.

"اس پر لعنت نہ کرو کیونکہ یہ خدا تعالیٰ اور رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے"۔[1]

اس حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ نے شخص مذکور پر لعنت کرنے سے منع فرمایا حالانکہ وہ شراب نوشی کے جرم میں حاضر کیا گیا تھا اور اس جرم کا ثبوت بھی ہو چکا تھا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شراب پینا اس کا معمول تھا

---

[1] مصنف عبد الرزاق الصنعاني ،باب حد الخمر، رقم الحديث: ١٣٥٥٢، ج٧ص ٣٨١.

ان ساری باتوں کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ملعون کہنے یا لعنت کی بددعاء کرنے سے ممانعت فرمائی، حالانکہ سنن ترمذی کی صحیح روایت میں یہ صراحت ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب کے متعلق دس افراد پر لعنت فرمائی جن میں سے ایک خود شراب پینے والا بھی ہے [1]۔

اس روایت کے مطابق شراب پینے والا ملعون ہے اور اس کو ملعون کہنے میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہونی چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ پھر خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیوں ممانعت فرمائی؟

دراصل بات یہ ہے کہ عمومی طور پر لعنت کرنا اور چیز ہے، خاص کسی معین شخص کو ملعون کہنے کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، دونوں حدیثوں کو جمع کرنے سے وضاحت کے ساتھ یہ مفہوم حاصل ہوتا ہے کہ عمومی طور پر شراب پینے والوں پر لعنت کرنا اور چیز ہے اور خاص کسی شراب خور پر لعنت کرنے کا حکم جدا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دس افراد پر لعنت فرمائی، وہ عمومی لعنت کے قبیل سے ہے کسی خاص شخص پر لعنت کرنے کے لئے اس سے استدلال کرنا درست نہیں۔

---

[1] سنن الترمذی،ابواب البیوع، باب النهي أن يتخذ الخمر خلا، رقم الحديث: ١٢٩٥.

تکفیر مطلق اور معین میں فرق کرنے کی فقہی نظیر

متعدد احادیث میں لعنت کرنے سے منع فرمایا گیا، امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احیاء العلوم میں اس قسم کے متعدد روایات جمع کی ہے جس میں حضور ﷺ نے کسی مسلمان پر لعنت کی بد دعا سے روکا گیا[1]۔

ان احادیث کی وجہ سے حضرات فقہاء کرام کا بھی اس بات پر اتفاق ہے کہ عام حالات میں کسی کو ایسی بد دعاء دینا ناجائز اور گناہ ہے، مگر تقریباً تمام فقہاء کرام اس بات پر متفق ہیں کہ لعنت کرنے کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ایک کسی خاص فرد پر لعنت کرنا، مثلاً کوئی یہ کہے کہ اللہ زید کو ملعون کرے، یا کہے کہ زید پر خدا کی لعنت ہو۔

۲۔ کسی خاص وصف کی بنیاد پر لعنت کرنا، اور وہ وصف بھی ایسا ہو کہ جو کفر و فسق پر مشتمل ہو، مثلا جھوٹوں پر خدا کی لعنت۔

پہلی قسم کی لعنت کا حکم فقہاء کرام نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک کوئی شخص زندہ ہے تو اس طرح بد دعا کرنا ناجائز ہے اور دوسری قسم کا حکم یہ ہے کہ ایسا کرنا بالکل جائز ہے، خود قرآن کریم میں "الا لعنۃ اللہ علی الکذبین" فرمایا گیا اور احادیث مبارکہ میں تو دسیوں گناہوں پر ایسی بد دعا منقول ہے، لیکن اس جیسی عمومی لعنت کے جائز ہونے کا یہ معنی ہر گز نہیں کہ اگر کسی خاص شخص میں یہ وصف موجود ہو مثلا کوئی شخص جھوٹ

---

[1] احیاء علوم الدین، ربع الملکات، کتاب آفات اللسان.

بولتا ہو تو اس پر یہ کہہ کر لعنت کی جائے کہ قرآن کریم میں جھوٹوں پر لعنت کی گئی اور یہ بھی جھوٹا ہے اس لئے اس پر لعنت ہے۔

علامہ بِرکوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

فلا يجوز لشخص معيّن بطريق الجزم الّا ان يثبت موته على الكفر كأبي جهل وفرعون وإبليس ولا لحيوان ولاجماد..وانّما يجوز اللّعن بالوصف العام المذموم اذ ثبت عن النبيّ صلى الله عليه وسلّم انّه لعن من ذبح لغير الله تعالى.[1]

" مخصوص آدمی پر حتمی طور پر لعنت کرنا جائز نہیں مگر یہ کہ اس کا کفر پر مرنا ثابت ہو جائے جیسے ابو جہل، فرعون اور ابلیس، نہ ہی کسی حیوان یا جمادات پر لعنت کرنا جائز ہے، صرف کسی عام اور مذموم صفت کی بناء پر ہی لعنت کی جاسکتی ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ انہوں نے غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے والوں پر لعنت فرمائی۔"

اس کتاب کے مشہور شارح علامہ ابو سعید خادمی رحمہ اللہ نے یہاں یہ اشکال اٹھایا ہے[2] کہ قرآن وحدیث میں جہاں کسی عام وصف پر لعنت کی گئی ہے وہاں اکثر "کل" وغیرہ ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو اپنے مدخول کے تمام افراد پر بولا جاتا ہے اور سب افراد کے لئے حکم ثابت کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ مثلاً جھوٹ بولنے والے ہر ہر فرد پر لعنت ہے، اب کوئی شخص اگر جھوٹا ہے اور اس کا

---

[1] الطريقة المحمدية، الباب الثاني، ص٣٦٧.

[2] بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية ، الباب الثاني، ج٣ص١٩٥.

جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تو آسانی کے ساتھ یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ یہ شخص جھوٹا ہے اور ہر جھوٹے پر خدا کی لعنت ہے لہٰذا اس پر بھی خدا کی لعنت ہے، منطق کی اصطلاح میں اس کو شکل اول سے تعبیر کیا جاتا ہے جو بالکل بدیہی الانتاج ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی مخصوص شخص ان جیسے اوصاف کا حامل ہے جس پر قرآن وحدیث میں لعنت وارد ہوئی ہے تو اس پر لعنت کرنا کیونکر ممنوع ہو سکتا ہے؟

اس اشکال کو ذکر کرنے کے بعد جواب کا مختصراً ذکر فرمایا جس کی آسان تعبیر یہی ہے کہ مطلق لعن کرنے سے ہر ہر فرد پر لعنت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، لعنِ معیّن اور لعن مطلق میں فرق ہے، اس کی واضح دلیل مصنف عبد الرزاق کی وہ روایت ہے جو ابھی ذکر کی گئی۔

امام صاحب کے کلام سے ایک اور نظیر

امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لا نقول إن حسناتنا مقبولة وسيئاتنا مغفورة كقول المرجئة ولكن نقول من عمل حسنة بجميع شرائطها خالية عن العيوب المفسدة ولم يبطلها بالكفر والردة والأخلاق السيئة حتى خرج من الدنيا مؤمنا فإن الله تعالى لا يضيعها بل يقبلها منه ويثيبه عليها

ہم مرجئہ کی طرح یہ نہیں کہتے کہ ہماری نیکیاں قبول اور برائیاں معاف ہیں، البتہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو کوئی بھی اپنے تمام تر شرائط کے ساتھ کوئی نیک کام

کرے۔۔۔تو اللہ تعالیٰ اس کو ضائع نہیں فرمائیں گے بلکہ قبول کر کے اس پر ثواب بخشیں گے۔"[1]

اس عبارت میں عمومی قانون تو بیان کیا، لیکن اس کو کسی خاص شخص پر منطبق ہونے سے انکار فرمایا۔

معین سے کیا مراد ہے؟

خاص فرد پر لعنت کرنے اور گناہ وفسق عمومی اوصاف کو بنیاد بنا کر لعنت کرنے میں واضح فرق ہے، پھر خاص فرد پر لعنت کرنا صرف اسی میں منحصر نہیں کہ کوئی کہے زید پر خدا کی لعنت ہو بلکہ ایک سے زائد افراد بھی اگر کسی وصف میں شریک ہوں اور وہ وصف بھی بذات خود کسی فسق وفجور جیسے عمومی وصف پر مشتمل نہ ہو تو ان پر عمومی طور پر لعنت کرنے کا بھی یہی حکم ہے مثلاً کوئی کہے کہ فلاں گاؤں کے تمام رہنے والوں پر خدا کی لعنت۔

چنانچہ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے "رعل وذکوان" وغیرہ بعض قبائل کے متعلق یہی بد دعاء شروع فرمائی تو آیت کریمہ "لیس لک من الامر شئی" نازل ہوئی[2] جس میں آپ ﷺ کو اس سے منع فرمایا گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تمام فقہاءِ کرام کے نزدیک لعنت کرنے کی ان دونوں صورتوں میں فرق ہے، عمومی اوصاف پر لعنت کرنے سے یہ ہر گز ثابت نہیں ہوتا کہ

---

[1] (الفقه الأكبر،ص:٤٧).

[2] الدر المنثور في التفسير بالمأثور، تفسير سورة آل عمران، رقم الاية:١٢٨، ج٢ص٣١٣.

خصوصی افراد پر بھی لعنت کی جائے، بس یہی حکم تکفیر کا بھی ہے کہ بعض جرائم کی بنیاد پر اگر کہیں عمومی تکفیر کی جائے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس جرم میں مبتلا ہر ہر شخص کو معین طور پر کافر کہا جائے، محض تکفیر مطلق کی وجہ سے تکفیر معین کرنا درست نہیں۔

چوتھی شرط: موانع کا موجود نہ ہونا

موانع تکفیر

فقہاءِ کرام اور متکلمین کے تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ شخص معین کے تکفیر سے تین موانع ہیں:

۱۔ جہل

۲۔ اکراہ

۳۔ تاویل

لیکن ظاہر ہے کہ یہ امور بھی مطلقاً موانع نہیں ہے کہ ہر جگہ اسی کے سہارے تکفیر سے گریز کرنا ضروری قرار دیا جائے بلکہ ہر ایک مانع بننے کے لئے کچھ حدود وقیود ہیں جس کو ذکر کئے بغیر یہ بحث نامکمل رہے گا، اس لئے ذیل میں ہر ایک کی ضروری تفصیل ذکر کر دی جاتی ہے، انشاءاللہ تعالیٰ۔

پہلا مانع: جہل

اسلام کے احکام کی دو قسمیں ہیں:

الف: ایک قسم ان احکام کی ہے جو دین کے متواتر اور متوارث احکام و تعلیمات ہیں جو ہر عالم اور دیندار عامی کو معلوم ہوتے ہیں، اس کا علم تو ہر مسلمان کے لئے شرعاً ضروری ہے اس سے جاہل رہنا کوئی عذر نہیں۔

ب: دوسری قسم ان احکام کی ہے جو اس قدر مشہور نہ ہوں، ہر خاص وعام کو معلوم نہ ہوں۔

اس قسم کے احکام کا اگر کوئی شخص انکار کرے تو اس پر فوراً کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا بلکہ اولاً اس کو اصل حکم بتایا جائے گا کہ یہ شریعت کا ثابت شدہ حکم ہے اگر اس کے باوجود بھی وہ انکار یا تکذیب کرے اور اس حکم کا شریعت میں سے ہونا بھی یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو، تبھی اس کے کفر کا فیصلہ ہوگا، کیونکہ ممکن ہے کہ اس انکار کی بنیاد حضور ﷺ اور دین اسلام کی تکذیب نہ ہو بلکہ ناواقفیت کے نتیجہ میں اس کا ارتکاب کیا ہو، اس لئے پہلے شرعی احکام کی تبلیغ و تلقین کرنی ضروری ہے۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وفي آخر اليتيمة ظن لجهله أن ما فعله من المحظورات حلال له، فإن كان مما يعلم من دين النبي صلى الله عليه وسلم ضرورة، كفر وإلا فلا.

"کسی نے اپنی جہالت کی وجہ سے یہ گمان کیا کہ جو منکرات میں نے کئے ہے، وہ جائز ہے تو دیکھا جائے گا، اگر وہ منکرات ایسے ہوں جس کا دین اسلام میں سے ہونا بداہۃً معلوم ہو تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا ورنہ نہیں۔[1]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ دینی احکام کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ضروریات دین کے قبیل سے ہیں ان کا انکار کرنا مطلقاً کفر ہے، چاہے انکار کرنے والے کو اس کے حکم شرعی ہونے کا علم ہو یا نہیں۔

۲۔ضروریات دین کے علاوہ دیگر احکام کا انکار کرنا مطلقاً کفر نہیں، اس کی وجہ سے انکار کرتے ہی کفر کا حکم جاری نہیں ہو گا بلکہ منکر کو اولاً اس حکم کی تبلیغ کی جائے گی اس کے بعد بھی اگر وہ انکار ہی پر مصر رہا تو کافر قرار دیا جائے گا۔

قیام حجت

لیکن ظاہر ہے کہ یہ تفصیل بھی تب ہے کہ جب کوئی اسلامی معاشرہ میں رہ رہا ہو، اور معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اس کو شعوری یا لاشعوری طور پر یہ احکامات معلوم ہوں، کیونکہ قانون الٰہی یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس حضرات انبیاء کرام کی تعلیمات نہ پہنچے، اس وقت تک نافرمانیوں اور گناہوں کی وجہ سے اس قوم کو عذاب میں مبتلا نہیں کیا جاتا، عذاب و سزا ہمیشہ حجت قائم ہونے کے بعد ہی دیا جاتا ہے۔

اس لئے حضرات متکلمین نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص دور دراز پہاڑی میں رہ رہا ہو جہاں شرعی احکام اور دین اسلام کی دعوت نہیں پہنچی، یا کوئی شخص دارالحرب میں قیام

---

[1] الأشباه والنظائر مع غمز عيون البصائر، أحكام الناسي والجاهل والمكره، ج٣ص٣٠٤.

پذیر ہے جہاں اسلام کا معاشرتی اور ثقافتی ماحول میسر نہ ہو، وہاں کے رہنے والوں کے پاس نماز وغیرہ دینی احکام جاننے کے ذرائع نہ ہوں تو اگر ایسی صورت میں کوئی شخص ان ضروریاتِ دین کی تصدیق نہ بھی کرے تو بھی اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

علامہ جرجانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وقيد العلم ليخرج عنه المحرمات الصادرة عمن لم تبلغه دعوة نبي أو عمن هو قريب العهد بالإسلام.

علم کی قید اس لئے لگائی تاکہ اس سے وہ حرام کام نکل جائے جس کا ایسا شخص ارتکاب کرتا ہے جس کو کسی نبی ﷺ کی دعوت نہیں پہنچی، یا جو کوئی ابھی ابھی نیا اسلام قبول کر چکا ہو (اور اس کو حلال و حرام وغیرہ کا علم نہ ہو)[1]

وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام و کفر کا دار و مدار تصدیق و عدمِ تصدیق پر ہے، دونوں کے درمیان تقابل عدم والملکہ ہے، ایمان کے لئے تصدیق ضروری ہے اور کفر دراصل تکذیب کا نام ہے لیکن حضور ﷺ کی تصدیق نہ کرنا ہی تکذیب کے مترادف ہے جیسا کہ باب اول میں پوری تفصیل کے ساتھ یہ بحث گزر چکی۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اب سوال یہ ہے کہ جب عدمِ تصدیق کفر ہے تو شخص مذکور کو کافر ہی قرار دیدینا چاہئے کیونکہ پہلی صورت میں اس نے ان احکام کا واضح انکار کیا جن کو "ضروریات دین" کہا جاتا ہے، اور پہلی صورت میں اگرچہ صریح انکار تو نہیں کیا لیکن اس کی تصدیق

---

[1] شرح المواقف، المرصد السادس، المقصد الخامس في الحسن والقبح، ج۸ص۲۰۵.

بھی نہیں کی، لہٰذا ان دونوں صورتوں میں کفر کے احکام جاری ہونے چاہئے، پھر متکلمین اس کو کافر کیوں نہیں کہتے؟

لفظ کفر کے دو مختلف مفہوم

اس کا جواب واضح ہے کہ کفر کے دو استعمال ہیں، دونوں استعمال میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے، علم کلام اور علم فقہ میں کفر کا لفظ دونوں مفہوم میں استعمال ہوتا ہے:

ا۔ دنیا میں کفر کے احکام جاری ہونا، یعنی کافر ہونے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ وہ دنیا میں مسلمانوں کے احکام جاری ہونے سے محروم ہو گا، دنیا میں اس پر کافر کے احکام ہی جاری ہوں گے مثلاً اس پر سلام کرنے میں سبقت نہ کرنا، مسلمانوں کا اس کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھنا، رشتہ وناطہ کے مسئلہ میں مسلمانوں کا اس سے امتیاز باقی رکھنا، وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ کفر کا دوسرا اطلاق اس معنی میں ہوتا ہے کہ آخرت میں وہ کافر شمار ہو گا اور اس پر کفر ہی کے احکام جاری ہوں گے، مثلا وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا، اس کی مغفرت نہیں ہو گی وغیرہ وغیرہ۔

جن حضرات نے مذکورہ دونوں صورتوں میں کفر کا حکم نہیں لگایا ان کا مقصود دوسرے معنی میں کافر ہونے کی نفی ہے یعنی اخروی احکام میں ایسا شخص دوسرے کفار کی طرح جہنم میں نہیں جائے گا کیونکہ جب تک اس کو دین حق کی دعوت نہیں پہنچی تو قبول نہ کرنے میں وہ مجرم بھی نہیں، کیونکہ نماز وغیرہ عبادات نرے عقل سے معلوم

نہیں ہو سکتے بلکہ اس کے لئے وحی الٰہی کی ضرورت ہے جس کی تبلیغ شخص مذکور کو ہوئی نہیں، اس لئے اسلام قبول نہ کرنے میں وہ معذور شمار ہو گا۔

ارشادِ خداوندی ہے:

{وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّى نَبْعَثَ رَسُولًا}.

"اور ہم (کبھی) سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے۔"[1]

امام طبری رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

وما كنا مهلكي قوم إلا بعد الإعذار إليهم بالرسل، وإقامة الحجة عليهم بالآيات التي تقطع عذرهم. كما حدثنا بشر- عن قتادة، قوله (وما كنا معذبين-:إن الله تبارك وتعالى ليس يعذب أحدا حتى يسبق إليه من الله خبرا، أو يأتيه من الله بينة، وليس معذبا أحدا إلا بذنبه.[2]

امام شاطبیؒ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی لکھا ہے کہ سنت اللہ یہی ہے کہ جب تک کسی قوم کے پاس انبیاء کرام تشریف نہیں لاتے، ان کی دعوت نہیں پہنچتی تو اس وقت تک اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں بھی کرتے رہیں، شرعی احکام کی مخالفت بھی کرتے رہیں، تو بھی اللہ تعالیٰ ان کا مواخذہ نہیں فرماتا[3]

---

[1] [الإسراء: ١٥].

[2] جامع البيان ت شاكر، تفسير سورة الإسراء، رقم الاية: ١٥ ج١٧ص٤٠٢.

[3] الموافقات، كتاب الأدلة الشرعية، ج٤ص٢٠٠.

"کفر" کے ان دونوں قسم کے استعمال کو مد نظر رکھ کر پہلے استعمال کے اعتبار سے وہ کافر ہے، دنیامیں اس پر کفر کے احکام جاری ہوں گے کیونکہ مسلمانوں کے احکام جاری کرنے کے لئے قبول اسلام بنیادی شرط ہے اور اسلام چونکہ ایک وجودی چیز ہے جو ابھی تک شخص مذکور سے وجود میں نہیں آیا اس لئے اسلام کے احکام بھی اس پر جاری نہیں ہوں گے۔

تاہم اتنا ضرور ہے کہ دیگر کفار کی طرح اس قسم کے لوگوں کو دعوت دینے سے پہلے قتل کرنا بھی جائز نہیں ،دعوت دینے کے بعد ہی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اس قسم کا اقدام کیا جاسکتا ہے کیونکہ جب دین حق کی آواز نہیں پہنچی تو وہ معذور ہے اور یہ کفر اس کی سرکشی یا بغاوت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔

الناس اعداء لما جهلوا.

امام محمد کا مدبرانہ فیصلہ

علامہ حموی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ یہود ونصاریٰ کو عذاب دیں گے، اس پر کسی عورت نے کہا کہ نہیں، ایسا نہیں ہوگا، یہ لوگ بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اس لئے اللہ ان کو عذاب نہیں دیں گے، اب سوچنے کی بات ہے کہ یہود ونصاریٰ کو قیامت کے دن عذاب ملنا ضروریات دین سے شاید کم نہیں، ہر خاص وعام کو اس کا علم ہے اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ عورت کو فوراً کافر قرار دیا جاتا۔

لیکن جب یہی مسئلہ امام محمد رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ

عورت کافر نہیں، بس اتنی بات ہے کہ وہ جاہل ہے اس کو پوری بات سمجھاؤ، لوگوں کے سمجھانے پر وہ بات سمجھ گئی۔[1]

امام محمد رحمہ اللہ کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دین اسلام کے عام فہم اور ضروری مسائل وعقائد سے بھی انکار کرے لیکن اس کا انکار ضد وعناد پر مبنی نہ ہو تو اس کو حکمت ومصلحت اور اس کے فہم کے مطابق اصل دینی حکم سمجھا دینا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ سمجھائے بغیر تکفیر کرنے کی وجہ سے فطری کمزوری اپنا کام کرے اور وہ مزید اپنے "موقف" پر ہٹ دھرمی کے ساتھ برقرار رہے اور نفسانی جذبات سے مغلوب بیچارے انسان کے اندر ضد وتعصّب کی فضاء میں یہ تکفیر تیل پر جلتی کا کام کرے، موجودہ زمانہ میں چونکہ دینی شعور کا کوئی خاص اہتمام نہیں رہا، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ محض نادانی اور جہالت کی وجہ سے ایسے امور کا اقدام کیا جاتا ہے، اس لئے آج کل اس اصول کا خاص طور پر لحاظ رکھ لینا ضروری ہے۔

دوسرا مانع: اکراہ

شرائط کے بیان میں ذکر ہو چکا ہے کہ کوئی مسلمان تب ہی مرتد ہوگا جب وہ کفریہ عمل اپنے ارادے اور اختیار سے کرے، کیونکہ ایمان اور کفر کا اصل دارومدار دلی تصدیق یا تکذیب پر ہے، جن اقوال واعمال کو حضرات فقہاء کرام نے موجبات کفر قرار دیا ہے، وہ صرف اسی لئے کفر کے اسباب بنتے ہیں کہ وہ درحقیقت اسی قلبی

---

[1] غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر، أحكام الناسي والجاهل والمكره، حقيقة الجهل وأقسامه، ج٣ص٣٠٤.

تصدیق وتکذیب پر دلالت کرتے ہیں ،جواعمال پورے اختیار اوررضامندی سے صادر ہوتے ہیں ان ہی کو دل کاترجمان کہاجاسکتاہے، ڈنڈے کے سہارے مجبور کرنے کی ضرورت پیش ہی وہی آتی ہے جہاں کسی کے مرضی کے خلاف کوئی کام کروایاجارہاہو جوکام مرضی سے انجام دیاجارہاہواس میں اکراہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

امام کاسانی کی ایک دلچسپ تفریع

امام کاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ نےاسی پر یہ مسئلہ متفرع فرمایاہے کہ اگرکسی شخص کواسلام لانے پر مجبور کیاگیااوراسی جبرواکراہ کی وجہ سے اس نےاسلام قبول کیا،اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ مرتد ہواتواس کواگرچہ اسلام لانے پر دوبارہ مجبور تو کیاجائے گا،تاہم عام مرتدین کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کو قتل بھی نہیں کیاجائے گاکیونکہ جب اس نےاپنی مرضی سے اسلام قبول نہیں کیابلکہ کسی کے جبر کرنے کی وجہ سے کلمہ اسلام کہاتواس صورت میں زبان سے کلمہ اسلام کہنا حقیقی معنی میں دل کاترجمان نہیں،اس لئے گویااس اکراہ کی وجہ سے وہ مسلمان ہی نہیں ہوا،لہٰذادوبارہ کفراختیار کرنے وجہ سے اس پرارتداد کے تمام احکام بھی جاری نہیں ہوں گے۔[1]

---

[1] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب الاكراه،النوع الثاني:المكره على الكفر، ج٧ص١٧٨.

اس سے معلوم ہوا کہ اگر اکراہ کے نتیجہ میں کوئی کفریہ کام کیا جائے تو اس کی بنیاد پر اس عمل کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جائی گی، البتہ اس میں مندرجہ ذیل تین باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ اکراہ سے کیا مراد ہے؟

۲۔ کیا اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کہنا ضروری ہے؟ اگر کوئی شخص حالت اکراہ میں بھی کلمہ کفر منہ سے نہ نکالے تو کیا وہ گناہ گار ہوگا؟

۳۔ اکراہ کی حالت میں توریہ کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

اکراہ سے مقصود

حضرات فقہاء کرام نے اکراہ کی دو صورتیں بیان فرمائی ہیں، اکراہ ملجی اور اکراہ غیر ملجی۔

یہاں جس اکراہ کی وجہ سے زبان سے کلمہ کفر نکالنے کی اجازت دی گئی ہے، اس سے مراد اکراہ ملجی ہے یعنی اس حد تک اکراہ کہ کلمہ کفر نہ کہنے کی وجہ سے جان یا عضو تلف ہونے کا قوی اندیشہ ہو، اگر معمولی قید وضرب کی دھمکی دی گئی تو وہ اکراہ غیر ملجی/اکراہ ناقص ہے، اس کی وجہ سے کلمہ کفر کہنا یا کفریہ عمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ اگر معمولی اکراہ کے نتیجہ میں کوئی یقینی کفریہ قول یا عمل انجام دیا تو قضاءً وہ کافر ہی شمار ہوگا۔

امام کاسانی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

هذا إذا كان الإكراه على الكفر تاما، فأما إذا كان ناقصا يحكم بكفره؛ لأنه ليس بمكره في الحقيقة؛ لأنه ما فعله للضرورة بل لدفع

الغم عن نفسه، ولو قال: كان قلبي مطمئنا بالإيمان لا يصدق في الحكم؛ لأنه خلاف الظاهر كالطائع إذا أجرى الكلمة ثم قال: كان قلبي مطمئنا بالإيمان ويصدق فيما بينه وبين الله تعالى.

"یہ تفصیل تب ہے کہ جب کفر پر اکراہ تام ہو یعنی پوری طرح کسی کو مجبور کیا جائے، اگر اکراہ ناقص ہے (اور اس سے بچنے کی خاطر کلمہ کفر کہا) تو اس کے کفر کا حکم کیا جائے گا کیونکہ حقیقت میں یہ مکرہ ہے ہی نہیں، اس نے کلمہ کفر ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے پریشانی دور کرنے کے لئے کہا، اس کے بعد اگر وہ یہ بھی کہے کہ میرا دل ایمان پر مطمئن تھا تو بھی قضاءً اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ ظاہر الفاظ کے خلاف ہے، یہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ کوئی اپنی مرضی سے کلمہ کفر کہے اور پھر یہ دعوی کرے کہ میرا دل ایمان پر مطمئن تھا، تاہم دیانۃً اس کی تصدیق کی جائے گی۔"[1]

اکراہ کی حالت میں کلمہ کفر کہنا شرعاً ضروری نہیں

اکراہ کی حالت میں شریعت میں اگرچہ زبان کی حد تک کلمہ کفر کہنے کی گنجائش دی گئی ہے لیکن یہ استثنائی اجازت ہی کے درجہ میں ہے، کوئی فرض وواجب نہیں، اگر اکراہ کی حالت میں کسی نے کلمہ کفر نہیں کہا اور اس جرمِ وفا کی پاداش میں وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تو شرعاً وہ ماخوذ نہیں ہوگا کیونکہ کلمہ کفر کہہ کر جان بچانے کی اگرچہ رخصت اور اجازت تھی لیکن ایسا کرنا کوئی ضروری نہ تھا جس کے چھوڑنے پر اس کا مواخذہ ہو۔

---

[1] بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، كتاب الاكراه، حكم مايقع عليه الاكراه، ج٧ص١٧٩.

عزیمت کی راہ

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین میں سے حضرت عمار بن یاسر اور حضرت خباب بن الارت رضی اللہ تعالیٰ عنہما دونوں کے ساتھ اس قسم کا واقعہ پیش آیا، حضرت عمار نے زبان سے ایسا کلمہ کہا اور حضرت خباب نے اس رخصت پر عمل نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کو جام شہادت نوش کرنا پڑا۔

صحابہ کرام نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی کارکردگی کو رخصت پر محمول کیا اور حضرت خباب کی جرأت کو عزیمت پر حمل کیا، امام جصاص رازی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ اس کی وجہ سے حضور نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام کے نزدیک سیدنا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں حضرت خباب افضل سمجھے جاتے تھے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

وقوله صلى الله عليه وسلم لعمار "إن عادوا فعد"إنما هو على وجه الإباحة لا على وجهة الإيجاب ولا على الندب وقال أصحابنا الأفضل أن لا يعطي التقية ولا يظهر الكفر حتى يقتل وإن كان غير ذلك مباحا له وذلك لأن خبيب بن عدي لما أراد أهل مكة أن يقتلوه لم يعطهم التقية حتى قتل فكان عند النبي صلى الله عليه وسلم وعند المسلمين أفضل من عمار في إعطائه التقية ولأن في ترك إعطاء التقية إعزازا للدين وغيظا للمشركين فهو بمنزلة من قاتل العدو حتى قتل فحظ الإكراه في هذا الموضع إسقاط المأثم عن قائل هذا القول حتى يكون بمنزلة من لم يقل.

"حضور ﷺ کا حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو ان جیسے حالات میں دوبارہ کلمہ کفر کہنے کی اجازت دینا اباحت (رخصت) پر مبنی ہے، کوئی واجب و مستحب نہیں، فقہاء

احناف فرماتے ہیں کہ اکراہ کی حالت میں بہتر یہ ہے کہ تقیہ سے کام لے کر کفر کا اظہار نہ کرے بلکہ صبر کرے یہاں تک کہ قتل ہو جائے، کیونکہ جب اہل مکہ نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو مجبور کیا تو اس نے تقیہ سے کام نہیں لیا یہاں تک کہ ان کو شہید کیا گیا، تو اس صبر کی وجہ سے حضرت خبیب حضور ﷺ اور مسلمانوں کے نزدیک حضرت عمار سے بہتر سمجھے جاتے تھے کہ انہوں نے تقیہ سے کام لیا تھا، اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس حالت میں بھی تقیہ چھوڑنے میں دین کی عزت اور کفار کے غیظ و غضب کا سامان موجود ہے، گویا یہ ایسا ہی ہے کہ وہ باقاعدہ لڑ رہا ہے اور لڑ لڑ کر شہید ہوا، لہٰذا ایسی صورت میں اکراہ کی وجہ سے صرف اس کہنے کا گناہ ختم ہو گا گویا کہ اس نے یہ کلمہ کفر استعمال ہی نہیں کیا۔"[1]

بلکہ سورۃ آل عمران کی تفسیر میں آپ نے ایک مرفوع روایت بھی نقل فرمائی ہے کہ مسیلمہ کذاب نے دو صحابہ کرام کو گرفتار کیا اور دونوں سے اپنی رسالت کا اقرار کروانا چاہا، ان میں سے ایک نے زبانی طور پر "ہاں" کیا جس پر اس کی جان بخشی ہوئی اور دوسرے نے آپ کو نبی کہنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ میں بہرا ہوں، مسیلمہ کے تین بار تلقین کرانے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اس کو شہید کیا گیا۔

حضور ﷺ کا فیصلہ

حضور ﷺ کو جب اس سانحہ کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أما هذا المقتول فمضى على صدقه ويقينه وأخذ بفضيلة فهنيئا له وأما الآخر فقبل رخصة الله فلا تبعة عليه.

---

[1] أحكام القرآن للجصاص، سورة النحل، رقم الاية: ١٠٦، ج٣ ص٢٤٩.

"یہ مقتول تواپنے صدق ویقین پر چل بسااور بزرگی حاصل کی جواس کو مبارک ہو،
اور دوسرے نے اللہ تعالیٰ کی رخصت کو قبول کیا تواس پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں
ہے"[1]

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد آپ نے بڑی بسط وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ایسی صورت میں عزیمت کی راہ اختیار کرنا ہی بہتر ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس رخصت پر عمل کرنا بھی کوئی ناجائز یا بُرا نہیں۔

فقہاء شافعیہ کی طرف سے ایک مناسب تطبیق

شوافع میں سے بعض فقہاء کرام نے اس میں ایک اور مناسب تطبیق دی، اس کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو مجبور کیا جارہا ہے اس کی حالت کو دیکھ لینا چاہئے:

۱۔اگر مستقبل میں اس سے دینی خدمات کی توقع ہو مثلاً کفر اور کفار کو نقصان پہنچانا، اسلام کی کوئی بڑی خدمت کرنا تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ زبان سے یہ کلمہ کہہ گزرے۔اور اس میں بھی حتی الامکان مناسب یہ ہے کہ اگر توریہ وغیرہ کی کسی صورت اختیار کرنے سے جان بچائی جاسکے تو وہی اختیار کرے جس کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جائے گی۔

۲۔اور اگر مجبور شخص کا یہ حال نہ ہو تو مجبور کرنے والے افراد کے غیظ و غضب کے لئے کلمہ کفر سے باز ہی آجانا چاہے۔

---

[1] أحكام القرآن للجصاص، تفسير سورة آل عمران، رقم الاية:۳۳، ج۲ص ۲۹۰.

یہ اگرچہ تمام شوافع کا موقف نہیں نہ ہی حنفیہ نے اس تفصیل کو بطور مذہب نقل فرمایا ہے لیکن قواعد کے لحاظ کافی حد تک مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شوافع کی مشہور کتاب "المجموع" میں ہے:

من أكره على كلمة الكفر فالافضل ألا يأتي بها. ومن أصحابنا من قال (ان كان ممن يرجوا النكاية في أمر العدو والقيام في أمر الشرع فالافضل أن يدفع القتل عن نفسه ويتلفظ بها، وان كان لا يرجو ذلك اختار القتل.

"جس کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو بہتر یہ ہے کہ وہ کہے، البتہ ہمارے بعض ائمہ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ شخص ایسا ہو جو دشمن کو نقصان پہنچا سکے اور شرعی احکام پر استقامت رکھ سکے تو اس کے لئے قتل سے بچنا اور اس پر تلفظ کرنا بہتر ہے اور اگر ایسی کوئی امید نہ ہو تو قتل کے پہلو کو ترجیح دے"[1]

امکانی حد تک زاویہ فکر کی تبدیلی

اکراہ کی صورت میں کلمہ کفر کہنے کی اگرچہ اجازت ہے، مگر اس میں بھی حتی الامکان کوئی ایسا توریہ /تدبیر اختیار کر لینا چاہئے کہ جس کی وجہ سے صریح کفر سے بچا جا سکے مثلاً اگر کسی کو خدانخواستہ حضور سرور کائنات ﷺ کو گالی دینے پر مجبور کیا جائے اور نہ کرنے کی صورت میں اس کی زندگی یا عضو فوت ہو جانے کا قوی اندیشہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ برا بھلا کہتے وقت لفظ محمد سے حضور ﷺ کے علاوہ کسی اور محمد کا ارادہ کیا جائے، اور خیال یہ کرے کہ میں فلان شخص

[1] المجموع شرح المهذب، باب قتل المرتد، ج١٩ص٢٢٤.

کے بارے میں یہ سب کچھ کہہ رہاہوں جس کا نام اتفاق سے محمد ہے، حضور ﷺ کے بارے میں نہیں کہہ رہا۔

اسی طرح اگر کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا جائے تو وہ انشاء کے بجائے اقرار کے پہلو کو مد نظر رکھ کر جان بچائے مثلاً ایک شخص نے دوسرے پر اکراہ کیا کہ وہ اپنی طرف کفر کی نسبت کرے ورنہ اس کی جان لے لے گا اور وہ عرب ہے تو بہتر یہ ہے کہ "کفرت" کہتے وقت ابھی فی الحال کافر ہونا یا کفر کرنا مراد نہ لے بلکہ ماضی کے دریچوں میں جھونک کر جھوٹا اقرار کرے۔

اس طرح کرنے میں صرف زاویہ فکر کے تبدیلی کی ضرورت ہے، اکراہ کرنے والوں کے ظلم سے بھی نجات حاصل ہو جائے گی اور حضور ﷺ کے دربار عالیہ میں سب و شتم جیسی لعنت سے بھی بچنے کی صورت ہاتھ آجاتی ہے۔

حضرات فقہاءِ کرام کے نزدیک توریہ کی اہمیت

فقہاء کرام کے ہاں اس توریہ کی بڑی اہمیت ہے یہاں تک کہ امام جصاص رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں کہ اگر سب و شتم کرتے وقت یہ تدبیر خیال میں آئی لیکن پھر بھی اس پر عمل نہیں کیا اور لفظ "محمد" سے آپ ﷺ ہی مراد لے کر برا بھلا کہا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

ويعارض بها غيره إذا خطر ذلك بباله فإن لم يفعل ذلك مع خطوره بباله كان كافرا قال محمد بن الحسن إذا أكرهه الكفار على أن يشتم محمدا صلى الله عليه وسلم فخطر بباله أن يشتم محمدا آخر غيره فلم يفعل وقد شتم النبي صلى الله عليه وسلم كان كافرا

وكذلك لو قيل له لتسجدن لهذا الصليب فخطر بباله أن يجعل السجود لله فلم يفعل وسجد للصليب كان كافرا فإن أعجلوه عن الروية ولم يخطر بباله شيء وقال ما أكره عليه أو فعل لم يكن كافرا إذا كان قلبه مطمئنا بالإيمان قال أبو بكر وذلك لأنه إذا خطر بباله ما ذكرنا فقد أمكنه أن يفعل الشتيمة لغير النبي صلى الله عليه وسلم إذ لم يكن مكرها على الضمير وإنما كان مكرها على القول وقد أمكنه صرف الضمير إلى غيره فمتى لم يفعله فقد اختار إظهار الكفر من غير إكراه فلزمه حكم الكفر.

"جب دل میں اس (محمد) نام کا کوئی شخص آئے تو حتی الامکان اسی کو مراد لے کر (نازیبا) بات کی جائے اگر دل میں آنے کے باوجود ایسا نہیں کیا بلکہ خود حضور ﷺ کو مراد لے کر نازیبا بات کی تو کافر ہو جائے گا، امام محمد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب کفار کسی مسلمان کو حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے پر مجبور کریں اور اس کے دل میں کوئی اور ہم نام آئے اس کے باوجود خاص حضور ﷺ ہی کو مراد لے تو وہ کافر ہے۔۔امام جصاص فرماتے ہیں کہ جب دوسرا ہم نام ذہن میں آیا تو حضور ﷺ کے علاوہ کسی کی طرف اس بات کو پھیرنا ممکن تھا کیونکہ اس کو تو صرف اس بات کے کہنے پر مجبور کیا گیا تھا، حضور ﷺ کی طرف ضمیر لوٹانے یعنی حضور ﷺ مراد لینے پر مجبور نہیں کیا گیا، تو اس کے باوجود حضور ﷺ مراد لینے سے معلوم ہوا کہ اس نے مجبوری کے بغیر ہی کفر کو ترجیح دی اس لئے اس پر کفر کے احکام جاری ہوں گے۔"[1]

---

[1] أحكام القرآن للجصاص ،سورة النحل، رقم الاية:١٠٦، ج٣ص٢٨٣.

اس عبارت سے واضح ہوا کہ جب اصل کفر سے بچنے کی کوئی تدبیر ذہن میں آئی اوراس پر عمل کرنے کی صورت میں جان بخشی بھی ممکن ہے تواسی تدبیر پر چلنا ضروری ہے، اس کو چھوڑ کر اصل کفریہ فعل کرنا موجب کفر ہے کیونکہ کفریہ عمل کی اجازت یقیناً موجب کفر تھی، اکراہ کی وجہ سے صرف ظاہری طور پراس کی اجازت دی گئی مگر جب بچنے کی راہ میسر ہے تو خواہ مخواہ اسی کفریہ راستے کاانتخاب رضامندی اور اختیار کی دلیل ہے جو کہ بے شک کفر ہے۔

تیسرا مانع: تاویل

تکفیر کے باب میں ایک بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ تاویل کا ہے جس کو کماحقہ سمجھنے کے بغیر تکفیر کا مسئلہ سمجھنا نہایت مشکل ہے۔

لغوی تحقیق

تاویل باب تفعیل کا مصدر ہے، اس کا مادہ "اول" ہے جس کا معنی ہے رجوع یعنی واپس ہونا اور لوٹنا، مختلف علوم وفنون میں یہ لفظ مختلف مفاہیم کے لئے استعمال ہوتا ہے، علم تفسیر، اصول فقہ اور رمل وغیرہ سبھی کے ضمن میں یہ لفظ ایک الگ اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتا ہے جس کی مختصر سی وضاحت علامہ محمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کشاف اصطلاحات الفنون میں ذکر فرمائی ہے۔[1]

متکلمین کی اصطلاح

متکلمین کی اصطلاح میں "قرآن وسنت کے نصوص کو اپنے متبادر معانی سے پھیر کر دیگر ممکنہ معانی پر حمل کرنے "کو تاویل کہا جاتا ہے۔

پھر اس کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ یہ دوسرا ممکنہ معنی بھی قرآن وسنت کے نصوص سے متصادم نہ ہو بلکہ دلائل سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

---

[1] کشاف اصطلاحات الفنون، حرف التاء، تحت لفظ "التفسیر" ج ۱ ص ۴۹۲.

۲۔ لفظ کو اپنے ظاہری معنی سے ہٹا کر دوسرے پر حمل کرنے کی کوئی معتبر دلیل موجود نہ ہو۔

علامہ سیف الدین الآمدی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

أما التأويل من حيث هو تأويل مع قطع النظر عن الصحة والبطلان، هو حمل اللفظ على غير مدلوله الظاهر منه، مع احتماله له.

"تاویل اس کو کہا جاتا ہے کہ لفظ کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر کسی ایسے معنی پر حمل کیا جائے جس کا یہ لفظ احتمال بھی رکھتا ہو۔"[1]

یہ تو مطلق تاویل کی تعریف تھی، لیکن جیساکہ اوپر تحریر کیا گیا، تاویل کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ تاویل ہے جس کی شریعت کی طرف سے اجازت ہے اور دوسری تاویل وہ ہے جو ناجائز ہے، اگر کسی نص سے دوسرا کوئی ایسا معنی مراد لیا جائے جو کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو اور خود نص میں بھی اس کا احتمال ہو تو تاویل کی یہ قسم جائز ہے اور اگر ایسا معنی مراد لینے کا دعویٰ کیا جائے جو نہ قرآن وسنت سے میل کھاتا ہو نہ ہی کلام عرب میں اس کا احتمال ہو تو یہ تاویل مردود ہے۔

علامہ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ تعالیٰ جائز تاویل کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

وفي الشرع: صرف اللفظ عن معناه الظاهر إلى معنى يحتمله، إذا كان المحتمل الذي يراه موافقًا للكتاب والسنة،

---

[1] الإحكام في أصول الأحكام للآمدي،النوع الثانی، الصنف التاسع، مقدمة، ج٣ص٥٣.

"شریعت کی اصطلاح میں تاویل یہ ہے کہ لفظ کو اس کے ظاہری مفہوم سے پھیر کر کوئی اور معنی مراد لیا جائے جس کا یہ لفظ احتمال بھی رکھتا ہو، بشرطیکہ یہ دوسرا معنی محتمل قرآن وسنت کے مطابق ہو۔"[1]

علامہ آمدی رحمہ اللہ بھی لکھتے ہیں:

والحق في ذلك أن يقال:

وأما التأويل المقبول الصحيح فهو حمل اللفظ على غير مدلوله الظاهر منه مع احتماله له بدليل يعضده.

حق بات یہ ہے کہ صحیح اور مقبول تاویل اس کو کہا جاتا ہے کہ لفظ کو اس کے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر کسی ایسے معنی پر حمل کیا جائے جس کا یہ لفظ احتمال بھی رکھتا ہو، اور اس کی تائید میں کوئی دلیل بھی موجود ہو۔"[2]

فوائد قیود

اس تعریف میں کل تین ضروری قیود لگائے گئے:

۱۔ پہلا قید یہ لگایا گیا کہ "لفظ کے اپنے ظاہری مفہوم سے ہٹ کر کوئی اور مفہوم مراد لینا" لٰہذا اگر کسی لفظ کے دو معانی ہوں اور دونوں مفہوم پر اس لفظ کا اطلاق بھی ہوتا ہو تو ان میں سے کوئی ایک معنی مراد لینا تاویل نہیں کہلائے گا۔

۲۔ "مع احتماله له" یعنی لفظ سے جو مفہوم مراد لیا جارہا ہو، ضروری ہے کہ لفظ میں اس مفہوم کا احتمال بھی موجود ہو، یعنی لغت عرب کے حوالے سے یہ دوسرا

---

[1] التعريفات، باب التاء، ص: ٥٠.

[2] المصدر السابق.

غیر متبادر معنی مراد لینا ممکن ہو، لہٰذا اگر کوئی ایسا خود ساختہ معنی مراد لیا جائے جس کی تائید کلام عرب سے نہ ہوتی ہو تو وہ تاویل نہیں بلکہ تحریف کہلائے گا۔

۳۔"بدلیل یعضده"یعنی متبادر معنی چھوڑ کر دوسرا معنی مراد لینے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کوئی ایسی دلیل موجود ہو جس سے اس احتمالی معنی کی تائید ہوتی ہو، اگر اس قسم کی کوئی دلیل موجود نہ ہو تو محض احتمال برائے احتمال کی وجہ سے متبادر معنی چھوڑنا درست نہیں ہوگا، یہ تاویل جائز نہیں بلکہ تاویل فاسد کہلائے گی۔

تاویل کے جائز یا ناجائز ہونے کی اصولی بحث

قرآن وسنت انسانیت کی ہدایت اور اس کی درست رہنمائی کے لئے بھیجے گئے، دونوں کی زبان فصیح عربی ہے خود قرآن کریم میں بار بار اس بات کی تاکید فرمائی گئی کہ یہ آسان عربی زبان میں نازل کی گئی ہے، چونکہ خیر کے ان دونوں سرچشموں کے اول اور براہ راست مخاطب عرب تھے اس لئے ان ہی کی زبان میں ان کو ہدایات دی گئی۔

نصوص کے الفاظ اور اسلوب دونوں ہی چیزیں عرب کے فہم اور ان کی زبان کے مطابق تھے تاکہ وہ اس سے ہدایت حاصل کریں، اور یہ تبھی ہو سکتا ہے جب الفاظ سے عام متبادر معانی ہی مراد ہوں، کیونکہ غیر متبادر معانی ان کو معلوم نہ تھے نہ ہی اس کے لئے قاعدہ وقانون مقرر ہے بلکہ ایک ہی لفظ سے ہر شخص اپنی پسند کے مطابق معنی مراد لے سکتا ہے جس کے بعد منشاء خداوندی بالکل مجہول رہ جائے گا، لہٰذا اس قسم معانی مراد لینے میں تکلیف بالمحال لازم آجاتا ہے کہ مثلاً"اقیموا الصلاۃ" کے ذریعے "صلوۃ" کو فرض کیا گیا، لیکن اس سے مراد کیا ہے؟ اس کے اقامت کا طریقہ کار کیا ہے؟ یہ بالکل

نہیں بتایا گیا نہ ہی مخاطب کو پہلے سے معلوم ہے۔ یہ تکلیف بمالایطاق ہے جس سے شریعتِ اسلام بالکل پاک وصاف ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ واضح اعلان فرمایا کہ:

{وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللَّهُ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ[1]}

"اور ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا تاکہ ان سے (احکام الہیٰہ کو) بیان کریں"

ہر رسول کو اپنے قوم کی زبان میں بھیجنے کا فائدہ یہی ہے جو اس آیت میں ذکر کیا گیا کہ جب داعی اور مدعو کی زبان ایک ہو تو دعوت دینے میں آسانی رہے گی اور قوم کے پاس یہ عذر نہیں بچے گا کہ ہم احکام خداوندی کو سمجھ نہیں سکے، کیونکہ تمام رسول اپنی قوم ہی کی بولی میں دعوت دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام اسی زبان میں ان لوگوں کو بتلاتے ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قوم کے اسلوب وزبان ہی میں گفتگو فرماتے ہیں۔

نقل خلافِ اصل ہے

اسی لئے تمام متکلمین نے باہمی اتفاق سے یہ قانون مقرر کیا کہ نقل خلافِ اصل ہے، اس کا حاصل بھی وہی ہے جو ابھی تحریر کیا گیا کہ کسی لفظ سے وہی معنی مراد لیا

---

[1] [إبراهيم: ٤].

جائے گا جو عرب کے ہاں متوارث چلا آ رہا ہو، کسی معتبر دلیل کے بغیر لفظ کو اپنے معنی سے ہٹا کر دوسرے معنی کا دعویٰ کرنا ضابطہ کے خلاف ہے۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لأن النقل خلاف الأصل لا يصار إليه إلا بدليل[1]

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے معقولی انداز میں لکھا کہ:

إنك إذا فتحت هذا الباب، وهو أن تريد باللفظ غير ما وضع اللفظ له ويدل عليه في التفاهم لم يكن لما تريد به حصر

"جب آپ ایک بار اس دروازے کو کھولدیں گے یعنی لفظ سے اپنی اصل معنی اور عرفی مفہوم کے علاوہ چیزیں مراد لیں گے، تو ایک مرتبہ اس دروازے کو کھولنے کے بعد کوئی حصر ہی نہیں رہے گا (اور تمام نصوص میں یہ ترمیم جاری ہو جائے گی جس سے دین بازیچہ اطفال بن کر رہ جائے گا)۔"[2]

تاویل کے جائز ہونے کی شرائط

تاویل کے جائز ہونے کے لئے بنیادی طور پر تین شرائط ہیں:

پہلی شرط: لغوی معنی کا متعذر ہونا

اصول یہ ہے کہ قرآن وسنت کے تمام نصوص سے اپنا متبادر معنی ہی مراد لیا جائے گا مگر جہاں کہیں ظاہری معنی مراد نہ لیا جاسکے وہاں مناسب تاویل کی جائے گی مثلاً آیت کریمہ میں ہے "کل شئی ھالک الا وجھه"

---

[1] شرح المقاصد في علم الكلام، ج٣ص٤٢٦.

[2] الاقتصادفي الاعتقاد، القطب الاول، الدعوى السابعة، ص:٣٤.

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف "وجہ" کی نسبت کی گئی اور ظاہر ہے کہ "وجہ" جسم ہی کی ہو سکتی ہے تو گویا وجہ کو ثابت کرنا جسم ہونے کو مستلزم ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جسمیت منسوب کرنا عقلاً اور شرعاً نا قابل تسلیم ہے کیونکہ جسم کے لئے مختلف اشیاء کا محتاج رہنا ضروری ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے یقیناً پاک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس لفظ کا متبادر معنی چہرہ ہی ہے مگر یہ ظاہری معنی یہاں مراد لینا عقلاً مشکل ہے، بلکہ بعض نصوص مثلاً" لیس کمثلہ شئی" بھی اس تصور کی نفی کر رہے ہیں، اب ایک طرف تو یہ مشکل ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمیت سے قطعاو یقینا پاک ہے اور دوسری طرف آیت کریمہ کا متبادر معنی ہے جو بظاہر اس قطعی قاعدہ کے خلاف ہے، اس ظاہری معنی کو مراد لینے کی صورت میں اس یقینی قاعدہ کی مخالفت کرنی پڑتی ہے اور قاعدہ کے لحاظ کرنے میں متبادر معنی چھوٹ جاتا ہے۔

تطبیق کی آسان اور اہون صورت یہی ہے کہ تاویل کا سہارا لیا جائے یعنی یہ قرار دیا جائے کہ اگرچہ "وجہ" کا لغوی معنی چہرہ ہی ہے، اہل زبان نے اس کو اسی معنی کے لئے استعمال کیا، لیکن یہاں اس سے یہ معنی مقصود نہیں بلکہ اس کے علاوہ دوسرا مناسب معنی مراد ہے جو ذاتِ الٰہی کے شایانِ شان ہے مثلاً امکان کی حد تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں اس سے مراد قدرتِ خداوندی ہے، یہی تاویل ہے۔

تاویل ہی کا سہارا لینے کی وجہ

تطبیق کی بظاہر یہ صورت بھی ممکن ہے کہ تاویل کو اختیار کرنے کے بجائے اوضاع کے اختلاف کا سہارا لیا جائے یعنی یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کی اصطلاح میں "وجہ" ایک خاص معنی کے لئے وضع کیا گیا، لہٰذا اگرچہ متبادر معنی اس لفظ کا چہرہ ہی ہے

لیکن قرآن کریم میں جہاں کہیں بھی یہ لفظ استعمال ہو گا وہاں اس سے وہی خاص معنی ہی مقصود ہو گا جس کے لئے قرآن کریم نے یہ اصطلاح مقرر کی۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس پُر تکلف راہ پر چلنے سے تاویل کو اختیار کرنا اسلم ہے، کیونکہ الفاظ سے عام متبادر معانی لینا ایک ایسا اتفاقی امر ہے جس پر مزید دلیل کی ضرورت نہیں، اگر ایک بار بھی یہ دروازہ کھلے تو دین کی بنیاد ہی منہدم ہو جائے گی، تاریخ کے اوراق میں باطنیہ کے الحاد کی ایک بڑی بنیاد یہ بھی تھی، اس لئے بلا دلیل نئی اصطلاح کا دعوی کرنا درست نہیں۔

علامہ کفوی کی وضاحت

علامہ ابوالبقاء الکفوی (۱۰۹۴ھ) رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

وتأويل الظواهر أولى من مخالفة الأوضاع اللغوية لوجهين: الأول: أن تأويل الظواهر متفق عليه بخلاف مخالفة الأوضاع، ومخالفة ما اتفق على جواز مخالفته أولى من مخالفة ما لم يتفق على مخالفته.

والثاني: أن مخالفة الظواهر في الشرع أكثر من مخالفة الأوضاع اللغوية عند القائلين بمخالفة الأوضاع، وإن أكثر الظواهر مخالفة، وأكثر الأوضاع مقررة، وذلك يدل على أن المحذور في مخالفة الأوضاع أعظم منه في مخالفة الظواهر فكان مخالفة الظواهر أولى.

لغوی اوضاع کی مخالفت سے الفاظ کے ظاہر میں تاویل کرنا ہی بہتر ہے، اس کی دو وجہیں ہیں:۔

ا: تاویل کا جائز ہونا ایک اتفاقی امر ہے جبکہ اوضاع کی مخالفت متفق نہیں، اور ظاہر ہے کہ اتفاقی طور پر جائز مخالفت کو اختیار کرنا اس مخالفت سے بہتر ہے جس کے جواز میں اختلاف ہو۔

۲: جن کے نزدیک اوضاع کی مخالفت جائز بھی ہے ان کے نزدیک بھی شرعی نصوص میں تاویل کا تحقق زیادہ ہے، بیشتر ظاہری نصوص میں مخالف ہوتی ہیں جبکہ لغوی اوضاع مسلم رہتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تاویل کے مقابلے میں اوضاع کے خلاف دعویٰ کرنا زیادہ برا ہے اس لئے نصوص کے ظاہر میں تاویل ہی بہتر ہے۔"[1]

ضرورت کے بغیر نصوص میں تاویل

اہل سنت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ عام حالات میں نصوص سے اس کے متبادر معانی ہی مراد ہوں گے، بلا ضرورت ان معانی کو چھوڑ کر دوسرے مفاہیم کو مراد لینا اور اس کے لئے تاویل کا سہارا لینا درست نہیں۔

چنانچہ شرح العقائد میں علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

(والنصوص) من الكتاب والسنة تحمل (على ظواهرها) ما لم يصرف عنها دليل قطعي --(فالعدول عنها) أي عن الظواهر (إلى معان يدعيها أهل الباطن) -(إلحاد) أي ميل وعدول عن الإسلام واتصال واتصاف بكفر،لكونه تكذيباً للنبي عليه السلام فيما علم مجيئه به بالضرورة.

"قرآن وسنت کے نصوص ظاہر ہی پر محمول رہے گی جبکہ کوئی قطعی دلیل اس کے خلاف موجود نہ ہو، لہٰذا ظاہر کو چھوڑ کر اہل باطن جیسے معانی مراد لینا الحاد اور گمراہی

---

[1] الكليات، باب التاء،ص٢٦٢.

ہے، یہ اسلام سے اعراض اور کفر کو اختیار کرنا ہے کیونکہ یہ در حقیقت ضروریات دین میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب ہے"[1]

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ کسی بھی دلیل کے بغیر بلا وجہ نصوص میں تاویل کرنا اور ان کے ظاہری معنی سے اعراض کرنا در حقیقت اس نص کے تکذیب کے مترادف ہے، کیونکہ جب یہ قاعدہ مسلم ہے کہ نصوص سے عام متبادر معنی ہی مراد لیا جائے گا، تو اس ضابطہ کے ہوتے ہوئے اسی متبادر معنی کو مراد نہ لینا تکذیب ہے۔

کن حالات میں نصوص کے اندر تاویل کی جاسکتی ہے؟

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ ضرورت کے بغیر نصوص میں تاویل درست نہیں، ضرورت کے وقت ہی نصوص میں "تاویل" کی جائے گی۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس ضرورت سے کیا مراد ہے؟ کن وجوہات کی بنیاد پر الفاظ کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر دوسرے معانی مراد لئے جاسکتے ہیں؟ تاویل کی ضرورت کب پڑتی ہے؟

متکلمین کی ذکر کردہ تفصیلات کا خلاصہ

تو اس کے متعلق متکلمین کی ذکر کردہ تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی یقینی دلیل لفظ کے ظاہری معنی مراد لینے سے مانع ہو تب ہی تاویل کی ضرورت پڑے گی، یقینی دلیل کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

---

[1] شرح العقائد النسفية،ص٩٦.

ا۔ عقلی دلیل جو قطعی ہو، جیسا کہ مندرجہ بالا مثال میں ہے کہ بعض نصوص میں اللہ تعالیٰ کے لئے جسم کے مختلف صفات بظاہر وارد ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا اس سے منزہ ہونا عقلا ضروری ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لئے احتیاج لازم آجائے گی جو کہ موجب نقص ہے، اس عقلی دلیل کی وجہ سے نصوص کے متبادر معانی کو چھوڑ کر دوسرے معانی کو مراد لیا گیا۔

واضح رہے کہ اسماء وصفات کے نصوص میں تاویل کرنے کی بنیاد صرف عقل ہی نہیں بلکہ بہت سی نصوص بھی اس باب میں موجود ہیں، مثلاًلیس کمثله شئی۔

۲۔ قطعی نص:

یعنی اگر کسی نص کے ظاہری الفاظ کا مفہوم دوسری نصوص کے خلاف ہو، اور وہ دوسری نصوص اس خاص نص کے مقابلے میں قطعی بھی ہوں، تو اس وقت نصوص کے اس ظاہری تضاد کو ختم کرنے کے لئے تاویل کا سہارا لیا جائے گا۔

۳۔ یقینی اجماع:

جمہور کے نزدیک اجماع بھی ایک قطعی دلیل ہے، لہٰذا اگر کسی نص کے ظاہری الفاظ کسی یقینی اور قطعی اجماع کے خلاف وارد ہوں تو دونوں دلائل میں تطبیق دینے کے

لئے تاویل کریں گے۔

علامہ فرہاروی کی مختصر اور جامع عبارت

علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ شرح العقائد کی مندرجہ بالا عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قوله"تحمل علي ظواهرها" اي علي المعاني الظاهرة بحسب الوضع اللغوي الشائع المشهور في اهل الاسلام، قوله:"ما لم يصرف عنها دليل قطعي"من برهان عقلي اواجماع او نص قاطع.

"ظاہر سے وہ عام لغوی معنی مراد ہے جو مسلمانوں کے درمیان مشہور ہو، اور دلیل قطعی سے کوئی عقلی دلیل، اجماع یا قطعی نص ہے"[1]

بحث کا حاصل

خلاصہ کلام یہ ہے کہ جہاں دلائل میں تعارض ہو، لفظ کا متبادر معنی مراد لینا بھی عام اصول و قواعد کا تقاضا ہے لیکن کوئی دلیل ایسی بھی موجود ہو جو اس راہ میں حائل ہو، ان دونوں دلائل میں تعارض کے وقت دیکھا جائے گا۔

اگر عام مفہوم مراد لینے کے مقابلے میں دوسرے دلائل قوی اور غالب ہوں تبھی جا کر تاویل کی جائے گی اور الفاظ کے ظاہری معنی کو ترک کیا جائے گا، ورنہ اگر وہ دلیل اس درجہ مضبوط نہ ہو تو زبان و بیان کے عام اصول کے مطابق اس سے متبادر معنی ہی مقصود لیا جائے گا، بلا ضرورت تاویل کا سہارا لینا درست نہیں۔

علامہ آمدی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

وأن يكون الدليل الصارف للفظ عن مدلوله الظاهر راجحا على ظهور اللفظ في مدلوله ليتحقق صرفه عنه إلى غيره، وإلا فبتقدير أن يكون مرجوحا لا يكون صارفا ولا معمولا به اتفاقا، وإن كان مساويا لظهور اللفظ في الدلالة من غير ترجيح، فغايته إيجاب التردد بين الاحتمالين على السوية، ولا يكون ذلك تأويلا غير أنه يكتفى

---

[1] النبراس ص٣٣٧.

بذلك من المعترض إذا كان قصده إيقاف دلالة المستدل، ولا يكتفى به من المستدل دون ظهوره، وعلى حسب قوة الظهور وضعفه وتوسطه يجب أن يكون التأويل.

"تاویل کے درست ہونے کیلئے یہ بھی شرط ہے کہ تاویل کی متقاضی دلیل اس دلیل سے راجح ہو جو ظاہری معنی مراد لینے کا تقاضا کرتی ہے تاکہ ظاہری معنی کو چھوڑنا درست ہو، ورنہ توتاویل نہیں کی جائے گی، اگر دونوں دلائل قوت میں برابر بھی ہوں تو بھی زیادہ سے زیادہ یہی کیا جائے گا کہ دونوں احتمال لئے جا سکتے ہیں اور یہ کوئی تاویل نہیں ہے۔۔۔"[۱]

دوسری شرط: مؤول کی اہلیت

تاویل کے جائز ہونے کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ خود تاویل کرنے والا اس کا اہل بھی ہو، "متبادر معنی مراد لینے" کے عام اصول سے وہی شخص اعراض کر سکتا ہے جس میں اس کی اہلیت بھی موجود ہو، ہر شخص کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ نصوص کے اندر تاویلات کرتا پھرے ورنہ نصوص بازیچہ اطفال بن جائیں گیں۔

علامہ سیف الدین آمدی رحمہ اللہ تعالیٰ تاویل کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وشروطه: أن يكون الناظر المتأول أهلا لذلك.

ا: "ایک شرط یہ ہے کہ نصوص کو دیکھنے والا اور تاویل کرنے اس کام کا اہل بھی ہو"[۲]

---

[۱] الإحكام في أصول الأحكام للآمدي ،الصنف التاسع في الظاهر وتأويله،مقدمة في تحقيق معنى الظاهر والتأويل، ج٣ص٥٤.

[۲] نفس المصدر.

تیسری شرط: الفاظ میں تاویل کا احتمال

تیسری شرط یہ ہے کہ لفظ میں بھی اس معنی کا احتمال موجود ہو جو تاویل کے ذریعے مراد لیا جارہا ہو، زمین بول کر آسمان مراد لینا کسی عقل مند کا کام نہیں۔ علامہ آمدی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وأن يكون اللفظ قابلا للتأويل بأن يكون اللفظ ظاهرا فيما صرف عنه محتملا لما صرف إليه.

"(دوسری شرط یہ ہے کہ) لفظ بھی تاویل کے قابل ہو کہ اپنے معنی میں ظاہر ہو اور تاویلی معنی کا بھی احتمال رکھتا ہو"[1]

تکفیر کے باب میں تاویل کی اہمیت

تکفیر کے باب میں تاویل کا مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگر کوئی شخص اسلام کے کسی ثابت شدہ قطعی حکم کا انکار کرے تو اس سے وہ کافر ہو جاتا ہے لیکن اگر تاویل کرے تو اس کی تکفیر نہیں کی جاسکتی، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دور سے لے کر عصر حاضر تک مختلف فتنوں نے جنم لیا، ان میں سے بہت سے لوگوں نے اسلام کے بعض مشہور مسائل میں "تاویل" کر کے امت کے سواد اعظم کے مخالف موقف اپنایا، بلکہ بسا اوقات نصوص کے بھی مخالفت کی فضا پیدا ہو گئی لیکن امت نے اس کو کافر نہیں قرار دیا، کیونکہ وہ لوگ صراحتاً انکار نہیں کرتے تھے بلکہ تاویل کرتے تھے۔

---

[1] نفس المصدر.

علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ خوارج کے کرتوت ذکر کرنے کے بعد اس بات کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرات فقہاء کرام نے ان تمام تر گمراہیوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان کو کافر کیوں قرار نہیں دیا، آپ لکھتے ہیں:

قد عرف من مذهب الخوارج تكفير كثير من الصحابة، ومن بعدهم، واستحلال دمائهم، وأموالهم، واعتقادهم التقرب بقتلهم إلى ربهم، ومع هذا لم يحكم الفقهاء بكفرهم؛ لتأويلهم. وكذلك يخرج في كل محرم استحل بتأويل مثل هذا.

"خوارج کا موقف مشہور ہے کہ وہ صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے تابعین کو کافر قرار دیتے تھے، ان کے مال وجان کو مباح سمجھتے تھے بلکہ ان کے قتل کرنے کو موجب ثواب یقین کرتے تھے، لیکن ان سب کچھ کے باوجود فقہاء کرام نے ان کے کافر ہونے کا فیصلہ نہیں کیا کیونکہ (وہ لوگ یہ سب کچھ ایک) تاویل کے تحت کرتے تھے، یہی حکم ہر اس حرام کام کا ہے جس کو اس جیسی تاویل کے ساتھ جائز سمجھا جائے۔"[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اہل علم کہتے ہیں کہ ہر تاویل کرنے والا اپنے تاویل کرنے میں معذور ہے، گناہگار نہیں ہے بشرطیکہ کلام عرب میں اس تاویل کی گنجائش ہو اور اس کی کوئی علمی بنیاد بھی موجود ہو۔"[2]

---

[1] المغني لابن قدامة ، كتاب المرتد،فصل اعتقد حل شيء أجمع على تحريمه، ج٩ص١٢.

[2] فتح الباري،قوله باب ما جاء في المتأولين، قبيل كتاب الاكراه، ج١٢ص٣٠٤.

"تاویل" تکذیب نہیں بلکہ تصدیق کی فرع ہے

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک پورا رسالہ لکھا ہے کہ نصوص میں تاویل تکذیب سے قطعاً مختلف چیز ہے بلکہ تاویل تصدیق ہی کی فرع ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص تاویل کرے تو اس کو کافر یا منکر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آپ نے تحریر فرمایا کہ "ایمان" تصدیق کا نام ہے اور تصدیق کے پانچ مختلف مراتب و درجات ہیں، ان سب مراتب کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں:

اعلم ان من نزل قولامن اقوال صاحب الشرع علي درجة من هذه الدرجات فهومن المصدقين، وانما التكذيب ان ينفي جميع هذه المعاني ويزعم ان ماقاله لامعني له وانماهوكذب محض۔۔ولايلزم الكفرللمؤولين مادامو يلازمون قانون التاويل.

"یاد رکھے کہ جس نے شریعت کی بات کو ان پانچوں درجات میں کسی بھی درجہ میں برقرار رکھ کر قبول کیا تو اس نے تصدیق کی (اور مسلمان کہلائے گا) تکذیب (و کفر) تو یہ ہے کہ ان تمام درجات کا انکار کرے اور یہ خیال کرے کہ (معاذ اللہ) شریعت کے ان نصوص کا کوئی معنی نہیں بلکہ صاف جھوٹ ہے، تاویل کرنے والے جب تک تاویل کے ضابطہ میں رہے تو کافر نہیں ہوں گے۔"[1]

جمہور امت کا موقف

علامہ ابوالبقاء کفوی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ جمہور امت کا موقف نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] فيصل التفرقة بين الاسلام والزندقة، الفصل الخامس: القول في معني تكذيب الشارع، ص٤١.

مختار جمهور أهل السنة منهما عدم إكفار أهل السنة من المبتدعة المؤولة في غير الضرورية لكون التأويل شبهة، كما في " خزانة " الجرجاني، و " المحيط " البرهاني،و"أحكام"الرازي،ورواه الكرخي والحاكم الشهيد عن الإمام أبي حنيفة والجرجاني عن الحسن بن زياد وشارح " المواقف والمقاصد " والآمدي عن الشافعي والأشعري لا مطلقا.

"اہل سنت کا مختار مذہب یہ ہے کہ جو اہل بدعت ضروریات دین کے علاوہ دیگر مسائل میں تاویل کرتے ہیں، وہ ان کو کافر نہیں کہتے کیونکہ تاویل ایک شبہ ہے جیسا کہ متعدد کتابوں میں لکھا ہے۔"[1]

ضروریات دین میں تاویل کوئی عذر نہیں

تاویل کے جائز ہونے کی شرائط کے ذیل میں یہ بات ذکر ہو چکی ہے کہ جب تک کسی نص سے اس کا لغوی متبادر معنی مراد لیا جا سکے، اس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو، تو یہی متبادر معنی ہی مراد ہوگا، بلا ضرورت اس عام معنی کو چھوڑ کر تاویل کے سہارے دوسرے معانی مراد لینے کا دعوی کرنا جائز نہیں، البتہ جہاں اس عام قانون کے مقابلے میں اس سے زیادہ مضبوط دلیل موجود ہو اور وہ اس متبادر معنی مراد لینے سے مانع ہو تو وہی تاویل کی جائے گی۔

اس اصول کے مطابق ضروریات دین میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں رہ پاتی، کیونکہ جیسا کہ آئندہ باب رابع میں واضح ہو جائے گا کہ "ضروریات دین" دین اسلام کے ان بنیادی احکام کا نام ہے جس کا معنی ومفہوم اسلامی معاشرے میں اتنا عام ہو کہ ہر

---

[1] الكليات، حرف الكاف، الكفر (ص: ٧٦٦).

خاص وعام کو اس کا پتہ ہو، اس کے جاننے کے لئے کوئی بہت زیادہ علم کی ضرورت نہ ہو بلکہ دیندار طبقے کے عوام وخواص سب کو اس کا علم ہو تو ایسے احکام جوں کے توں تسلیم کرنے ضروری ہیں، نصوص میں جس طرح حکم وارد ہوا اسی طرح اس پر ایمان واعتقاد رکھنا ضروری ہے، اس کے معنی ومفہوم میں اپنی طرف سے تاویلات کرنا جائز نہیں۔

ختم نبوت میں تاویل کے کفر ہونے کی اصل وجہ

مثلاً متعدد نصوص میں حضور ﷺ کی ایک صفت بیان فرمائی گئی کہ آپ ﷺ "خاتم النبیین" ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

"محمد علیہ السلام تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔"[1]

اس لفظ کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ سب سے آخری نبی ہیں، آپ ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا، لفظ کے اسی متبادر معنی پر قرن اول سے لے کر عصر حاضر تک تمام امت کا اتفاق رہا ہے، پوری امت نے ان نصوص کی وجہ سے اس بات پر اجماع کیا کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آسکتا۔

اب اگر کوئی شخص اس لفظ کو تسلیم کرے کہ حضور ﷺ واقعۃً خاتم النبیین ہے لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا بلکہ ظلی وبروزی کی تاویل کرکے آپ کے بعد بھی نئے نبوت کا قائل رہے تو وہ یقیناً کافر ہوگا۔

---

[1] سورة الاحزاب، رقم الاية: ٤٠.

تاویل اختیار ہی تب کی جاتی ہے جہاں کہیں لفظ کا اپنا ظاہری معنی مراد لینا متعذر ہو اور یہاں ایسی کوئی مشکل نہیں، دوسری طرف جب اس کے اسی متبادر معنی پر پوری امت متفق ہے، اور یہ اتفاق صرف علماء تک ہی منحصر نہیں بلکہ دیندار عوام بھی یہی جانتے مانتے ہیں تو علماء اور غیر علماء کے اس اعتقاد و تسلیم سے اسی متبادر مفہوم میں مزید تاکید پیدا ہو گئی اور اب یہ مسئلہ ان بنیادی مسائل کی اہمیت اختیار کر گیا جس کو "ضروریاتِ دین" سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا انکار کرنا یا امت کے متفقہ موقف کے خلاف کوئی نیا مفہوم کشید کرنا دونوں برابر ہے۔

امام صاحب کے کل فتاویٰ تکفیر کی تعداد

قاضی کمال الدین بیاضی رحمہ اللہ اپنی مشہور کتاب اشارات المرام میں لکھتے ہے کہ امام صاحب نے کل تیئس (۲۳) مسائل میں کفر کا فتویٰ دیا ہے ان میں سے چھ مسائل تو ایسے تھے جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف صراحۃً کوئی نقص منسوب کیا گیا تھا، سولہ (۱۶) مسائل میں ضروریات دین کے انکار کی وجہ سے کفر کا حکم دیا جبکہ ایک مسئلہ ایسا تھا جہاں نہ اللہ تعالیٰ کی طرف کوئی نقص منسوب ہوا نہ ہی ضروریات دین کا انکار تھا، بلکہ اس صورت میں تکفیر کی بنیاد ضروریات دین میں تاویل تھی اور اسی لئے آپ نے کفر کا فیصلہ فرمایا۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ضروریات دین میں تاویل کوئی عذر نہیں اور یہ تاویل تکفیر سے مانع نہیں ہے۔

---

[1] اشارات المرام، ص ۵۱، زمزم پبلشرز، کراچی۔

ضروریات دین میں تاویل کے کفر ہونے کی بنیادی وجہ

ضروریاتِ دین میں تاویل کے کفر ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں دو چیزیں ہیں:

ا۔ شریعت سے اس عقیدے کا ثبوت۔

۲۔ اس کا مفہوم۔

اور یہ دونوں باتیں متواتر ہونے کی وجہ سے یقینی اور قطعی ہوتی ہیں بلکہ عوام و خواص میں مشہور ہو جانے کی وجہ سے "ضروری" بن جاتی ہیں، ان دونوں باتوں کا دین اسلام میں سے ہونا جب عوام و خواص سب میں عام ہو تو اس کی وجہ سے یہ ضروریات دین میں شامل ہو جاتے ہیں جس کی تاویل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا جو مفہوم مسلمان طبقہ میں متوارث چلا آرہا ہے، یہ غلط ہے، تو چونکہ اس میں اس مفہوم کا بھی انکار ہوا جو بجائے خود ضروریاتِ دین میں سے تھا، اس لئے یہ کفر ہے۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(فالعدول عنها) أي عن الظواهر (إلى معان يدعيها أهل الباطن) -(إلحاد) أي ميل وعدول عن الإسلام واتصال واتصاف بكفر، لكونه تكذيباً للنبي عليه السلام فيما علم مجيئه به بالضرورة.

"ظاہر کو چھوڑ کر اہل باطن جیسے معانی مراد لینا الحاد اور گمراہی ہے، یہ اسلام سے اعراض اور کفر کو اختیار کرنا ہے کیونکہ یہ درحقیقت ضروریات دین میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب ہے"

خط کشیدہ عبارت سے واضح ہوا کہ جب نصوص کا ایک مفہوم دلیل کے اعتبار سے متعین ہے تو بلا دلیل اس مفہوم سے اعراض کرنا اور اس کے مقابلے میں دوسرے

مفاہیم مراد لینے کا دعوی کرنا اس نص کی تکذیب ہے، گویا ایسا کرنے والا اس نص کو درست تسلیم ہی نہیں کرتا، اور جیسا کہ تحریر کیا گیا کہ ضروریات دین کا مفہوم اجتماعی تواتر اور توارث سے ثابت ہوتا ہے جو قطعی ہے، اس لئے اس میں تاویل کرنا اور اس کو اپنے متوارث مفہوم سے نکالنا در حقیقت اس کو تسلیم نہ کرنا ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں۔

علامہ بیاضی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جمہور اہل سنت نے ان مبتدع لوگوں کی تکفیر نہیں کی جو اہل قبلہ میں سے ہیں اور ضروریات دین کے علاوہ باقی مسائل میں تاویل کرتے ہیں، (یہ قید اس لئے لگائی کہ) ضروریات دین میں تاویل کرنا دیگر اصول میں تاویل کرنے کی طرح نہیں ہے کیونکہ بعض نصوص کے بارے میں یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے ظاہر پر محمول ہیں، تو ایسی نصوص میں تاویل کرنا در حقیقت نبی کریم ﷺ کی تکذیب کرنا ہے۔"[1]

امام العصر علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

أن التصرف في ضروريات الدين، والتأويل فيها، وتحويلها إلى غير ما كانت عليه، وإخراجها عن صورة ما تواترت عليه كفر، فإن ما تواتر لفظاً أو معنى، وكان مكشوف المراد، فقد تواتر مراده، فتأويله رد للشريعه القطعية، وهو كفر بواح، وإن لم يكذب صاحب الشرع، وإنه ليس فيه إلا الإستتابة.

---

[1] اشارات المرام من عبارات الامام، ص۵۱.

"ضروریات دین میں تصرف کرنا، تاویل کرنا، اس کو اپنے معہود معنی سے پھیرنا اور اپنے متواتر شکل سے نکالنا کفر ہے کیونکہ جو نص لفظا و معنا متواتر ہو اور اس کا معنی واضح ہو تو گویا کہ اس کا معنی مراد بھی متواتر ہے، لہٰذا اس میں تاویل کرنا قطعی شریعت کو رد کرنا ہے جو کہ واضح کفر ہے۔"[1]

تاویل معتبر ہونے کے متعلق ایک ضروری نکتہ

تاویل کے کفر نہ ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ خود کرنے والے نے اس کا قصد بھی کیا ہو، اگر کسی شخص نے دین کے کسی قطعی اور یقینی حکم کا انکار کیا جس کا انکار موجب کفر تھا اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو کافر کہا جائے لیکن ساتھ یہ احتمال بھی موجود ہو کہ شاید اس نے خالص انکار نہیں کیا بلکہ اس کے متعلق وارد شدہ نص کی تاویل کی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تکفیر سے احتیاط برتی جائے، تو اس صورت میں جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ خود انکار کرنے والے کے پیش نظر بھی تاویل تھا انکار مقصود نہ تھا، اس وقت تک اس کے اس عمل کو تاویل پر محمول نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کا حکم انکار ہی کا حکم ہوگا۔

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

قد كان الأئمة رحمهم الله يعتبرون إرادة التأويل وقصده، فجاء المتسللون فاعتبروا إيجاده، ففي "جامع الفصولين"، وعن مالك رحمه الله أنه سئل عن من أراد أن يضرب أحداً؟ فقيل له: ألا تخاف الله تعالى؟ فقال: لا، قال: لا يكفر، إذ يمكنه أن يقول: التقوى فيما أفعله له، ولو قيل له ذلك في معصيته، فقال: لا أخافه يكفر، إذ لا

[1] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، خاتمة، ص۱۲۸.

يمكنه ذلك التأويل اهـ. ونحوه في "الخانية" في قصة شداد بن حكيم مع زوجته، وذكرها في "طبقات الحنفية" من شداد عن محمد رحمه الله أيضاً، وهو أولى بالاعتبار مما ذكره من اعتبار مجرد الامكان، فإنه لا حجرفيه، وقالوا في الإكراه على كلمة الكفر: إن خطر بباله التورية ولم يور كفر، فاعتبروا القصد وإرادة التأويل في حقه، وإلا فالتمحل لا يعجز عنه أحد،

"متقدمین ائمہ کرام تاویل کے قصد کرنے کا اعتبار کرتے تھے بعد میں نا کمال لوگوں نے (صرف اس پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ) تاویل کے ایجاد کرنے کا بھی اعتبار کرنا شروع کیا (اور اگر تاویل کا صرف احتمال بھی موجود ہو تو بھی تکفیر سے روکتے ہیں) چنانچہ جامع الفصولین میں امام مالک رحمہ اللہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی دوسرے کو مارنا چاہتا تھا تو کسی نے کہا کہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا نہیں؟ مارنے والے نے جواب میں کہا کہ نہیں، تو امام مالک رحمہ اللہ نے جواب میں فرمایا کہ یہ شخص کافر نہیں ہوا کیونکہ کلمہ میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ مارنے ہی میں تقویٰ کا پہلو موجود ہے (یعنی کسی خاص ایسی صورت میں مار رہا ہو جس میں شرعاً مارنا لازم ہو اس لئے ایک ضروری حکم پورا کرنے مین ڈرنے کی کیا بات ہے؟) اور کسی گناہ کرتے وقت ایسا کہا جائے اور وہ کہے کہ نہیں، میں اللہ سے نہیں ڈرتا تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ پھر یہ تاویل ممکن نہیں۔۔۔ صرف تاویل کے امکان کو معتبر ماننے کے مقابلے میں اس اصول کا اعتبار کرنا زیادہ بہتر ہے کیونکہ تاویلات کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی، جس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے جو کہ اکراہ کے باب میں فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو کلمہ کفر کہنے پر مجبور کیا گیا اور اس کے دل میں دوسرا کوئی خیال آیا جس کے متعلق مذکورہ کلمہ کہنے میں کفر سے بچنا ممکن ہو پھر بھی اس نے اس خیال کا ارادہ نہیں کیا تو کافر ہو جائے گا، تو دیکھئے یہاں فقہاء کرام نے اس

دوسرے احتمال کے قصد وارادے کا اعتبار کیا (صرف نفس امکان کو معتبر نہیں مانا)
ورنہ تو تکلف کے ساتھ تاویل کرنا تو کوئی مشکل نہیں۔"[1]

اس سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص دین کے کسی مسئلے کا انکار کرے اور وہ مسئلہ ایسا ہو کہ قطعی طور پر ثابت بھی ہو تو اگرچہ انکار کی بنیاد تاویل بھی ہو سکتی ہو لیکن اگر خود منکر نے اس تاویل کی وجہ سے انکار نہیں کیا بلکہ بلا تاویل ہی انکار کر بیٹھا تو وہ کافر ہو جائے گا، صرف احتمالات کی موجودگی کی وجہ سے اس کو مسلمان نہیں کہا جاسکتا۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کفر واسلام کا اصل دار و مدار دلی تصدیق و تکذیب پر ہے، زبانی کلمات کو شریعت نے اسی کا قائم مقام ٹھہرایا، لہٰذا جب کوئی شخص جاننے کے باوجود اس قسم قطعی دینی احکام کا انکار کرتا ہے تو اصول کے مطابق وہ کافر ہو جائے گا، تاویل صرف ایک معروضی یا استثنائی شکل تھی، اور معروضی حالات اگر موجود نہ ہو تو اصول کے مطابق ہی احکامات جاری ہوتے ہیں۔

علامہ کشمیری اور جامع الفصولین کی عبارات میں تضاد

قاضی ابن سماوہ رحمہ اللہ نے امام ماتریدی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص ہمارے زمانے کے بادشاہ کو عادل کہے وہ کافر ہے کیونکہ اس زمانے کے بادشاہ عادل نہیں بلکہ واضح طور پر جابر و ظالم ہیں لہذا ان کو عادل کہنا گویا ان کے ظلم و جبر کو عدل کہنا ہے جو کہ کفر ہے۔

---

[1] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، ص: ٩٠.

بعض متاخرین حنفیہ نے اس کلمہ کو موجب کفر ماننے سے انکار کیااور وجہ اس کی یہ بیان کردی کہ اس میں تاویل کا احتمال موجود ہے کیونکہ عادل جس طرح منصف کا معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح جب اس کے صلہ میں "عن" آجائے تو اعراض کرنے اور مائل ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے گویا اس احتمال کے مطابق عادل اور ظالم کا مفہوم ایک ہی ہے، چونکہ ایک جائز اور مناسب احتمال موجود ہے اس لئے اس کلمہ کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینادرست نہیں۔

جامع الفصولین میں متاخرین کے اسی دلیل سے یہ استدلال کیا گیا کہ امکان تاویل بھی مانع تکفیر ہے یعنی اگر کسی کلام میں کفریہ احتمال کے علاوہ بھی کوئی احتمال موجود ہو تو اس کلام کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا جائز نہیں ہے اگرچہ خود متکلم نے اس تاویل کا ارادہ نہ کیا ہو، چنانچہ جامع الفصولین میں لکھا ہے کہ:

> أقول: هذا نص على أن مجرد إمكان التأويل يمنع التكفير وإن لم يظهر التأويل وعلى هذا ينبغي أن لا يكفر في مواضع كثيرة مما قيل بكفره فليتأمل.
>
> بعض متاخرین کی یہ توجیہ اس بات کی تصریح ہے کہ صرف کسی جائز تاویل کا احتمال بھی مانع تکفیر ہے اگرچہ تاویل پوری طرح واضح نہ بھی ہو۔"[1]

---

[1] جامع الفصولين، الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية، ج٢ص١٧٤.

اکفار الملحدین اور جامع الفصولین کی ان دونوں عبارات میں تضاد ہے، "اکفار" میں نفس تاویل کو مانع تکفیر نہیں کہا بلکہ ارادہ تاویل کو ضروری قرار دیا ہے جبکہ جامع الفصولین میں نفس تاویل کو بھی مانع تکفیر قرار دیا گیا ہے۔

تطبیق

دونوں آراء کو سامنے رکھتے ہوئے بظاہر یہی تطبیق مناسب معلوم ہوتی ہے کہ "اکفار" کے موقف کو کفر پر حمل کیا جائے اور جامع الفصولین کی عبارت کو اپنے ظاہر پر رکھا جائے اور اس سے تکفیر ہی مراد لی جائے، اس کا حاصل یہ ہوگا کہ اگر کسی شخص نے غیر کفریہ احتمال کا ارادہ نہیں کیا تو وہ دیانۃً کافر ہو جائے گا تاہم ہمارے لئے اس کے کفر کا فیصلہ کرنا جائز نہیں ہوگا کیونکہ احتمال کی موجودگی میں بنائے تکفیر قطعی نہیں رہی جو کہ تکفیر کی بنیادی شرط ہے۔

اس خیال کی تائید علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے:

وإن سئل عمن تكلم بكفر متأول قال يسأل إن أراد كذا فلا شيء عليه، وإن أراد كذا فيستتاب فإن تاب قبلت توبته وإلا قتل[1]

"جو شخص کوئی ایسی کفریہ بات کرے جس میں تاویل ہو سکتی ہے تو اس سے پوچھا جائے گا اگر اس نے کسی غیر کفریہ احتمال کے ارادے سے بات کی تو اس پر کوئی (سزا) نہیں اور اگر کفریہ احتمال کا ارادہ تو اس سے توبہ طلبی کی جائی گی اگر توبہ کیا تو اس کا توبہ قبول کیا جائے گا ورنہ تو قتل کیا جائے گا۔"

---

[1] البحر الرائق، كتاب القضاء، فصل في المستفتي، ج٦ص٢٩١.

اس عبارت میں محتمل کلمہ کہنے کی وجہ سے تکفیر نہیں کی گئی بلکہ احتمال کی وجہ سے تنقیح کرائی گئی، متکلم کے ساتھ پوچھ گچھ کے نتیجے میں جب معلوم ہوا کہ وہ غیر کفری احتمال کا اراد نہیں کر رہا بلکہ کفریہ احتمال ہی اس کا مقصود ہے تو اس کو کافر قرار دیا گیا۔

تیسری قسم کی شرائط

اب تک ان شرائط کو بیان کیا گیا جو مکفِّر اور مکفَّر کے اعتبار سے ضروری تھے، اس کے بعد ان شرائط کو بیان کیا جا رہا ہے جن کا تعلق خود اس قول و فعل کے ساتھ ہے جس کی وجہ سے کسی کو کافر کہا جاتا ہے۔

ہر بات پر کسی کو کافر کہنا پوری امت کے نزدیک ناجائز ہے، لہٰذا اس میں دو رائے نہیں ہے کہ ہر کوتاہی موجب کفر نہیں ہے بلکہ اس کے لئے کچھ خاص شرائط ہیں، یہاں انہی شرائط کو ذکر کرنا مقصود ہے۔

پہلی شرط: موجبِ کفر ہونا

بنیادی شرط یہ ہے کہ جس قول و عمل کی بنیاد پر کسی کی تکفیر کی جا رہی ہو، واقعۃً وہ عمل موجبِ کفر بھی ہو، کیونکہ معاصی کی بناء پر تکفیر کرنا اہل سنت والجماعت کا مسلک نہیں ہے، لہٰذا کسی کو کافر کہنے سے پہلے اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ جس عمل کی وجہ سے اس کو کافر کہا جا رہا ہے آیا وہ عمل ایسا ہے بھی جس کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جا سکتی ہے؟۔

رہا یہ سوال کہ کن کن امور کی وجہ سے کسی کو کافر کہا جا سکتا ہے؟ اور کن امور کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جا سکتی؟ تو اس کی تفصیل اسی کتاب کے باب چہارم میں ذکر کر دی جائے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔

دوسری شرط: کفر و تکفیر کادار و مدار

جیسا کہ پہلے بھی یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ ایمان و کفر کا اصل تعلق دل کے ساتھ ہے لیکن شریعت نے بعض اقوال وافعال کو بھی اس کا قائم مقام ٹھہرایا، کیونکہ یہ اعمال دل کی تصدیق یا تکذیب پر دلالت کرتے ہیں، لیکن چونکہ مسئلہ "ایمان وکفر" کا ہے جس میں انتہائی حزم واحتیاط کی ضرورت ہے اس لئے عمل کی بنیاد پر کسی کو کافر کہنے سے پہلے اس بات کا گہرا جائزہ لیناضروری ہے کہ اس عمل کی دلالت دلی تکذیب پر کس درجہ کی ہے؟ اگر دلالت یقینی اور قطعی ہو تب تو کفر کا حکم جاری ہو سکتا ہے ورنہ نہیں۔

تکفیر کے باب میں اس شرط کالحاظ رکھنا ضروری ہے، اس کی رعایت نہ رکھنے کی وجہ سے بڑی بے احتیاطیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دلالت کا معیار

اگر کوئی شخص گناہ کبیرہ کر رہا ہے، زنا، شراب یا سود وغیرہ کاارتکاب کر رہا ہے تو کسی درجہ میں یہ گناہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کی دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی، آخرت اور قبر وحشر کے عذاب کا مکمل طور پر یقین نہیں ہے، اگر ان چیزوں کا یقین ہوتا تو دو پیسوں کے بدلے اتنی مصیبتیں اپنے لئے جمع نہ کرتا۔

اگر کوئی عقل مند آدمی چند ٹکوں کے بدلے اس دارِ فانی میں عمر قید برداشت نہیں کرتا تو اس شخص نے آخرت کے عذاب کو ایک لمحہ کی خوشی کے لئے کیونکر برداشت کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ دل میں آخرت پر کماحقہ یقین نہیں ہے ورنہ اتنی حماقت نہ کرتا۔

اب یہاں یہ گناہ بھی دلی تکذیب پر دلالت کرتا ہے لیکن اس کی بناء پر کسی مسلمان کی تکفیر کرنا بالکل ناجائز ہے کیونکہ یہ دلالت قطعی اور صریح نہیں، کیونکہ اس میں کفر کے علاوہ دیگر احتمالات بھی موجود ہیں، بسا اوقات دل میں آخرت اور جزا و سزا پر یقین رکھنے کے باوجود اس قسم کے گناہوں کا ارتکاب ہو جاتا ہے۔

بہت سے لوگوں کی غلط فہمی کی بنیاد یہی بات بنی کہ وہ ہر قسم کی دلالت کو مد نظر رکھ کر تکفیر مسلم کے جرم میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن فقہاءِ کرام اور اہل سنت والجماعت کے نزدیک جس عمل کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جاتی ہے، اس کے لئے یہ ضروری شرط ہے کہ اس کی دلالت دلی تکذیب پر صریح اور قطعی ہو، اگر یہ دلالت صریح نہ ہو بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے احتمالات بھی موجود ہوں تو اس کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا بے احتیاطی اور اہل سنت والجماعت کے مسلک و مشرب کے سراسر خلاف ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالی تحریر فرماتے ہیں:

ولكن يعرف اعتقاده تعظيم الصنم تارة بتصريح لفظه، وتارةً بالإشارة إن كان أخرساً، وتارة بفعل يدل عليه دلالة قاطعة كالسجود حيث لا يحتمل أن يكون السجود لله وإنما الصنم بين يديه كالحائط وهو غافل عنه أو غير معتقد تعظيمه، وذلك يعرف بالقرائن.

"بتوں کی عظمت کا عقیدہ کبھی تو صاف الفاظ استعمال کرنے سے معلوم ہو گا اور اگر گونگا ہو تو اشارہ سے معلوم ہو گا اور کبھی ایسے کام کرنے سے معلوم ہو گا جو قطعی طور پر اس اعتقاد پر دلالت کرے مثلاً (بت کے سامنے) سجدہ کرنا، کہ اس میں یہ احتمال نہیں ہے کہ شاید سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے کر رہا ہو اور بت صرف دیوار کے مانند

سامنے موجود ہو، یا یہ احتمال کہ بت کے عظمت کا خیال نہ رکھتا ہوگا، یہ باتیں قرائن سے ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔"[1]

تیسری شرط: کفریہ عمل کے صادر ہونے کا شرعی ثبوت

کسی خاص شخص کو کافر قرار دینے کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ کافر قرار دینے والے کے پاس اس بات کا ثبوت بھی ہو کہ وہ جس شخص کو معیّن طور پر کافر کہہ رہا ہے اس نے واقعۃً کوئی واضح کفریہ کام کیا، شرعی ثبوت کے بغیر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں، کیونکہ کسی کو کافر قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں لعنت اور سزائے خداوندی کا مستحق ہے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا وغیرہ وغیرہ، اور ظاہر ہے کہ کسی مسلمان شخص کے بارے میں اتنی بڑی جسارت کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق کرنا ضروری ہے کہ اس نے متعلقہ کام کیا بھی ہے یا نہیں؟

احادیثِ مبارکہ میں بے جا کسی کو لعنت کرنے اور کسی مسلمان کو بلا دلیل ناحق کافر کہنے کو قتل کی طرح قرار دیا گیا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ روایت کرتے ہیں:

لعن المؤمن كقتله، ومن رمى مؤمنا بكفر فهو كقتله.

"مسلمان پر لعن کرنا اس کو قتل کرنے کی طرح ہے اور جس نے کسی مسلمان کو کافر کہا (یہ ایسا گناہ ہے کہ) گویا اس کو قتل کر دیا"[2]

---

[1] الاقتصاد في الاعتقاد، الباب الرابع،بيان من يجب تكفيره من الفرق،ص:١٣٨.

[2] صحيح البخاري، باب من كفر أخاه بغير تأويل فهو كما قال،رقم الحديث: ٦١٠٥.

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ عینی رحمہ اللہ تعالیٰ وغیرہ شارحین نے بیان فرمایا کہ کسی کو کافر کہنا دراصل اس کے قتل کئے جانے کا سبب ہے،[1] یعنی جب کسی شخص کو کافر قرار دیا جائے تو کفر کے تمام احکام اس پر جاری ہوں گے جس میں سے ایک قتل بھی ہے تو گویا یہ تکفیر ہی قتل ہو جانے کا ذریعہ ہے۔

لہٰذا جس طرح کسی کو قتل کرنے سے پہلے اس بات کی تحقیق ضروری ہے کہ جس شخص کو قتل کیا جارہا ہے، کیا وہ واقعۃً مجرم ہے یا نہیں؟ اور اگر مجرم ہو تو کیا جرم کی نوعیت یہ ہے کہ اس کی پاداش میں قتل کیا جائے یا نہیں؟ ان تمام باتوں کی تسلی کرنے کے بعد ہی کسی کو قتل کیا جا سکتا ہے، یہی حکم کسی کو کافر قرار دینے کا بھی ہے کہ جب تک مستند ذرائع سے کسی کفریہ عمل کرنے کا ثبوت نہ ہو جائے تب تک کسی کو کافر کہنے کی جسارت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے۔

چوتھی شرط: موانعِ تکفیر موجود نہ ہوں

کفریہ عمل کرنے کے ثبوت کے بعد اس بات کی تنقیح بھی ضروری ہے کہ کفریہ عمل صادر ہونے میں تکفیر کے موانع میں سے کوئی مانع موجود تھا یا نہیں؟ اس باب کے شروع میں جو موانع ذکر ہوئے، اگر ان میں سے کوئی ایک مانع بھی موجود تھا اور اس کی وجہ سے کسی مسلمان نے کوئی کفریہ قول و عمل کا ارتکاب کیا تو اس کو کافر قرار دینا جائز

---

[1] عمدة القاري شرح صحيح البخاري، كتاب الايمان والنذور، باب من حلف بملة سوى ملة الإسلام ،ج٢٣ص١٧٩.

نہیں، اس لئے اس کی تحقیق بھی ضروری ہے تاکہ ناحق تکفیر مسلم کی گناہ سے حفاظت ہو۔

پانچویں شرط: بنائے تکفیر کا کفر ہونا یقینی ہو

جس عقیدے یا عمل کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جا رہا ہو، اس کا یقینی طور پر کفر ہونا ضروری ہے، محتمل امر کو بنیاد بنا کر کسی کی تکفیر کرنا شرعاً جائز نہیں یعنی جس چیز میں کفر و اسلام دونوں کا احتمال موجود ہو اس کی بناء پر کسی کو کافر قرار دینا درست نہیں، اسی بنیاد پر حضرات فقہاء کرام نے یہ اصول مقرر فرمایا کہ جس کلمہ میں کفر کے بیسیوں احتمالات موجود ہوں، صرف ایک ممکنہ احتمال کسی ایسی پہلو کا بھی ہو جس کو اختیار کرنے کی صورت میں کفر اور تکفیر کی ضرورت نہ پڑے تو حتی الامکان اسی آخری احتمال کو ترجیح دینا ضروری ہے اور جب تک متکلم خود کسی کفریہ احتمال کی صراحت نہیں کرتا تو صرف اس محتمل کلمہ کی وجہ سے اس کو قطعی کافر کہنا بالکل غلط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ وغیرہ بہت سے فقہاء کرام نے کسی عمل کے بناء پر تکفیر کے جائز ہونے کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس عمل کے کفر ہونے میں حضرات فقہاء کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہ ہو اگر کسی بات کے کفر ہونے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہو تو چونکہ ایسا عمل یقینی طور پر موجب کفر نہیں رہتا، اس لئے اس کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا درست نہیں۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وفي الخلاصة وغيرها إذا كان في المسألة وجوه توجب التكفير ووجه واحد يمنع التكفير فعلى المفتي أن يميل إلى الوجه الذي يمنع التكفير

تحسينا للظن بالمسلم زاد في البزازية إلا إذا صرح بإرادة موجب الكفر فلا ينفعه التأويل حينئذ وفي التتارخانية لا يكفر بالمحتمل لأن الكفر نهاية في العقوبة فيستدعي نهاية في الجناية ومع الاحتمال لا نهاية اهـ.

خلاصۃ الفتاویٰ وغیرہ کتابوں میں لکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ میں ایسے کئی احتمال موجود ہوں جو موجب کفر ہوں لیکن کوئی ایک ایسی توجیہ ہو جو تکفیر سے مانع ہو تو مفتی کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمان کے متعلق حسن ظن رکھتے ہوئے اسی مانع تکفیر توجیہ کو اختیار کرے،اس کے ساتھ فتاویٰ بزازیہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگر خود متکلم کسی کفریہ احتمال کے مراد لینے کی تصریح کردے تو پھر تاویل کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا(بلکہ وہ کافر ہوگا)فتاویٰ تتارخانیہ میں لکھا ہے کہ احتمالی چیز کی وجہ سے تکفیر نہیں کی جاسکتی کیونکہ کفر انتہائی سزا ہے تو اس کے لئے انتہائی درجہ کی جنایت ضروری ہے اور احتمال کی موجودگی میں کوئی جرم انتہائی نہیں بنتا۔"[1]

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ اس عبارت کو نقل کرتے ہوئے مزید فرماتے ہیں:

والذي تحرر أنه لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن أو كان في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة.

---

[1] البحر الرائق شرح كنز الدقائق، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ج٥ص١٣٤.

"جب تک کسی مسلمان کے کلام کو درست پہلو پر حمل کرنا ممکن ہو یا اس کے کفر ہونے میں اختلاف ہوا گر (کفر نہ ہونے کا قول) ضعیف ہی کیوں نہ ہو، تو اس کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جاتا۔[1]

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی ضعیف روایت کی بناء پر تکفیر سے خلاصی ممکن ہو تو حتی الامکان اسی کو اختیار کیا جانا چاہئے، علامہ حموی رحمہ اللہ نے اس میں مزید تاکید پیدا کر دی اور یہ ذکر فرمایا کہ اگر اپنے مذہب میں عدم تکفیر کی کوئی روایت نہ ہو لیکن دیگر مذاہب میں کوئی ایسا قول ہو تو اسی پر عمل کر لینا چاہئے۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

قوله: متى وجدت رواية أنه لا يكفر: يعني ولو كانت تلك الرواية ضعيفة كما في شرح المصنف - رحمه الله تعالى - على الكنز. أقول: ولو كانت تلك الرواية لغير أهل مذهبنا، ويدل على ذلك اشتراط كون ما يوجب الكفر مجمعا عليه.[2]

"علامہ ابن نجیم نے فرمایا کہ جب کوئی روایت موجود ہو تو کسی کی تکفیر نہ کی جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روایت ضعیف بھی ہو جیسا کہ کنز کی شرح میں خود مصنف (علامہ ابن نجیم) نے لکھا ہے، میں کہتا ہوں کہ اگرچہ وہ روایت ہمارے مذہب کے علاوہ دیگر حضرات کی بھی ہو، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ موجب کفر امر کے لئے یہ شرط لگایا جاتا ہے کہ وہ اتفاقی ہو۔"

---

[1] حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب الجهاد، باب المرتد، ج٤ص٢٢٤.

[2] غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر، الفن الثاني، كتاب السير، باب الردة، ج٢ص ١٩٠.

احکام کفر و تکفیر

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، انسانی زندگی کے بیسیوں مسائل ایسے ہیں جن کے اندر مسلمانوں اور کفار کے احکام میں فرق ہے مسلمانوں کے لئے ایک حکم اور کافر کے لئے دوسرا، اسی طرح آخرت تو کفر واسلام کے درمیان فرق کا اصل مظہر اور میدان ہے جہاں ان دونوں حقائق کے درمیان اصل فرق بالکل آشکارااور آنکھوں کے سامنے آجائے گا جس کے بعد اس میں کوئی پوشیدگی یا خفاء کا نام ونشان باقی نہیں رہے گا، اسلام اور کفر کے موضوع پر تحقیق کرنے والے کے لئے ان احکام کو سمجھنا بھی ضروری ہو جاتا ہے اس لئے یہاں ان احکام کو نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا جاتا ہے۔

ان احکام کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، ایک قسم وہ احکام ہیں جن کا تعلق دنیوی زندگی کے ساتھ ہے اور دنیا ہی میں اس پر عمل کرنے کے لئے ان کو مشروع کیا گیا ہے، اور دوسری قسم احکام کا تعلق آخرت کے ساتھ ہے جہاں اللہ تعالیٰ براہ راست ان احکام کو جاری فرمائیں گے۔

اُخروی احکام کے درمیان فرق

اگر کوئی مکلّف یعنی عاقل وبالغ آدمی دنیا سے انتقال کرے اور اس کو دین حق کی دعوت بھی پہنچی ہو، اس کے باوجود اس نے اسلام قبول نہیں کیا یا اسلام قبول تو کیا لیکن

اس پر استقامت اختیار نہیں کی بلکہ دنیا سے کفر کی حالت میں مرا، تو ایسا شخص ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اگر مکلّف نہ تھا بلکہ یا تو عقل کی نعمت سے محروم تھا یا حد بلوغ کو پہنچنے سے پہلے ہی انتقال کر گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر کسی بچے کے والدین میں سے دونوں یا کوئی ایک مسلمان ہو تو اس کو بھی حکماً مسلمان سمجھا جائے گا اور اگر اسی نابالغی کے حال ہی میں اس کا انتقال ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل و کرم سے جنت میں رہے گا، لیکن اگر والدین کافر ہوں تو کیا پھر بھی یہی حکم ہے یا دونوں میں کچھ فرق ہے؟

اس میں اختلاف ہے، معتزلہ اور بعض دیگر متکلمین نے جنت میں جانے کا قول اختیار کیا، اس کے مقابلہ میں بہت سے متکلمین نے جہنم میں جانے کا موقف اپنایا جبکہ امام صاحب رحمہ اللہ وغیرہ بہت سے ائمہ کرام سے توقف منقول ہے۔[1]

اسی طرح جو شخص عاقل و بالغ ہے مگر وہ کسی ایسے دور دراز گھاٹیوں کا باشندہ ہو جہاں دین اسلام کی کرنیں نہیں پہنچ سکی اور اس کو دین حق کا کسی طرح علم حاصل نہیں ہو سکا، اس حال میں اس کا انتقال ہو جائے تو آخرت میں اس کا حشر مسلمانوں کے ساتھ ہو گا یا کفار کے ساتھ؟ حنفیہ اور ماتریدیہ کے نزدیک راجح بات یہ ہے کہ عقل اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جس کی وجہ سے انسان شرعی احکام کا مخاطب بنتا ہے لیکن نِری عقل ایمانیات کے گھتے سلجھانے کے لئے کافی نہیں جب تک وحی کی روشنی میسر نہ

---

[1] مزید تفصیل کے لئے کتب کلام ملاحظہ فرمائیں۔

ہو، اس لئے اگر ایسا شخص ایمان و کفر کے متعلق کچھ نہ جانے اور کفریہ عقیدہ رکھے بغیر مرے تو کافروں جیسا عذاب نہیں دیا جائے گا اور اگر کوئی کفریہ عقیدہ اختیار کر کے مرا تو چونکہ کفر سمجھنے والے کے لئے ایمان سمجھنا بھی کوئی مشکل کام نہیں ہے بلکہ ایک چیز کے سمجھنے کے بعد اس کی ضد سمجھنا بھی کوئی مشکل نہیں ہے اس لئے ایمان اختیار نہ کرنا اس کی بڑی کوتاہی ہے جس کی وجہ سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔

بہت سی کتابوں میں امام ابو حنیفہ اور امام ابو منصور ماتریدی رحمہا اللہ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے کہ توحید اور معرفت خداوندی کے لئے صرف عقل ہی کافی ہے اس لئے اگر وحی کا علم نہ بھی پہنچے تو بھی محض عقل کے بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی پہچان ضروری ہے ورنہ تو کافر سمجھا جائے گا اور آخرت میں اس جرم پر عذاب دیا جائے گا، یہ قول منتقی وغیرہ بعض کتابوں میں ان حضرات کی طرف منسوب کیا گیا ہے لیکن محقق اصولیین نے اس کو ترجیح نہیں دی، مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں (علامہ عبد العزیز بخاری رحمہ اللہ کی کتاب "کشف الاسرار شرح اصول البزدوی" ج۴ ص۳۸۷ قدیمی کتب خانہ، کراچی پاکستان)۔

دنیا میں کفر اور کفار کے احکام

دنیا کے اندر بھی بیسیوں احکام کے درمیان مسلمان اور کافر کا فرق ہے، آسانی کے لئے ان احکام کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ کفر کے متعلق اسلام کا نظریہ۔ ۲عبادات میں مسلمان اور کافر کے درمیان فرق ۔۳۔ مالی معاملات اور لین دین کے مسائل میں دونوں کے درمیان فرق۔۴۔ مناکحات اور معاشرت کے باب میں فرق۔۵۔ حقوق واملاک۔

کفر کے متعلق اسلام کا نظریہ

۱: ہر مسلمان پر اس بات کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے بالمقابل تمام ادیان و مذاہب باطل اور ناحق ہے، دین اسلام تمام سابقہ ادیان کے لئے ناسخ ہیں جس کی وجہ سے گزشتہ تمام مذاہب منسوخ ہوگئے اور اب قیامت تک سفینہ نوح یہی دین ہی واحد سبیل نجات ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہاں دین اسلام کے علاوہ کوئی دین و مذہب قبول نہیں ہوگا۔

{وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ} [آل عمران : ٨٥].

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔"

۲: کفر اور اہل کفر سے اپنی براءت کا اظہار کرنا ضروری ہے، مسلمان کے لئے کفر سے محبت کرنا اور اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنا قطعاً ناجائز ہے، اسی طرح اہل کفر سے ان کے دین و مذہب کی وجہ سے پیار و محبت کے جذبات رکھنا سخت گناہ اور نہایت خطرناک جرم ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور ان پر ایمان لانے والوں نے اپنی قوم سے یہی کہا تھا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ} [الممتحنة: ٤]

"تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام میں اور ان لوگوں میں جو (ایمان اور اطاعت میں) ان کے شریک حال تھے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے کہدیا کہ ہم تم سے اور جن کو تم اللہ کے سوا معبود سمجھتے ہو ان سے بیزار ہیں ہم تمہارے منکر ہیں اور ہم میں اور تم میں ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض (زیادہ) ظاہر ہو گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ"

بہت سے نصوص میں اس بات کا بڑی تاکید واہتمام کے ساتھ حکم دیا گیا بلکہ بعض نصوص میں تو اس کو ایمان کا معیار قرار دیا گیا۔

یہاں اس مسئلہ کو قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ عموماً لوگ اس باب میں افراط و تفریط کے شکار ہوتے ہیں، بعض لوگ تو اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت ہی نہیں دیتے بلکہ تمام ادیان و مذاہب کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور سبھی کے احترام و تقدس کا رویہ رکھتے ہیں، اس کے بالمقابل بعض حضرات نے محض اس مسئلہ کو بنیاد بنا کر کفر واسلام کے فیصلے کرنے شروع کئے اور کفار کے ساتھ جو کوئی اور کیسا بھی تعلق رکھے وہ ان کے نزدیک مسلمان نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ کفار کے ساتھ تعلقات کی مختلف نوعیتیں ہیں، ہر قسم تعلق کی اجازت نہیں بلکہ بعض قسم کے تعلقات میں کفر کا اندیشہ ہے اسی طرح ہر تعلق کو کفر قرار دینا بھی غلط ہے، بلکہ بعض جائز بھی ہے اور جو ناجائز تعلق ہے اس کا بھی ہر حال میں کفر ہونا کوئی ضروری نہیں۔

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں: ۱۔ موالات یعنی دوستی۔ ۲: مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی۔ ۳: مواسات یعنی احسان و نفع رسانی۔

ان معاملات میں تفصیل یہ ہے کہ موالات تو کسی حال میں جائز نہیں اور آیت "یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُودَ وَالنَّصَارَیٰ أَوْلِیَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِیَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ" اور "یَاأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِیَاءَ" میں یہی مراد ہے۔ اور مدارات تین حالتوں میں درست ہے، ایک دفع ضرر کے واسطے۔ دوسرے کافر کی مصلحت دینی یعنی توقع ہدایت کے واسطے۔ تیسرے اکرام ضیف کے لئے، اور اپنی مصلحت و منفعت مال یا جاہ کے لئے درست نہیں، اور بالخصوص جبکہ ضرر دینی کا بھی خوف ہو تو بدرجہ اولیٰ یہ اختلاط حرام ہوگا۔۔اور مواسات کا حکم یہ ہے کہ اہلِ حرب کے ساتھ ناجائز ہے اور غیر اہل حرب کے ساتھ جائز۔۔"[1]

کفر واسلام کا اصل دار و مدار چونکہ دل کے ساتھ ہے اس لئے جن تعلقات کو یہاں ناجائز قرار دیا گیا ہے، اس پر ہر حال میں کفر کا فیصلہ کرنا جائز نہیں بلکہ ضروری ہے کہ اولاً اساس تکفیر کی تحقیق کی جائے اس کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے، اگر کفار کے ساتھ دوستی اس لئے رکھی جائے کہ ان کے دین وعقیدے کے ساتھ محبت ہے یا کوئی کفر کی وجہ سے اہل کفر سے دلی محبت رکھے تو یہ کفر ہے کیونکہ یہ در حقیقت رضا بالکفر ہے جو شرائط ایمان کے منافی ہے جس کی تفصیل باب اول میں تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے۔

اگر کہیں تعلق کی بنیاد کوئی اور چیز ہو مثلاً کوئی ذاتی لالچ، دینوی منافع کا حرص وغیرہ تو ان مقاصد کے لئے کفار سے دوستی کرنا اگرچہ ناجائز اور سخت گناہ ہے لیکن اس کو کفر قرار دینا بھی بالکل غلط ہے، حضرات فقہاء کرام نے "زُنّار" وغیرہ اہل کفر کے

---

[1] بیان القرآن، ج۱ص۲۲۶.

لباس پہننے کے ذیل میں اس کی تفصیل لکھی ہے کہ ان جیسے شعائر کفار کا پہننا حرام اور سخت گناہ ہے لیکن اگر دلی محبت کے بغیر پہنا جائے تو کفر نہیں، کفر تب ہی کہہ سکتے ہیں جبکہ کوئی دلی محبت سے ایسا اقدام کرے، اور چونکہ دل کا حال براہ راست معلوم کرنا ممکن نہیں اس لئے صاحب معاملہ کی بات کا اعتبار کر لینا چاہیئے۔

مشہور مالکی فقیہ علامہ دردیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

(وشد زنار) -- والمراد به ملبوس الكافر الخاص به أي إذا فعله حبا فيه وميلا لأهله وأما إن لبسه لعبا فحرام وليس بكفر

"زنار پہننا (بھی کفر ہے) اس سے مراد وہ لباس ہے جو کفار کے ساتھ مخصوص ہو، اگر کوئی اس کی محبت کی وجہ سے اور اس لباس پہننے والوں کی طرف (دلی) میلان کی وجہ سے پہنے (تو تب ہی کفر کہہ سکتے ہیں ورنہ) اگر فضول میں پہنے تو حرام تو ہے مگر کفر نہیں ہے۔"[1]

فتاویٰ ہندیہ میں ایک دوسرے مسئلہ کی ضمن میں ذکر کردہ تفصیل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے:

وبقوله لمعامله الكفر خير مما أنت تفعل عند بعضهم مطلقا، وقيده الفقيه أبو الليث بأن قصد تحسين الكفر لا تقبيح معاملته.

"اگر کسی نے اپنے ساتھ معاملہ کرنے والے سے کہا کہ آپ کے کرتوت سے کفر بہتر ہے تو بعض فقہاء کرام کے نزدیک اس لفظ سے مطلقاً کافر ہو جائے گا لیکن فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ نے اس میں یہ قید بھی لگائی کہ اگر کہنے والے کا اس لفظ سے کفر کو

---

[1] الشرح الكبير للشيخ الدردير مع حاشية الدسوقي، باب في الردة وأحكامها ج٤،ص٣٠١.

اچھا سمجھنا مقصود ہو تب ہی کافر ہو گا ورنہ اگر صرف مخاطب کے معاملہ کی برائی کرنا مقصود ہو تو کفر نہیں ہے۔"[1]

عبادات اور معاملات کے باب میں اسلام و کفر کے درمیان بنیادی فروق

ا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عبادات قبول ہونے کے لئے ایمان شرط ہے، کفر کے ساتھ ساتھ اگر بظاہر کوئی نیک کام بھی کیا جائے تو بھی وہ عنداللہ مقبول نہیں ہے جس کی وجہ سے آخرت کی نجات نصیب نہیں ہو سکتی۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{ وَمَا مَنَعَهُمْ أَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلَّا أَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلَا يَأْتُونَ الصَّلَاةَ إِلَّا وَهُمْ كُسَالَى وَلَا يُنْفِقُونَ إِلَّا وَهُمْ كَارِهُونَ }

"اور ان کی خیر خیرات قبول ہونے سے اور کوئی چیز بجز اس کے مانع نہیں کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کفر کیا اور وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ۔" [التوبة : ٥٤]

۲۔ شریعت کے جن احکام کا تعلق ایمانیات، عقوبات اور معاملات کے ساتھ ہیں، ان تمام احکام میں مسلمان اور کافر کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ دونوں ہی برابر اس کے مکلف اور مخاطب ہیں (چند ایک استثناءات کے ساتھ مثلاً شراب کا لین دین وغیرہ) البتہ عبادات سے متعلق نصوص کے بھی کافر مخاطب ہے یا نہیں؟ اور اگر

---

[1] الفتاوى الهندية ،كتاب السير، الباب التاسع فى احكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر، ج٢ص٢٧٦.

مخاطب ہیں تو صرف آخرت میں عذاب کے لحاظ سے یا دنیوی احکام میں بھی یہی حکم ہے؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جس کی تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: امام سرخسی رحمہ اللہ کی کتاب "أصول السرخسي"(فصل في بيان موجب الأمر في حق الكفار، ج۱ص: ۷۳.اور امام جصاص رازی رحمہ اللہ کی کتاب "شرح مختصر الطحاوي ، كتاب الصلاة،باب صفة الصلاة، ج۱ص ۷۳۵).

۳۔ غیر مسلم کو زکوۃ دینے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی۔[1]

۴۔ معاملات کے باب میں دونوں کے درمیان ایک فرق یہ بھی ہے کہ دار الاسلام میں بطور ذمی رہتے ہوئے اگر یہ لوگ شراب یا خنزیر کا لین دین کرنا چاہے تو ان کو منع نہیں کیا جائے گا جبکہ مسلمان ان چیزوں کا نہ خود ہی مالک بن سکتا ہے نہ ہی کسی دوسرے کو مالک بنا سکتا ہے۔

نکاح و معاشرت کے باب میں فرق

۱۔ کافر شخص کسی مسلمان کا ولی نہیں بن سکتا۔

۲۔ مسلمان عورت کا کسی بھی غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا حرام ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

{وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّى يُؤْمِنُوا } [البقرة : ۲۲۱]

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، باب المصرف، ج۲ص ۳۵۱.

"اور عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جاویں"

۳۔اسی طرح کافر عورت کے ساتھ مسلمان مرد کا نکاح کرنا بھی شرعاً جائز نہیں، البتہ اگر کوئی عورت اہل کتاب میں سے ہو تو اس کے ساتھ مسلمان کا نکاح ہو سکتا ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ صرف قومی یا ملکی سطح پر عیسائی/یہودی نہ ہو بلکہ واقعۃً آسمانی دین، اللہ تعالیٰ کے وجود اور قیامت کے قائل ہوں، اگر ان چیزوں پر کسی کا ایمان نہیں تو صرف مردم شماری میں عیسائی شمار ہونے سے وہ اہل کتاب ہو سکتا ہے نہ ہی اس کے ساتھ کسی مسلمان مرد کا نکاح کرنا جائز ہے۔

حقوق واملاک میں فرق

۱۔کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔

۲۔ مسلمان کافر کا بھی وارث نہیں بن سکتا کیونکہ اختلاف دین مانع ارث ہے، البتہ اگر کوئی مسلمان خدانخواستہ مرتد ہو جائے اور اسی حالت میں وہ مرے یا کسی غیر اسلامی ملک میں جا کر پناہ گزیں ہو جائے، تو دیون کی ادائیگی کے بعد اس کا ترکہ مسلمان ورثاء کے درمیان تقسیم کیا جائے گا چاہے یہ کمائی اس نے مرتد ہونے سے پہلے کی ہو یا اس کے بعد، اور امام صاحب رحمہ اللہ کے نزدیک ارتداد سے پہلے کمائی کا تو یہی حکم ہے البتہ ارتداد کے بعد والی کمائی بیت المال میں رکھی جائے گی۔

۳۔کافر مسلمان کے خلاف گواہی کا اہل نہیں ہے۔

۴۔ کافر کا ذبیحہ حرام ہے البتہ اہل کتاب اگر اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جانور ذبح کرے تو ان کا ذبیحہ حرام نہیں ہے تاہم اس میں وہی شرط ہے جو ان کے ساتھ نکاح کرنے کے مسئلہ میں ذکر کی جاچکی۔

۵۔ ارتداد کا ایک حکم قتل کرنا بھی ہے جو آدمی اسلام کے بعد کفر اختیار کرے تو حکومت وقت کو چاہئے کہ اس کو تین دن تک مہلت دے اور اس دوران اس کو دوبارہ اسلام میں داخل ہونے کی ترغیب دے اگر دین اسلام کے متعلق کچھ شکوک وشبہات کی گردش نے اس کو اسلام سے پھیر کر مرتد بنایا ہو تو ان شبہات کو تسلی بخش ذریعے سے دور کرنے کی کوشش کی جائے، اگر تین دن کے بعد اسلام لایا تو درست، ورنہ تو اس کو قتل کرنا ضروری ہے۔

یہ تفصیل تو تب ہے کہ جب مرتد ہونے والا (نعوذ باللہ) مرد ہو اگر عورت ایسا کوئی جرم کرے تو فقہاء احناف کے نزدیک اس کو قتل تو نہیں کیا جائے گا تاہم اس کو عمر بھر قید میں رکھا جائے گا کہ یا تو اسلام لے آئے اور یا یوں ہی قید وبند کی حالت میں مر جائے۔

جماعت کی تکفیر کا ضابطہ:

ابھی تک جو تفصیل گزری وہ کسی خاص فرد کے تکفیر سے متعلق تھی، پوری جماعت یا فرقہ کی تکفیر کے لئے کیا اصول ہے؟ یعنی جب کسی جماعت، گروہ اور فرقہ کو کافر قرار دینے کی ضرورت ہو تو اس کے لئے کیا ضابطہ ہے؟ یہاں اسی ضابطہ کو ذکر کرنا مقصود ہے۔

بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہی واضح رہے کہ کافی تلاش کے باوجود اس کے لئے کوئی صریح معیار نہیں مل سکا، فقہاء کرام اور متکلمین کے کلام میں کہیں کوئی جامع ضابطہ کافی جستجو کرنے کے بعد بھی نہیں مل سکا، تاہم ایک عرصہ تک غور و فکر کرنے کے بعد یہ ناکارہ جس نتیجہ پر پہنچا ہے اس کو اہل علم کی خدمت میں پیش کرتا ہے اس کی حیثیت کسی حتمی رائے کی نہیں ہے بلکہ ذکر بھی صرف اس لئے کیا جارہا ہے تاکہ اہل علم اور اہل فتویٰ اس پر غور کریں۔

سابقہ مباحث کے نتیجہ میں بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ کسی کی طرف کفر کی نسبت کرنا تب ہی درست ہو سکتا ہے جبکہ وہ کسی موجبِ کفر عقیدہ یا قول و فعل کا ارتکاب کرے، ایسے کسی امر کے ارتکاب کے بغیر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں، بالکل یہی حکم کسی جماعت کی تکفیر کا بھی ہے، اگر کسی جماعت کا ڈھانچہ ہی کسی کفریہ عقیدہ پر مشتمل ہو تب تو اس کی تکفیر درست بلکہ ضروری ہے لیکن اگر جماعتی حیثیت سے اس میں کوئی ایسی کفریہ عقیدہ موجود نہ ہو جس کو بنائے تکفیر بنایا جا سکے لیکن اس سے وابستہ کچھ افراد غلو و افراط کی وجہ سے کوئی کفریہ عقیدہ رکھے تو محض چند افراد کی وجہ سے پوری جماعت کی تکفیر کرنا درست نہیں بلکہ سراسر خلاف احتیاط ہے کیونکہ پوری جماعت کے تکفیر کرنے کی صورت میں اس جماعت سے وابستہ تمام افراد کی تکفیر لازم آتی ہے، جماعت تو افراد ہی سے عبارت ہوتی ہے جماعت کو کافر کہنے کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جو جو لوگ اس جماعت سے وابستہ ہیں وہ تمام کافر ہیں۔

نیز اگر کہیں پوری جماعت کو کافر قرار دیا جارہا ہو تو قواعد کے لحاظ سے یہ زیادہ سے زیادہ تکفیر مطلق کے قبیل سے ہو سکتا ہے اور تکفیر مطلق کے بارے میں سابقہ مباحث

میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے کہ اس کے تحت کس خاص فرد کو کافر قرار دینا درست نہیں ہے بلکہ شخص معین کو کافر کہنے کے لئے مزید ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ اس کے حق میں تکفیر کے موانع میں سے کوئی مانع بھی موجود نہ ہو، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی جماعت کو کافر قرار دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے ہر ہر فرد پر بھی کفر کا فتویٰ لگایا جائے بلکہ اس اقدام سے پہلے موانع تکفیر کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے اگر اس گروہ کا کوئی فرد ایسا ہو کہ اس کے حق میں کوئی مانع تکفیر موجود نہ ہو تب ہی اس کو کافر کہنا درست ہے ورنہ نہیں۔

اسی طرح اگر کوئی جماعت ایسی ہو کہ امت مسلمہ سے اس کی جدائیگی کی بنیاد ہی کوئی کفریہ عقیدہ ہو اور وہ عقیدہ بھی ایسا ہو کہ وہ اس جماعت کی پہچان اور شعار کی حد تک مشہور ہو مثلاً قادیانیت، یہ وہ گروہ ہے جو امت مسلمہ سے ختم نبوت کے اصولی مسئلہ میں بے جا اختلاف کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی، اسی طرح منکرین حدیث کہ جو حجیت حدیث کے مسلّمہ اور قطعی عقیدہ میں پوری امت سے ہٹ کر غلط راستہ پر چل پڑیں، تو ان جیسی جماعتوں کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرنا ہی موجبِ کفر ہے کیونکہ اس حقیقت کے جاننے کے باوجود کہ یہ جماعت کفریہ عقیدہ رکھتی ہے، اپنے آپ کو اس کی طرف منسوب کرنا در حقیقت رضاء بالکفر کی قبیل سے ہے جو کہ کفر ہے۔

اس بات کی قریب ترین نظیر یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کو کافر کہہ کر پکارے اور دوسرا شخص اس لفظ کے باوجود اس کی طرف متوجہ ہو کر اپنی حاضری کی یقین دہائی کرائے تو بہت سے فقہاء کرام نے اس کو موجب کفر امور میں شمار فرمایا ہیں اور

لکھا ہیں کہ اس کی وجہ سے متوجہ ہونے والا شخص کافر ہو جائے گا، علامہ ابن نجیم موجبات کفر امور جمع کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وبقوله لبيك جوابا لمن قال يا كافر[1]

اگر کوئی کافر کہہ پکارے تو اس کو جواب دیکر متوجہ ہونے سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے۔"

علامہ شامی رحمہ اللہ نے اس کی وجہ یہ ذکر فرمائی ہے کہ

(قوله كفر) أي؛ لأن إجابته إقرار بأنه كافر فيؤاخذ به لرضاه بالكفر ظاهرا إلا إذا كان مكرها. وأما فيما بينه وبين الله تعالى فإن كان متأولا بأنه كافر بالطاغوت مثلا فلا يكفر[2]

"کافر اس لئے کہا جائے گا کہ اس کو جواب دینا (گویا) اس بات کا اقرار ہے کہ جواب دینے والا کافر ہے لہٰذا اس اقرار کی وجہ سے اس کا مواخذہ ہوگا کیونکہ وہ ظاہر میں کفر پر راضی ہو گیا، مگر یہ کہ اکراہ کی حالت میں کوئی جواب دے، جہاں تک دیانت کا مسئلہ ہے تو اگر اس نے کافر سے طاغوت سے کافر ہونا مراد ہو تو کافر نہیں ہوگا۔"

لیکن جہاں کہیں کسی جماعت کے تفرّق کی بنیاد کوئی ایسا کفریہ نظریہ نہ ہو جس کی بناء پر کسی کو کافر کہا جا سکے اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی موجبِ کفر بات ان کی شعار و پہچان کے طور پر مشہور ہو تو وہاں پوری جماعت کو جماعتی حیثیت سے کافر قرار دینا اور اس کے ہر ہر فرد کو صرف اس گروہ کی طرف منسوب کرنے کی وجہ سے کافر قرار دینا درست

---

[1] البحر الرائق؛ كتاب السير، باب احكام المرتدين، ج٥ ص ١٣٣.

[2] حاشية ابن عابدين على الدر المختار، كتاب الحدود، باب التعزير، ج٤ ص ٦٩.

معلوم نہیں ہوتا، بلکہ وہاں تفصیل کرنی ضروری ہے کہ اس جماعت کے افراد میں سے جو جو فرد فلاں فلاں کفریہ عقیدہ کا حامل ہو تو وہ کافر ہے۔

اس کی بنیادی وجہ ایک یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس صورت میں جماعتی حیثیت کے اندر کوئی کفریہ عقیدہ موجود نہیں جس کو بنائے کفر قرار دیا جاسکے، بعض افرادا گرچہ کفریہ عقیدہ کے حامل ہیں لیکن کچھ افراد کے کردار کو پوری جماعت کا ترجمان قرار دینا اور ہر ہر فرد کو اس کا ذمہ دار ٹھہرانا خلاف احتیاط ہے، نیز کسی جماعت کے تمام ترافراد کا تتبّع اور استقصاء بھی کوئی آسان کام نہیں،اس لئے تکفیر جیسے نازک مسئلہ میں سلف صالحین اور جمہور فقہاء و متکلمین کے بے پناہ احتیاط کرنے کا تقاضا بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں اس خاص جماعت سے وابستگی کی بناء پر کسی فرد معین کو کافر نہ کہا جائے جب تک اس کے بارے میں یہ یقین حاصل نہ ہو کہ وہ بھی کسی کفریہ عقیدہ کا حامل ہے۔

ماضی میں بھی ایسی کئی جماعتیں گزری ہیں جن کے اندر حد سے زیادہ غلو کا مرض موجود تھا اور اس میں بہت سے افراد اپنے افراط و تفریط کی وجہ سے کئی موجبات کفر کے بھی مرتکب تھے لیکن جب جماعت کی مجموعی حیثیت کسی کفریہ عقیدہ پر مشتمل نہ تھی تو جمہور امت اس کے تمام افراد کو کافر کہنے سے گریز کرتی رہی، خوارج کی علمی و عملی کوتاہیاں تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں بہت سی روایات میں ان کی بھرپور مذمت بھی کی گئی اور ان کے دین اسلام سے نکلنے کی پیش گوئی بھی دی گئی بلکہ بعض روایات میں ان کے کافر ہونے کی صراحت بھی موجود ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے محدثین کرام نے

ان کو کافر قرار بھی دیا، خود امام بخاری رحمہ اللہ کا بھی یہی رجحان معلوم ہوتا ہے، لیکن جمہور فقہاء کرام نے ان کو کافر کہنے سے ہمیشہ گریز ہی کیا۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے امام ابن المنذر رحمہ اللہ سے نقل فرمایا ہے کہ محدثین کے ساتھ اس بات میں کسی نے اتفاق نہیں کیا، جمہور فقہاء و محدثین کرام کے نزدیک خوارج (علی الاطلاق) کافر نہیں ہیں[1]، حنابلہ میں سے علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے بھی جمہور فقہاء اور کثیر محدثین کا یہی موقف نقل فرمایا۔[2]

---

[1] فتح القدير ،كتاب السير، باب البغاة،ج٦ص ١٠٠.

[2] المغني لابن قدامة ،كتاب قتال اهل البغي،ج٨ ص ٥٢٤.

باب رابع

فصل اول، کفر اور تکفیر میں فرق اور اس کی وضاحت

کفر کے تین مختلف موجبات اور اس کی مکمل تفصیل

ضروریات دین کی تعریف، تعداد اور تفصیلی تعارف

ضروریات دین کے انکار کرنے اور اس میں تاویل کرنے کا حکم

ہر قطعی شرعی حکم کا انکار کرنا کفر ہے یا ضروریات دین میں سے ہونا ضروری ہے؟ تفصیلی اور تحقیقی بحث

قول و عمل کے موجب کفر بننے کی تحقیق

تکفیر کے باب میں نہایت جامع اور منضبط ضابطہ

موجبات کفر و تکفیر کی منضبط بحث

اس بحث میں دو الفاظ (یعنی کفر اور تکفیر) کا استعمال زیادہ ہے اس لئے بحث شروع کرنے سے پہلے ان دونوں کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

کفر اور تکفیر میں فرق اور اس کی وضاحت

کفر کی تعریف باب اول میں تفصیل سے گزر چکی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفر دین اسلام یا اس کے قطعی اور یقینی احکام کے تصدیق نہ کرنے کا نام ہے، جو شخص دل سے دین اسلام کی تصدیق نہ کرے، اس کو حق اور سچ نہ مانے وہ کافر ہے، اور تکفیر کا معنی ہے کسی کو کافر قرار دینا۔

دونوں الفاظ میں فرق واضح ہے گویا کفر کا تعلق اس شخص کے ساتھ ہے جو دین اسلام کی تصدیق نہیں کر رہا لیکن تکفیر اس کا فعل نہیں بلکہ یہ دین حق کے حدود کی حفاظت کرنے والے ان حضرات علماء کرام کی ذمہ داری ہے جو کسی بھی شخص کے قول و فعل کو شریعت کے تراوز میں تول کر اس کے مطابق حکم شرعی بتانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں کہ یہ کافر ہے۔

اگر کوئی شخص دل ہی دل میں دین اسلام یا اس کی کسی قطعی ضروری عقیدے کا انکار کرے لیکن اس کے کسی قول و فعل سے اس کی تائید نہ ہوتی ہے تو اگرچہ شرعاً وہ کافر ہوگا اور اگر اسی حالت میں اس کا انتقال ہوا تو آخرت میں اس کے ساتھ کافروں کا سا

معاملہ کیا جائے گا، لیکن چونکہ دنیا میں شریعت کے احکام کا دار مدار ظاہر پر ہے، دل کے مضمرات اور تاریکیوں کو یقینی طور پر جاننے کے ہمارے پاس صرف یہی قول و فعل ہی وسائل تھے اس کے علاوہ کوئی قطعی راستہ ہمارے پاس موجود نہیں جس کو بنیاد بنا کر دوٹوک انداز میں فیصلہ کیا جا سکے اس لئے محض اعتقاد کو دنیوی احکام میں مدارِ حکم نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسری طرف اگر دیکھا جائے تو اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان و کفر کا دارو مدار دل پر ہے کیونکہ ان حضرات کے نزدیک ایمان نام ہے دین اسلام کے تصدیق کا اور کفر اس کے تصدیق نہ کرنے کو کہا جاتا ہے، جبکہ تصدیق و تکذیب کا محل قلب ہی ہے، زبان و بیان کو محض اس کا ترجمان ہی کہا جا سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد جب وحی کا سلسلہ ختم ہوا تو اس کے بعد کسی کو یقینی طور پر منافق کہنا بھی جائز نہیں کیونکہ منافق نام ہی اس شخص کا ہے جو زبان سے اقرار کے باوجود صرف دل ہی دل میں کفر چھپائے رکھے اور دل میں کفر کے موجود ہونے کے ہمارے پاس کوئی یقینی ذرائع موجود نہیں۔

ان دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کفر او تکفیر دونوں کے وسائل واسباب میں بھی فرق واضح ہو گیا کہ کفر کا موجب صرف اعتقاد ہی ہے جبکہ تکفیر کا مدار کسی مکلف شخص کا قول یا فعل بھی ہو سکتا ہے، ذیل میں اسی کی مزید وضاحت کی جاتی ہے۔

کفر کا موجب: اعتقاد

علم کلام کی اصطلاح میں اعتقاد اور عقیدہ اس پختہ یقین اور ناقابل تردید نظریہ کا نام ہے جس کا تعلق صرف دل و دماغ کے ساتھ ہو، عمل سے اس کا کوئی خاص

واسطہ نہ ہو، اسلامی عقائد کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں، ایک قسم ان عقائد کی ہے جس کو متکلمین "ضروریات دین" کہتے ہیں اور ایک قسم اس کے علاوہ دیگر عقائد کی ہے، ان دونوں کے احکام یکساں نہیں بلکہ کچھ فرق ہے جس کو سمجھنے سے پہلے دونوں کی تعریف، مفہوم اور مصداق کو جاننا ضروری ہے۔

ضروریاتِ دین کی تعریف

"ضروریات" ضروری کی جمع ہے، ضروری لغت میں عام طور پر اس کام کو کہا جاتا ہے جس کے کرنے نہ کرنے کا اختیار نہ ہو، بلکہ کرنا لازم ہے، عام طور پر یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے لیکن مختلف فنون میں اس کا مفہوم بھی مختلف ہے۔

علم منطق کی اصطلاح میں ضروری کا مفہوم

علم منطق کی اصطلاح میں علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ علم جو نظر واستدلال پر موقوف ہو اور دوسری قسم اس علم کی ہے جو نظر واستدلال کے بغیر ہی حاصل ہو جائے، پہلی قسم کو "نظری" اور دوسری قسم کو "ضروری" کہا جاتا ہے، اس اصطلاح کے مطابق ضروری سے مراد ان اشیاء کا جاننا ہے جس کو جاننے کے لئے کسی غور وفکر کی ضرورت نہ ہو بلکہ یوں ہی حاصل ہو جائے۔

علم کلام کی اصطلاح میں ضروری کا مفہوم

علم کلام کے ماہرین نے اس کی دو قسم کی تعریفیں کی ہے، بعض حضرات نے اس کی یہ تعریف فرمائی کہ اس سے مراد وہ علم ہے جس کے جاننے سے انسان کو کوئی چارہ کار نہ ہو، وہ چاہے نہ چاہے بہر حال اس کا علم حاصل ہو جائے جیسے بھوک وپیاس کہ

انسان کی چاہت کے بغیر بھی اس کا احساس وادراک ہو ہی جاتا ہے، اس کے مفہوم جاننے کے لئے کسی غور و فکر کی کوئی ضرورت نہیں، تو اس چیز کا علم ضروری ہے۔

دوسرے متکلمین نے اس کی تعریف یہ کی کہ جن اشیاء کا علم انسان کے قدرت واختیار میں نہ ہو تو وہ ضروری ہے، شیخ محمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قسم کی تعریف نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

ولا شكّ أنّه إذا لم يكن تحصيله مقدورا لم يكن الانفكاك عنه مقدورا وبالعكس، لأنّه لا معنى للقدرة إلّا التمكّن من الطرفين، فإذا كان التحصيل مقدورا يكون تركه الذي هو الانفكاك مقدورا وكذا العكس، أي إذا كان الانفكاك مقدورا يكون تركه الذي هو التحصيل مقدورا فمؤدّى العبارتين واحد.

"یہ یقینی بات ہے کہ جب اس کو حاصل کرنا اختیار میں نہیں ہے تو اس سے جدا رہنا بھی قدرت میں نہیں ہوگا اسی طرح برعکس بھی ہے، کیونکہ قدرت تو کہتے ہی اس کو ہے کہ دونوں پہلو اختیار میں ہو، لہٰذا جب حاصل کرنا قدرت میں ہے تو جدا رہنا بھی اختیار میں ہوگا اور جب جدا رہنا ممکن ہوگا تو حاصل کرنا بھی قدرت میں رہے گا، دونوں عبارتوں کا حاصل ایک ہی ہے"[1]

دونوں تعریفوں کا حاصل یہ ہوا کہ جس چیز کا علم فکر و نظر کے بغیر حاصل ہو جائے وہ ضروری ہے، لہٰذا اس تعریف کے مطابق حواسِ خمسہ سے حاصل

---

[1] كشاف اصطلاحات الفنون والعلوم، حرف الضاد، الضروری، ج۲ ص۱۱۱٦.

ہونے والا علم ضروری ہے مثلاً زید کو کھڑا ہوتے دیکھا یا تلاوت کرتے ہوئے سنا، اب زید کے کھڑے ہونے یا تلاوت کرنے کا علم متکلم کو حاصل ہوا لیکن اس کے حصول میں اس کو کسی غور وفکر کی ضرورت نہیں پڑی، یہ علم ضروری ہے، اسی طرح باطنی حواس خمسہ سے حاصل ہونے والے علم کا بھی یہی حکم ہے مثلاً زید کے سر میں تکلیف ہے اس کو اپنے تکلیف کا احساس ہوا، اس احساس میں اس کو کسی غور وفکر کی ضرورت نہیں پڑی، لہٰذا یہ علم بھی ضروری ہے۔

جن چیزوں سے انسان کا ہر وقت واسطہ رہتا ہے اس کا علم بھی چونکہ یوں ہی بلا کسب حاصل ہوتا ہے اس لئے وہ بھی ضروری کے ضمن میں داخل ہے، اسی طرح وہ بنیادی باتیں جو انسان کو خود بخود معلوم ہو جاتے ہیں کسی سے سیکھنے سمجھنے کی ضرورت نہ ہو، مثلاً اس بات کا علم کہ دو اور دو مل کر چار بنتے ہیں، یہ ساری باتیں "ضروری" کے تحت داخل ہیں۔

ضروریات دین کا مطلب

اس تفصیل کے مطابق "ضروریاتِ دین" کا مطلب یہ ہوا کہ دین کے وہ بنیادی مسائل واحکام جن کا علم اتنا عام ومشہور ہو کہ جس کے سمجھنے میں دلیل وبرہان کی ضرورت نہ ہو بلکہ ہر خاص وعام کو معلوم ہو مثلاً نماز یا روزے کی فرضیت کا علم، ہر مسلمان کو اس کا علم ہے، قیامت کا قائم ہونا بھی ایسا ہی ایک مسئلہ ہے جس کا ہر عام و خاص مسلمان کو علم ہے، حضرات متکلمین نے بھی ضروریات دین کا یہی مفہوم بیان فرمایا ہیں۔

چنانچہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

والمراد "بالضروريات"على ما اشتهر في الكتب: ما علم كونه من دين محمد صلى الله عليه وسلم بالضرورة، بأن تواتر عنه واستفاض، وعلمته العامة، كالوحدانية، والنبوة، وختمها بخاتم الأنبياء، وانقطاعها بعده.

"ضروریات (دین) سے مراد وہ امور ہیں جن کا دین محمدی ﷺ سے ہونا بداہۃً معلوم ہو، یعنی حضور ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت اور اس حد تک مشہور ہو کہ عام لوگ بھی اس کو جانتے ہوں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی توحید، نبوت اور حضور ﷺ کی ختم نبوت۔"[1]

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کی ذکر کردہ یہ تعریف حقیقت میں تمام متکلمین کے ذکر کردہ تفصیلات کا خلاصہ ہے، اس تعریف سے ضروریات دین کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے، البتہ اس کے متعلق مندرجہ ذیل چند ضروری مسائل کا جاننا بھی ضروری ہے۔

ضروری سے حکم کا بدیہی ہونا ضروری نہیں؟

"ضروریاتِ دین" کی اصطلاح سمجھنے میں بعض اوقات یہ غلط فہمی پیش آجاتی ہے کہ یہاں ضروری بدیہی کے معنی میں ہے، لہٰذا جو حکم بدیہی اور واضح ہو اسی کے منکر کو کافر کہا جا سکتا ہے، جو حکم غور و فکر کے بغیر سمجھ نہ آسکے وہ چونکہ اس اصطلاح کے مطابق ضروری نہیں ہے، اس لئے اس کا منکر بھی کافر نہیں، اس نقطہ نظر کے مطابق صرف بدیہیات کا منکر کافر ہے اور جو احکام نظری ہیں ان کا منکر کافر نہیں۔

---

[1] إكفار الملحدين في ضروريات الدين،ص:٢.

اس غلط فہمی کا اصل منشا یہی ہے کہ لفظ "ضروری" کو حکم کا صفت قرار دیا گیا اور اس کو بدیہی کے معنی میں لیا گیا، حالانکہ یہاں "ضروری" کا تعلق ثبوت کے ساتھ ہے اصل حکم کے ساتھ نہیں، یعنی جس حکم کا شریعت سے ثابت ہونا مندرجہ بالا معنی کے مطابق ضروری ہو، وہ اس فہرست میں داخل ہوگا، اور جس حکم کا ثبوت اس درجے کا یقینی اور قطعی نہ ہو، وہ ضروریات دین میں بھی داخل نہیں، اس کا مفہوم صرف اسی قدر ہے، حکم کے بدیہی ہونے یا نظری ہونے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اگر حضرات متکلمین اور اصولیین کے ذکر کردہ تمام مثالوں پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے، کیونکہ ان حضرات نے "ضروریات دین" کو سمجھانے کے لئے اپنی کتابوں میں جو جو مثالیں بیان فرمائی، ان میں سے اکثر مثالیں منطقی اصطلاح کے مطابق نظری ہی ہیں، مثلاً قیام قیامت، حشر اجساد۔۔۔ لیکن چونکہ شریعت اسلام میں اس کا ثبوت قطعی اور بالکل واضح ہے اس لئے اس کو بالاتفاق ضروریات دین میں شمار کیا گیا۔

علامہ کشمیری کی عبارت

متاخرین حضرات احناف میں سے امام العصر حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اس غلط فہی کو دور فرمایا، آپ اپنی کتاب "اکفار الملحدین" میں تحریر فرماتے ہیں:

فالضرورة في الثبوت عن حضرة الرسالة، وفي كونه من الدين، لا من حيث العمل، ولا من حيث الحكم المتضمن، فقد يكون حديث متواتراً ويعلم ثبوته عنه صلى الله عليه وسلم ضرورة، ولابد، ويكون الحكم المتضمن فيه نظرياً من حيث العقل، كحديث عذاب القبر،

ثبوته عنه صلی الله علیه وسلم مستفیض، وفهم كيفية العذاب مشكل.

"ضرورت یعنی بداہت سے مراد یہ ہے کہ حضور ﷺ سے ثابت ہونے اور دینی حکم ہونے میں بدیہی ہو، عمل اور اصل حکم کے اعتبار سے بدیہی ہونا (کوئی) ضروری نہیں، بسا اوقات کوئی حدیث متواتر ہوتی ہے اور حضور ﷺ سے بداہت کے ساتھ ثابت ہوتی ہے لیکن جس حکم پر وہ مشتمل ہوتی ہے وہ عقل (ومنطق) کے لحاظ سے نظری ہوتا ہے مثلاً عذاب قبر کی حدیث کہ حضور ﷺ سے ثبوت مشہور ہے لیکن عذاب کی اصل کیفیت پہچاننا مشکل اور نظری ہے۔"[1]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ "ضروریات دین" میں لفظ "ضروری" سے مراد یہ ہے کہ اس کا ثبوت بدیہی ہو، اس کے لئے اس حکم کا فرض وواجب ہونا لازم ہے نہ ہی حکم کا بدیہی ہونا شرط ہے بلکہ صرف یہی کافی ہے کہ جس دلیل سے یہ حکم ثابت ہے، اس کا ثبوت بدیہی ہو۔

علامہ عثمانی کی واضح عبارت

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ مزید وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

والمراد حصول العلم الضروري بثبوته عن النبي صلي الله عليه وسلم لا كون الثابت ضروريا، وهذا العلم انما يحصل بالتواتر

[1] إكفار الملحدين في ضروريات الدين،ص٣.

"اصل مقصود کسی حکم کے ثبوت کا بدیہی طور پر معلوم ہونا ہے، ثابت شدہ حکم کا بدیہی ہونا ضروری نہیں، اور ثبوت میں بداہت کا درجہ تواتر کے ساتھ ثابت ہوتا ہے۔"[1]

"ضروریات دین" کیا ہیں؟

ضروریات دین کی کوئی جامع ومانع فنی تعریف شریعت نے مقرر نہیں کی نہ ہی مخصوص عقائد و نظریات کو اس عنوان میں داخل قرار دیا ہے بلکہ یہ اہل سنت والجماعت کے متقدمین اور متاخرین حضرات متکلمین کی بنائی ہوئی ایک اصطلاح ہے کہ دین کا جو مسئلہ اس حد تک مشہور ہو جائے جو عوام وخواص کو بلا تکلف معلوم ہو، وہ ضروریات دین کی فہرست میں داخل ہو جاتا ہے اور جو اس حد تک مشہور نہ ہو وہ ضروریات دین میں سے بھی نہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اصطلاح کی بنیاد شہرت پر ہے، کسی مسئلہ کو اسلامی معاشرے میں عام ہونے سے ہی اس عنوان میں جگہ ملتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا تعلق کسی مسئلہ کے بار بار تذکرہ کرنے اور چرچا کرنے سے ہے جو مسئلہ معاشرہ میں بار بار بیان کیا جاتا رہے، محراب ومنبر سے اس کا تذکرہ ہوتا رہے تو ایک حد تک چلنے کے بعد وہ سب لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے، اور اگر یہی صورت حال باقی رہی تو نئی نسلوں تک کو بھی وہ مسئلہ بلا تکلف معلوم ہو جاتا ہے یوں اس کو ضروریات دین کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔

---

[1] فتح الملهم، كتاب الايمان، ج١ص٤٠٥.

اور اگر اسی مسئلہ سے کسی دوسرے معاشرے میں پہلو تہی کی جاتی رہے، جن لوگوں کو معلوم ہے وہ اس کا تذکرہ اس حد تک نہ کریں، لوگوں کے درمیان شہرت نہ ہونے کی وجہ سے اکثریت اس سے بے خبر رہیں تو اس معاشرے میں اس مسئلہ کو ضروریات دین کہنا اصول کے مطابق درست نہیں ہوگا۔

ماحول اور زمانے کا اثر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "ضروریات دین" ہر علاقہ کے علمی فضا کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں، یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہمارے قدماء متکلمین نے جس چیز کو اپنے معاشرے کے لحاظ سے ضروری قرار دیا تھا، ہمارے ہاں بھی اس کی وہی حیثیت باقی رہے اور اس کی بناء پر تکفیر کی جائے، نہ ہی یہ کوئی لازم ہے کہ جس مسئلہ کو ایک مکمل دینی اور مذہبی معاشرے میں یہ مقام حاصل ہو وہ پوری دنیا میں اپنی یہی حیثیت برقرار رکھے اور ہر جگہ اس کو "ضروریات دین" میں سے شمار کیا جائے، اگر کوئی اس کا انکار کرے یا اس میں نامناسب تاویل کرے تو فوراً ہی اس کو کافر قرار دیا جائے، کیونکہ ممکن ہے کہ جس معاشرے میں انکار یا تاویل کا یہ جرم کیا جا رہا ہے، اس معاشرے میں اس مسئلہ کو یہ حیثیت حاصل نہ ہو۔

علامہ ہیثمی کی تصریح

علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قد یکون الشئی متواترا معلوما بالضرورۃ عند قوم دون غیرھم فیکفر من تواتر عندہ دون غیرہ

"ایک چیز بعض اوقات بعض لوگوں کے لئے متواتر اور ضروری ہوتی ہے دوسرے لوگوں کی حق میں اس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی، لہٰذا جس کے ہاں متواتر ہو وہ (اس کے انکار کرنے سے) کافر ہو جائے گا اور دوسرا کافر نہیں ہوگا۔"[1]

ضروریات دین کی اصطلاح میں غور کرنے سے بھی بظاہر علامہ ہیثمی کی بات کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ضروری عام طور پر بداہت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو کہ علم کی صفت ہے اور علم کے وسائل، مقدار اور کیفیت میں تمام لوگ یکساں شریک نہیں ہیں بلکہ انسان کی فطرت، ذہانت اور ماحول وغیرہ مختلف عناصر کی وجہ سے اس میں خاصا تفاوت پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں کہ جو چیز ایک عالم دین کے لئے ضروری اور بدیہی کے درجہ میں ہو وہی چیز ایک عام مسلمان کو بھی اس حد تک معلوم ہو۔

حدیث حذیفہ بن الیمان

بعض احادیث سے بھی اس نکتہ کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ سیدنا حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں:

عن حذيفة رضي الله عنه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " يدرس الإسلام كما يدرس وشي الثوب، لا يدرى ما صيام ولا صدقة ولا نسك، ويسرى على كتاب الله عز وجل في ليلة فلا يبقى في الأرض منه آية، ويبقى طوائف من الناس: الشيخ الكبير، والعجوز الكبيرة، يقولون: أدركنا آباءنا على هذه الكلمة لا إله إلا الله فنحن نقولها " فقال صلة: فما تغني عنهم لا إله إلا الله لا

[1] الفتح المبين بشرح الاربعين، شرح حديث جبرئيل، ص:١٥٨

يدرون ما صيام ولا صدقة ولا نسك؟ فأعرض عنه حذيفة رضي الله عنه فردد عليه ثلاثا كل ذلك يعرض عنه، ثم أقبل عليه في الثالثة، فقال:يا صلة، تنجيهم من النار، تنجيهم من النار، تنجيهم من النار"[1]

یہ حدیث اگرچہ اکثر حضرات محدثین نے "کتاب الفتن" میں روایت فرمائی ہیں اور روایت کے سیاق وسباق سے بھی یہی معلوم ہوتاہے کہ یہ آخری زمانے کی کہانی ہے، لیکن بہر حال اس سے اتنی بات متحقق ہو جاتی ہے کہ نماز، روزہ اور صدقہ جیسے اہم اور بنیادی مسائل سے بھی لوگ ناواقف ہوں گے، زمانے کی بگڑی ہوئی صورت حال کی وجہ سےان چیزوں کی ان کوکوئی خبرنہیں ہوگی ، لیکن اس قدر "جہالت" کے باوجود بھی جب تک وہ توحیدورسالت کے قائل ہوں گے تو مسلمان ہی شمار ہوں گے اور جہنم سے ان کو نجات حاصل ہو جائے گی، حالانکہ نماز، روزہ اور صدقہ وغیرہ ضروریات دین میں داخل بلکہ ان میں شاید سرِ فہرست ہیں۔

ضروریات دین میں سے ہونے کے لئے فرض واجب ہونا کوئی ضروری نہیں

جیساکہ سابقہ مباحث میں وضاحت کی گئی کہ متکلمین کی اصطلاح میں ضروریات دین سے وہ مسائل مراد ہوتے ہیں جو عوام وخواص کو یکساں طور پر معلوم ہوتے ہیں،

---

[1] ذكره الحاكم في المستدرك على الصحيحين وعلق عليه بقوله" هذا حديث صحيح على شرط مسلم، ولم يخرجاه "واقرّه عليه الذهبي رحمه الله تعالي، انظر المستدرك،كتاب الفتن والملاحم، رقم الحديث: ٨٦٣٦، ج٤ص٥٨٧.

اس کے جاننے کے لئے کسی غور وفکر کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ کسی مسئلہ کی حیثیت فرض یاواجب کی ہوتب ہی وہ ضروریات دین میں شامل ہو سکتاہے ورنہ نہیں، یہ کوئی ضروری نہیں بلکہ جو مسئلہ بھی تواتر کے ساتھ ثابت ہو، جب وہ مسئلہ اتنا عام اور مشہور ہو جائے جس کی تفصیل پہلے ذکر ہوئی تو وہ ضروریات دین میں سے بن جائے گا۔

لہٰذا اس کے مطابق اگر کوئی شخص مسواک کے مسنون ہونے کا انکار کرے تو بھی اس کو کافر کہا جائے گا، کیونکہ مسواک کی حیثیت اگرچہ فرض واجب کی نہیں ہے بلکہ ایک مسنون عمل ہے، لیکن چونکہ اس کا ثبوت قطعی ہے اور مشہور بھی ہے اس لئے اس کا انکار کفر ٹھہرا۔

علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

لا يريدون أن الإتيان بها بالجوارح لابد منه، كما يتوهم، فقد يكون استحباب شيء أو إباحته ضرورياً يكفر جاحده، ولا يجب الإتيان به، فالضرورة في الثبوت عن حضرة الرسالة، وفي كونه من الدين، لا من حيث العمل، ولا من حيث الحكم المتضمن-- السواك سنة، وإعتقاد سنيته فرض، وتحصيل علمه سنة، وجحودها كفر

"متکلمین کا مقصود یہ نہیں کہ اس فعل کا کرنا بھی ضروری ہو جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات کسی عمل کا مستحب اور مباح ہونا بھی ضروری ہوتا ہے جس کا منکر تو کافر ہوتا ہے لیکن اس کا کرنا ضروری نہیں ہوتا، لہٰذا ضرورت سے ثبوت میں اور دینی حکم ہونے میں ضرورت مراد ہے، عمل کرنے کے اعتبار سے اور نفس حکم کے اعتبار سے ضروری مراد نہیں، جیسا کہ مسواک سنت ہے لیکن اس کے

مسنون ہونے کا عقیدہ رکھنا فرض ہے اوراس علم کو حاصل کرنا سنت ہے انکار کفر ہے۔"[1]

"عوام" کا مفہوم

ضروریات دین کی تعریف میں جو یہ قید لگائی گئی ہے کہ عوام بھی اس کو جانتے ہوں، اس میں عوام سے کون مراد ہے؟ کیا تمام اور ہر قسم کے عوام کا جاننا شرط ہے یااس سے مخصوص عوام مراد ہے؟یعنی ضروریات دین میں سے ہونے کے لئے کیا یہ ضروری ہے کہ دیندار اور غیر دین دار ہر قسم کے عوام اس کو جانتے ہوں یا نہیں؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کیا تمام عوام کا جاننا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر کوئی دینی مسئلہ اکثر عوام کو معلوم ہو لیکن بہت سے اس سے ناواقف بھی ہوں تو وہ مسئلہ ضروریات دین میں سے ہو جائے گا یا نہیں؟

جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے تو اس کے متعلق واضح رہے کہ عوام سے ہر قسم کے عوام مراد نہیں، بلکہ اس سے مقصود وہ عوام ہیں جن کے اندر دینی شعور موجود ہو، دین اور علماءدین سے ان کا تعلق ہو، دین سے بے زار قسم کے عوام کا اس باب میں کوئی دخل نہیں، لہٰذا اگر کوئی مسئلہ بے دین عوام کو معلوم نہ ہو تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ ضروریات دین میں سے بھی نہ ہو، بلکہ اگر وہ مسئلہ تواتر کے ساتھ ثابت ہو، اہل علم اور دین سے تعلق رکھنے والے عوام کو اس مسئلہ کا علم ہو اور وہ اس کو دین کا مسئلہ سمجھتے ہیں تو وہ ضروریات دین میں سے ہو جائے گا۔

---

[1] إكفار الملحدين في ضروريات الدين،ص٣وص٦.

علامہ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

وقوله فما القدر المعلوم من الدين بالضرورة؟ جوابه: أنه قد سبق ضابطه وهو أن يكون قطعيا مشهورا بحيث لا يخفى على العامة المخالطين للعلماء بأن يعرفوه بداهة من غير إفتقار إلى نظر واستدلال.

"رہاں یہ سوال کہ ضروریات دین کی مقدار کتنی ہے؟ تو جواب یہ ہے کہ پہلے اس کا ضابطہ ذکر ہو چکا ہے کہ (دین اسلام کا جو حکم) اس قدر قطعی اور مشہور ہو کہ علماء کرام سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں پر بھی مخفی نہ ہو، بلکہ وہ بھی بداہت کے ساتھ بغیر کسی دلیل و برہان کے جان سکے، (وہ ضروریات دین میں سے ہے)"[1]

اس عبارت میں لفظ" العامة "کے ساتھ" المخالطين للعلماء"کی قید بھی لگائی گئی جس سے معلوم ہوا کہ اس باب میں ہر قسم کے عوام داخل نہیں، بلکہ اس سے مراد عوام میں سے صرف وہی دیندار طبقہ ہے جن کو علماء کرام کی مجلس و صحبت نصیب ہو۔

کیا سب عوام کا جاننا ضروری ہے؟

جہاں تک دوسرے مسئلہ کا تعلق ہے کہ تمام عوام کا جاننا ضروری ہے یا بعض کا جان لینا بھی کافی ہے؟ تو اس کے متعلق یاد رہے کہ سب عوام کا جان لینا کوئی شرط نہیں، بلکہ اکثریت کا علم بھی اس باب میں کافی ہے، لہٰذا اگر کوئی دینی مسئلہ اکثر عوام کو معلوم ہو لیکن بعض عوام کو اس کا کوئی پتہ نہ ہو تو محض بعض عوام کے نہ جاننے کی وجہ سے اس مسئلہ کو ضروریات دین سے نہیں نکالا جا سکتا۔

---

[1] الفتاوى الحديثية ،ص: ١٤١.

علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اکفار الملحدین کے حاشیہ میں یہی لکھا:

"استفاض علمه حتى وصل الى دائرة العوام، وعلمه كواف منهم لاانّ كلامنهم يعلمه وان لم يرفع لتعلم الدين رأسا وحرم توفيقه فان جهله كواف منهم لعدم رغبتهم فى تعلم الدين وعلمه كواف منهم فهوضروريّ"

"ضروریات دین وہ مسائل ہیں جن کا علم اتنا مشہور ہو گیا ہو کہ عوام تک بھی پہنچا ہو اور عوام میں سے بھی کافی حد تک لوگوں کو معلوم ہو، یہ کوئی ضروری نہیں کہ تمام عوام اس کو جانے چاہے وہ دین سیکھنے کے لئے کوئی اقدام نہ کرے۔۔۔[1]

"ضروریات دین" کی تعداد

جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا ضروریات دین کا کوئی واضح معیار شریعتِ مطہرہ نے مقرر نہیں فرمایا بلکہ یہ حضرات متکلمین کی مخصوص اصطلاح ہے جس کی وضاحت پہلے ذکر ہو چکی، حضرات متکلمین نے تمام دینی احکام کے متعلق یہ تفصیل بیان نہیں کی کہ ان میں سے کون کونسے احکام اس فہرست میں داخل ہیں اور کونسے نہیں؟ نہ ہی ایسا کرنا کوئی زیادہ مفید ہے۔

کیونکہ ان حضرات نے عام طور پر جو تعریف ذکر کی ہے جو "اکفار الملحدین" کے حوالے سے اوپر ذکر ہو چکی، اس کے مطابق اس میں کوئی حصر نہیں، بلکہ ہر زمانے اور مختلف ماحول کے ساتھ ساتھ اس میں تفاوت بھی ہوتا رہتا ہے، اس لئے حصر بیان کرنا تو ممکن نہیں، تاہم تقریباً تمام کتابوں میں اس کی کچھ مثالیں بیان کی

---

[1] اکفار الملحدین، ص۲.

گئی، اگران تمام مثالوں کو یکجا جمع کیا جائے تواس سے اس مبحث کے مزید بند دروازے کھل سکتے ہیں اوراس اصطلاح کے حوالے سے درپیش مشکلات کا حل بھی سامنے آسکتا ہے۔

حضرت بنوری رحمہ اللہ کا ایک مفید مقالہ

آج سے بیاسٹھ (٦٢) سال پہلے سن ١٣٤٧ھ میں محدث العصر حضرت علامہ محمد یوسف بنّوری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے موضوع پر ایک مفید مقالہ تحریر فرمایا تھا جواسی سال ہندوستان کے مشہور رسالہ "صدق" میں شائع ہوا تھا، اس مقالہ میں آپ نے "ضروریاتِ دین" کے موضوع پر بھی خاصی مفید بحث فرمائی تھی، اس مقالہ میں انہوں نے علمِ کلام اور اصولِ فقہ کے متعدد کتابوں سے ان مثالوں کو جمع فرمایا تھا جن کو ضروریات دین کے مثال کے طور پر ذکر کیا گیا تھا۔

اس میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

"ضروریات دین کی مثال میں علماءامت اپنی اپنی کتابوں میں دوچار مثالیں ذکر کر دیتے ہیں۔ ناظرین کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ ضروریات دین بس یہی ہیں۔ آگے سلسلہ ختم ہو گیا، یہ چیز جے پوری صاحب کو پیش آرہی ہے۔ حالانکہ ان اکابر کا مقصود محض مثال پیش کرنا ہے، نہ استقصاء، نہ حصر، نہ تخصیص۔ اس غلط فہمی کے ازالے کے لئے ذیل میں ہم ان مثالوں کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں جو سرسری محنت سے مل سکیں۔ تاکہ اس مختصر فہرست سے خود بخود یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ مقصود تمثیل تھی نہ پوری فہرست۔

کتب فقہ، اصول فقہ، کتب کلام اصول حدیث میں ذیل کی مثالیں ملتی ہیں۔

اثبات علم الٰہی، قدرت محیط، ارادہ کاملہ، صفت کلام قرآن کریم، قدم قرآن، قدم صفات باری، حدوث عالم، حشر اجساد، عذاب قبر، جزاء وسزا، رؤیت باری قیامت میں، شفاعت کبریٰ، حوض کوثر، وجود ملائکہ، وجود کراماً کاتبین، ختم نبوت، نبوت کا وہبی ہونا، مہاجرین وانصار کی اہانت کا عدم جواز، اہل بیت کی محبت، خلافت شیخین (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) پانچ نمازیں، فرض رکعات کی تعداد، تعداد سجدات، رمضان کے روزے، زکوۃ، مقادیر زکوۃ، حج، وقوف عرفات، تعداد طواف، جہاد، نماز میں استقبال کعبہ، جمعہ، عیدین، جواز مسح خفین، عدم جواز سب رسول، عدم جواز سب شیخین، انکار جسم، انکار حلول اللہ، عدم استحلال محرمات، رجم زانی محض، حرمت لبس حریر (ریشم پہننا) جواز بیع، غسل جنابت، تحریم نکاح امہات، تحریم نکاح بنات، تحریم نکاح ذوی المحارم، حرمت خمر، حرمت قمار۔ اس وقت یہ اکیاون مثالیں پیش کی گئی ہیں۔"[1]

امام ابنِ حجر ہیتمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی ضروریات دین پر کافی تفصیل سے کلام کیا ہے، اور ضروریاتِ دین کی دو قسمیں بیان فرمائی: اعتقادی اور عملی، پھر اس کے بعد دونوں قسموں کی بہت سے مثالیں بیان فرمائی۔

اگران مثالوں کا حضرت بنّوری رحمہ اللہ تعالیٰ کی مثالوں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو ان میں سے بعض مثالیں تو وہی ہیں جو حضرت بنّوری کے کلام میں ذکر ہو چکی، لیکن بہت سے مثالیں ایسی بھی ہیں جو اس کلام میں مذکور نہیں، بلکہ تقریباً چالیس (۴۰) سے زائد امور وہ ہیں جس کو حضرت بنّوری رحمہ اللہ تعالیٰ نے ذکر نہیں فرمایا[2]

---

[1] احتساب قادیانیت، ج۱۶ص۲۴۴.

[2] الفتاویٰ الحدیثیة، مطلب فی اصول الدین،ص۲٦٦، ۲٦۷.

اگر ان دونوں حضرات کے ذکر کردہ مثالوں کو بھی یکجا جمع کیا جائے تو تقریباً سو (۱۰۰) تک تعداد پہنچ جاتی ہے۔

ضروریات دین کے انکار کا حکم

یہاں تک "ضروریات دین" کی جو تشریح کی گئی، اس کے بارے میں امت کے متکلمین اور مستند فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ اس طریقہ سے ثابت شدہ تمام شرعی احکام پر ایمان لانا لازم ہے، ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار کرنا یا اس میں تردد کرنا بھی کفر ہے۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

قد اختلف في تكفير المخالف بعد الاتفاق علي ان ما كان من اصول الدين وضرورياته يكفر المخالف فيه.

"اصول دین اور ضروریات دین میں اختلاف کرنے والے کے کافر ہونے پر اتفاق ہے اس کے علاوہ مسائل میں اختلاف کرنے والے کی تکفیر میں اختلاف ہے۔"[1]

علامہ ابو البقاء ایوب بن موسی الحنفی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

أما منكر شيء من ضروريات الدين فلا نزاع في إكفاره

"ضروریات دین میں سے کسی چیز کے انکار کرنے کے کفر میں کوئی اختلاف نہیں ہے"[2]

علامہ قاضی عضد الدین رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

---

[1] المسايرة في العقائد المنجية في الاخرة، ص٣٠٣.

[2] الكليات ، فصل الكاف، مصطلح"كفر"(ص: ٧٦٥).

لا نكفر أحدا من أهل القبلة إلا بما فيه نفي للصانع-أو ما علم مجيئه ضرورة أو بمجمع عليه كاستحلال المحرمات.

"ہم اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہیں کرتے مگر باری تعالیٰ کے انکار کرنے کی وجہ سے یاضروریات دین کے انکار کرنے کی وجہ سے، یااس چیز کے انکار کرنے سے جس پر اجماع منعقد ہو"[1]

امام ابن حجر الہیتمی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

اعلم أن التردد في المعلوم من الدين بالضرورة كالإنكار

"جان لو: ضروریات دین میں تردد کرنا بھی انکار کرنے کی طرح ہے۔"[2]

ضروریاتِ دین میں اپنی طرف سے تاویل کرنے کا حکم

اسی طرح ضروریاتِ دین کا جو مفہوم امت کے درمیان متوارث چلا آرہا ہو اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے، بلا دلیل متواتر مفہوم کو چھوڑ کر اپنی طرف سے کوئی تاویل وتوجیہ کرنا بھی الحاد وزندقہ ہے۔

مثلاً قرآن وسنت کے متواتر نصوص سے عقیدہ "ختم نبوت" واضح طور پر ثابت ہوتا ہے اور امت کے درمیان اس کا مفہوم بھی بالکل سادہ اور بے غبار طریقہ سے تواتر کے ساتھ متوارث چلا آرہا ہے، اب اگر کوئی شخص ان نصوص کے ہوتے ہوئے ختم نبوت کا انکار کرے تو وہ کافر ہے کیونکہ وہ ضروریات دین کا منکر ہے اور ضروریات دین کا انکار یقیناً کفر ہے۔

---

[1] المواقف، الفرقة السابعة المشبهة، ج٣ص٧١٧.

[2] الفتاوى الحديثية لابن حجر الهيتمي، ص: ١٤٢.

اسی طرح اگرکوئی دعوی کرے کہ میں ان نصوص کو بالکل درست تسلیم کرتا ہوں،اوران نصوص کے مطابق حضور ﷺ یقیناخاتم النبیین ہے، لیکن اس کے بعد "ختم نبوت" کے متواتر ومتوارث مفہوم میں اپنی طرف سے توجیہات شروع کرے اور ظلی، بروزی وغیرہ کی لاحاصل تاویل کرتا پھرے تو یہ بھی کافر ہے کیونکہ جس طرح ان نصوص کے الفاظ متواتراور قطعی ہیں ،بعینہ اسی طرح اس کا مفہوم ومصداق بھی متواتر ہے جوامت کے درمیان قرنِ اول سے آج تک متوارث چلاآرہاہے۔

علامہ ابن الوزیرالیمانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لا خلاف في كفر من جحد ذلك المعلوم بالضرورة للجميع وتستر باسم التأويل فيما لا يمكن تأويله كالملاحدة في تأويل جميع الأسماء الحسنى بل جميع القرآن والشرائع والمعاد الأخروي من البعث والقيامة والجنة والنار

"جو شخص ضروریات دین میں سے کسی حکم کاانکار کرے اور ناقابل تاویل مسائل میں تاویل کالبادہ اوڑھ کراپنے آپ کوچھپائے تواس کے کافر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، جیسے ملحدین جو اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء حسنی میں تاویل کرتے ہیں بلکہ پورے قرآن مجید، دین اور آخرت کے امور میں تاویل کاسہارالیتے ہیں۔"[1]

اکفارالملحدین کاخلاصہ

امام العصر حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے خاص اس مسئلہ کے متعلق "اکفارالملحدین فی ضروریات الدین" کے نام سے ایک پوری تحقیقی کتاب تحریر فرمائی

[1] إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات،ج١ ص ٣٧٧.

جس پر ہندوستان کے اکابر علماء کے تقریظات موجود ہیں، اس کتاب کے آخر میں خود مؤلف رحمہ اللہ تعالیٰ نے کتاب لکھنے کی وجہ بیان فرمائی جو در حقیقت پوری کتاب کا خلاصہ ہے۔

آپ لکھتے ہیں:

أن التصرف في ضروريات الدين، والتأول فيها، وتحويلها إلى غير ما كانت عليه، وإخراجها عن صورة ما تواترت عليه كفر، فإن ما تواتر لفظاً أو معنى، وكان مكشوف المراد، فقد تواتر مراده، فتأويله رد للشريعه القطعية، وهو كفر بواح، وإن لم يكذب صاحب الشرع، وإنه ليس فيه إلا الإستتابة.

"ضروریات دین میں تصرف وتاویل کرنااوراس کے متواتر اور امت کے درمیان معروف مفہوم سے نکال کر دوسری طرف پھیرنا کفر ہے، کیونکہ جو چیز لفظی یا معنوی لحاظ سے متواتر ہواوراس کا معنی بھی واضح ہو تو بس اس کا معنی مراد بھی متواتر ہو گیا، اب اس کے بعد اس کی تاویل کرنا در حقیقت شریعت کے قطعی حکم کو رد کرنا ہے جو کہ صریح کفر ہے۔"[1]

ضروریات دین کے علاوہ قطعی احکام کے انکار کا حکم اور فقہاء کرام کا موقف

متکلمین حضرات عام طور پر جب یہ بحث ذکر کرتے ہیں کہ کن امور کے انکار سے کوئی کافر ہو جاتا ہے اور کونسے ایسے امور ہیں جن کے انکار سے کسی کو کافر نہیں

---

[1] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، خاتمة، ص١٢٨.

قرار دیا جاسکتا؟ تو اس میں یہ قید بھی ذکر فرماتے ہیں کہ شریعت کا جو حکم قطعی ہو اور وہ "ضروریاتِ دین" میں سے بھی ہو، اس کا انکار کفر ہے۔

اس قید کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر شریعت کا کوئی حکم اصولی طور پر تو قطعی ہو لیکن وہ ضروریاتِ دین کے قبیل سے نہ ہو تو اس کا انکار فسق و گمراہی تو ہے لیکن محض اس کی بنیاد پر کسی کو کافر قرار دینا درست نہیں، چنانچہ شریعت کے بہت سے احکام کا یہی حال ہے کہ وہ اپنے ثبوت اور دلالت کے لحاظ سے قطعی ہیں لیکن عوام میں مشہور نہ ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کو "ضروریاتِ دین" کی اصطلاح میں داخل نہیں فرمایا، اس لئے اس کی بناء پر تکفیر بھی درست نہیں ہونی چاہئے۔

مذاہبِ اربعہ میں سے بعض فقہاء احناف کے علاوہ اکثر فقہاء کرام کے ذکر کردہ تفصیلات و جزئیات سے یہی معلوم بھی ہوتا ہے، لیکن بہت سے فقہاء احناف نے اس قید کو غیر ضروری قرار دیا اور یہ تحریر فرمایا ہے کہ جب شریعت کا کوئی حکم اصولی طور پر قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ ہو تو اس پر ایمان لانا ضروری ہے اور اس کا انکار کرنا کفر ہے جس کی وجہ سے انکار کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، اگرچہ یہ حکم اصطلاحی طور پر ضروریات دین میں داخل نہ ہو۔

چنانچہ محقق ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

اما ما ثبت قطعا ولم يبلغ حد الضرورة كاستحقاق بنت الابن السدس من البنت باجماع المسلمين فظاهر كلام الحنفية الاكفار بجحده لانهم لم يشترطوا سوي القطع في الثبوت.

"جو بات قطعی طور پر ثابت ہو مگر "ضرورۃ" کی حد تک نہ پہنچی ہو۔۔ تو احناف کے کلام کا مقتضی یہ ہے کہ ان جیسے احکام کا انکار بھی کفر ہے کیونکہ ان کے نزدیک قطعی ثبوت کے علاوہ تکفیر کے لئے کوئی شرط نہیں ہے۔"[1]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے اس موقف کو ذکر کرنے کے بعد اسی کو ترجیح دی اور لکھا کہ دلیل کے اعتبار سے یہ موقف مضبوط ہے۔[2]

علامہ بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

الحق أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة إلا بإنكار متواتر من الشريعة عن صاحبها فأنه يكون حينئذ مكذبا للشرع وليس مخالفة القواطع مأخذ التكفير، وإنما مأخذه مخالفة القواعد السمعية القطعية طريقا ودلالة. وعبر بعض الأصوليين عن هذا بما معناه أن من أنكر طريق إثبات الشرع لم يكفر كمن أنكر الإجماع، ومن أنكر الشرع بعد الاعتراف بطريقة كفر، لأنه مكذب

"حق بات یہ ہے کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو کافر نہ کہا جائے مگر یہ کہ وہ ایسے حکم کا انکار کرے جو صاحب شریعت ﷺ سے تواتر کے ساتھ ثابت ہو کیونکہ تواتر کے ساتھ ثبوت کے بعد وہ شریعت کا تکذیب کرنے والا بن جائے گا۔۔"[3]

---

[1] المسايرة، الخاتمة:ص٣٠٠

[2] اكفار الملحدين، مقدمة، ص:٧

[3] المنثور في القواعد الفقهية،حرف الكاف، الكفر،٩١/٣

جن فقہاء کرام کے نزدیک صرف ضروریات دین کا انکار کفر ہے

اس کے برعکس بعض حضرات نے تکفیر کے لئے ایک ضروری شرط یہ بھی ذکر فرمائی کہ جس چیز کے انکار کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جارہا ہو، وہ "ضروریات دین" میں سے بھی ہو، اگر کوئی شخص کسی ایسے حکم شرعی کا انکار کر بیٹھے جو اصولی لحاظ سے تو قطعی ہو لیکن "ضروریات دین" میں سے نہ ہو تو محض اس کے انکار سے کوئی کافر نہیں ہوگا۔

امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وأما الفقهية فالقطعية منها وجوب الصلوات الخمس والزكاة والحج والصوم وتحريم الزنا والقتل والسرقة والشرب، وكل ما علم قطعا من دين الله فالحق فيها واحد وهو المعلوم والمخالف فيها آثم. ثم ينظر فإن أنكر ما علم ضرورة من مقصود الشارع كإنكار تحريم الخمر والسرقة ووجوب الصلاة والصوم فهو كافر؛ لأن هذا الإنكار لا يصدر إلا عن مكذب بالشرع، إن علم قطعا بطريق النظر لا بالضرورة ككون الإجماع حجة وكون القياس وخبر الواحد حجة وكذلك الفقهيات المعلومة بالإجماع فهي قطعية فمنكرها ليس بكافر لكنه آثم مخطئ.[1]

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرنے کے بعد بطورِ خلاصہ ذکر کرتے ہیں کہ:

---

[1] المستصفى،القطب الرابع، الفن الاول، النظر الثاني،ص: ٣٤٨.

الحاصل أن المذهب عدم تكفير أحد من المخالفين فيما ليس من الأصول المعلومة من الدين ضرورة.

"خلاصہ یہ ہے کہ اصل مذہب کے مطابق ضروریات دین کے علاوہ مسائل میں اگر کوئی اختلاف کرے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔"[1]

متاخرین حضرات فقہاء کرام نے اس قید کو مزید اہتمام کے ساتھ ذکر فرمایا جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ فقہاء شافعیہ میں سے امام رافعی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اجماعی حکم کے انکار کرنے والے کو کافر قرار دیا کیونکہ اجماعی حکم قطعی ہوتا ہے اور قطعی کا انکار کفر ہے، اس لئے مزید کوئی شرط نہیں لگائی کہ وہ حکم ضروریات دین میں سے بھی ہو، تو علامہ نووی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس اطلاق کو تسلیم نہیں کیا بلکہ بڑی وضاحت کے ساتھ یہ تحریر فرمایا کہ یہ حکم تب ہی ہوگا جب کہ وہ حکم ایسا ہو جو عوام اور خواص کے درمیان مشہور ہو، ورنہ صرف اجماع ہونے (یا قطعی ہونے) کی وجہ سے کسی کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا۔

امام نووی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

قلت: أطلق الإمام الرافعي القول بتكفير جاحد المجمع عليه، وليس هو على إطلاقه، بل من جحد مجمعا عليه فيه نص، وهو من أمور الإسلام الظاهرة التي يشترك في معرفتها الخواص والعوام، كالصلاة، أو الزكاة، أو الحج، أو تحريم الخمر، أو الزنا، ونحو ذلك، فهو كافر. ومن جحد مجمعا عليه لا يعرفه إلا الخواص، كاستحقاق بنت الابن

---

[1] البحر الرائق مع منحة الخالق، كتاب الصلاة، باب الإمامة، ج١ص٣٦٤.

السدس مع بنت الصلب، وتحريم نكاح المعتدة، وكما إذا أجمع أهل عصر على حكم حادثة، فليس بكافر، للعذر، بل يعرف الصواب ليعتقده. ومن جحد مجمعا عليه، ظاهرا، لا نص فيه. ففي الحكم بتكفيره خلاف يأتي – إن شاء الله تعالى – بيانه في باب الردة،[1]

سابقہ تفصیلات کا حاصل

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حضرات متکلمین اور فقہاء کرام سے دونوں قسم کی عبارات ملتی ہیں، بعض عبارات سے واضح ہوتا ہے کہ کسی شخص کو اس وقت ہی کافر کہا جاسکتا ہے جب وہ ضروریات دین میں سے کسی حکم کا انکار کر بیٹھے جب کہ بعض دیگر عبارات میں یہ عموم ملتا ہے کہ شریعت کا جو بھی حکم اس حد تک ثابت ہو کہ شارع ﷺ سے اس کا ثبوت اور اپنے مفہوم پر دلالت کرنے میں وہ بالکل محکم اور قطعی ہو تو اس کا انکار کرنا کفر ہے اگرچہ وہ ضروریات دین کی حد تک مشہور نہ ہو۔

قولِ فیصل

مندرجہ ذیل وجوہات کی بناءپر بظاہر یہی موقف راجح معلوم ہوتا ہے کہ نفس تکفیر کے لئے ضروریات دین میں سے ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شرعی اصولی اصطلاح کے مطابق قطعی الثبوت والدلالۃ ہو تو اس کا انکار بھی کفر ہے اگرچہ وہ ضروریات دین میں سے نہ ہو، تاہم تکفیر سے پہلے مخاطب کو مسئلہ کی حقیقی صورت حال

---

[1] روضة الطالبين وعمدة المفتين، كتاب الجنائز، باب تارك الصلاة، ج٢ص ١٤٦.

سمجھنا ضروری ہے جیسا کہ علامہ ابن ہمام، علامہ ابن حجر اور علامہ کشمیری رحمھم اللہ کے حوالہ سے پہلے ذکر کیا جا چکا۔

پہلی وجہ: اساسِ تکفیر موجود ہے

ایمان وکفر کا دارمدار دل کی تصدیق وعدم تصدیق یا تکذیب کرنے پر ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حکم شرعی کا انکار کفر ہو، یہاں تک کہ اس میں قطعی اور غیر قطعی کی تفریق بھی قرین عقل نہیں، اسی طرح متواتر طریقے پر ثابت ہونے اور نہ ہونے کی تمیز بھی قیاساً درست نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن حجر الہیتمی رحمہ اللہ تعالیٰ اور علامہ بن الہمام نے بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرمایا ہے کہ جو شخص حضور ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھا آپ ﷺ کے دربار اقدس میں حاضر تھا، وہ آپ ﷺ کے کسی بھی قول کا انکار کرے تو اس سے وہ کافر ہو جائے گا لیکن بعد کے ادوار میں ہر حکم کا انکار موجب کفر نہیں رہا بلکہ کم از کم متواتر ہونا ضروری ہے۔

دونوں کے انکار میں فرق یہی ہے کہ دربارِ اقدس میں حاضر شخص یقیناً حضور ﷺ ہی کے ارشاد کا انکار کر رہا ہے جو خود اس نے آپ ﷺ سے سنا اور بعد کے زمانے میں مختلف واسطے آجانے کی وجہ سے تواتر کے بغیر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ حکم خود

حضور ﷺ نے ہی دیا تھا، اس لئے "الیقین لا یزول بالشک" کے تقاضے کے مطابق اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔[1]

اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ مطلقا ہر حکم شرعی کا انکار کفر ہو لیکن چونکہ ہم تک احکام شریعت پہنچنے میں متعدد واسطے بھی درمیان میں آگئے ہیں، احکامِ شرعیہ کا نزول و صدور ہم نے براہ راست نہیں دیکھا بلکہ نقل در نقل ہوتے ہوئے ہم تک پوری شریعت پہنچی، جس کے مختلف درجات ہیں مثلاً خبر واحد، خبر مشہور اور خبر متواتر وغیرہ۔ ہمارے پاس شریعت اسلام کے پہنچنے کے یہ مختلف درجات ہیں، نقل کی ان تمام صورتوں میں سے بعض صورتیں ایسی بھی ہیں جس کے بارے میں سو فیصد یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مثلاً یہ حکم حضرت رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

واضح رہے کہ ثقہ اور بااعتماد راویوں کی نقل کرنے کی وجہ سے بہرحال غالب گمان حاصل ہو ہی جاتا ہے جو وجوبِ عمل کے لئے کافی ہے، کوئی بھی شخص اپنے معاشرتی زندگی میں بھی ہر بات کے لئے یقین ہی کو معیار نہیں بناتا بلکہ بسا اوقات ایک دو نیک لوگوں کی بات سن کر بھی اکثر لوگ مطمئن ہو ہی جاتے ہیں اور اسی کے مطابق کام کرنے لگتے ہیں، یہی حال شرعی احکام کا بھی ہے کہ بہت سے احکام یقینی دلائل سے ثابت

---

[1] الفتاویٰ الحدیثیة، مطلب فی اصول الدین، ٢٦٧، والمسامرة مع المسایرة، الخاتمة في بحث الایمان، ص: ٢٩٩.

ہے اور عملی مسائل کے لئے یقین کو معیار نہیں بنایا گیا بلکہ غالب گمان اور اطمینان بخش دلائل کو بھی اس باب میں قبول کیا گیا ہے۔

لیکن جیسا کہ پہلے یہ بات واضح کی گئی کہ تکفیر کے باب میں ظن غالب کافی نہیں، کیونکہ جس شخص کی تکفیر کی جارہی ہے، پہلے سے اس کا مسلمان ہونا بالکل یقینی ہے تو اس یقینی اسلام کو یقینی کفریہ عمل ہی کی وجہ سے ختم کیا جاسکتا ہے جبکہ اس باب میں غالب گمان یقین کے برابر نہیں۔

"ضروریاتِ دین" کے قید لگانے کی اصل وجہ

حضرات متکلمین اور فقہاء کرام کے بعض عبارات سے بھی اسی علت کا ہونا مفہوم ہوتا ہے، چنانچہ امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

ثم ينظر فإن أنكر ما علم ضرورة من مقصود الشارع كإنكار تحريم الخمر والسرقة ووجوب الصلاة والصوم فهو كافر؛ لأن هذا الإنكار لا يصدر إلا عن مكذب بالشرع، وإن علم قطعا بطريق النظر لا بالضرورة ككون الإجماع حجة وكون القياس وخبر الواحد حجة وكذلك الفقهيات المعلومة بالإجماع فهي قطعية فمنكرها ليس بكافر لكنه آثم مخطئ.

"اگر کسی نے ایسے مقصود شرعی کا انکار کیا جو ضروریات دین میں سے تھا مثلاً شراب اور چوری کی حرمت کا انکار، نماز روزے کے وجوب کا انکار، تو وہ کافر ہے کیونکہ ایسا انکار شریعت کی تکذیب کرنے والے سے ہی صادر ہو سکتا ہے اور اگر کسی ایسے حکم کا انکار کیا کہ جو قطعاً تو ثابت ہو مگر ضروری کی حد تک نہ پہنچا ہو مثلاً اجماع کی حجیت،

قیاس اور خبر واحد کی حجیت یہ اور اس کے علاوہ دیگر فقہی مسائل جن پر اجماع ہے، تو ان امور کا منکر کافر نہیں ہوگا تاہم گناہگار اور خطاکار ضرور ہے۔"[1]

خط کشیدہ قید سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام اور خواص کے درمیان مشہور ہونے کی قید اس لئے لگائی جاتی ہے کہ تکذیب شرع کا ہونا متیقن ہو جائے، کیونکہ اگر شریعت کا حکم اس حد تک مشہور نہ ہو تو اس میں یہ احتمال موجود ہے کہ شارع کی تکذیب نہیں کر رہا اور ظاہر ہے کہ تکفیر کے باب میں تو شبہات کا بڑا دخل ہے، اس لئے ضروریات دین میں سے ہونے کی قید لگائی جاتی ہے کہ جب کوئی مسئلہ معاشرے میں اتنا مشہور ہو کہ عوام و خواص اس کو برابر جانتے ہوں، تو اس کا انکار در حقیقت شریعت ہی کا انکار تصور ہوگا۔

اس تفصیل سے قطعیت کی قید کا فائدہ تو واضح ہوا لیکن ضروریات دین میں سے ہونے کی کوئی اس طرح مضبوط بنیاد معلوم نہیں۔

دوسری وجہ: قطعی اور ضروری کے درمیان اصل فرق

جن احکام کو ضروریات دین کہا جاتا ہے، ان میں قطعی احکام کے مقابلے میں یہ صفت زائد پائی جاتی ہے کہ وہ عوام اور خواص کے درمیان مشہور ہوتے ہیں، اور عام طور پر ہر دیندار شخص کو اس کا حکم شرعی ہونا معلوم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عام طور پر حضرات متکلمین قطعی اور ضروریات دین کے درمیان عموم و خصوص من وجہ کی نسبت قرار دیتے ہیں، قطعی اعم مطلق ہے اور ضروری اخص، ہر ضروری قطعی ہے لیکن

---

[1] المستصفى، القطب الرابع، الفن الاول فى الاجتهاد، ص: ٣٤٨.

ہر قطعی حکم کا ضرویات دین میں سے ہونا کوئی ضروری نہیں، بلکہ کوئی حکم تب ہی ضروریات دین کی فہرست میں جگہ پاسکتا ہے جب وہ قطعی ہونے کے ساتھ ساتھ خواص اور دیندار عوام میں مشہور بھی ہو۔

معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان اسی ایک نکتہ میں فرق ہے جبکہ شہرت کا یہ فرق کوئی ایسی منضبط بنیاد نہیں ہے جس پر ہر حال میں کفر کے پورے باب کا مدار رکھا جاسکے۔

تیسری وجہ:

جن حضرات نے ضروریات دین اور غیر ضروریات کے درمیان اس مسئلہ میں تفریق کی ہیں، ان کے کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کا منشا یہ نہیں ہے کہ تکفیر ہر حال میں ضروریات دین کے انکار کے ساتھ خاص ہے بلکہ اصل مقصود یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی حکم کا انکار کر بیٹھے تو اتمام حجت اور تبلیغ احکام سے پہلے اس کی تکفیر کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ گویا ان حضرات کے کلام میں جس تکفیر کو ضروریات دین کے ساتھ مقید کیا گیا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ تبلیغ احکام سے پہلے انکار کرنے والے کے کفر کا فیصلہ کیا جائے۔

اور اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ جو حکم عوام اور خواص کے درمیان اس قدر مشہور ہو کہ جس کے لئے کسی زیادہ علم و فہم کی بھی ضرورت نہ ہو بلکہ معاشرے کا ہر عالم و جاہل اس کو جانتا ہو، اگر کوئی شخص ایسے حکم کا انکار کر گزرتا ہے تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ شریعت کا قطعی حکم ہے، عوام و خواص

اور پورے معاشرے میں شہرت کے باوجود علم نہ ہونے کا دعویٰ مکابرہ ہی ہے جو قابل قبول نہیں۔

علامہ احمد بن محمد حموی حنفی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

الجهل بالضروريات في باب المكفرات لا يكون عذرا بخلاف غيرها، فإنه يكون عذرا على المفتى به كما تقدم والله أعلم.

"تکفیر کے باب میں ضروریات دین سے ناواقفیت کوئی عذر نہیں بخلاف دیگر مسائل کے کہ مفتی بہ قول کے مطابق ضروریات دین کے علاوہ مسائل میں جہل عذر ہے۔"[1]

اس کے برعکس جو احکام قطعی ہوں لیکن معاشرے میں ان کو شہرت کا ایسا مقام حاصل نہ ہو، اس کا معلوم نہ ہونا البتہ عذر بن سکتا ہے کیونکہ ایمان کے لئے تمام احکام کی تفصیلی تصدیق تو ضروری ہے نہیں بلکہ صرف اجمالی تصدیق بھی کافی تھی اور جب حکم بھی ایسا پوشیدہ اور پیچیدہ ہے تو کم از کم تکفیر کے باب میں، جہاں کمزور احتمال کی موجودگی میں بھی احتیاط کا حکم دیا جاتا ہے، یہ عذر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

علامہ مرتضی یمانیؒ کی عبارت

علامہ مرتضی ابن الوزیر الیمانی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

أن المتواترات نوعان: أحدهما: ما عَلِمَهُ العامة مع الخاصة، كمثل كلمة التوحيد، وأركان الإسلام، فيكفُرُ جاحده مطلقاً، لأنه قد بلغه التنزيل، وإنما رده بالتأويل، وإن لم يعلم هو ثبوت ما جحده من

[1] غمز عيون البصائر في شرح الأشباه والنظائر، كتاب السير، باب الردة، قبيل كتاب اللقيط واللقطة، ج٢ص٢٠٧.

الدين بسبب ما دخل فيه من البدع والشُّبه التي ربما أدت إلى الشك في الضرورات، ودفع العلوم والحجة على التكفير بذلك مع الشكِّ قوله تعالى: {لقد كفر الذين قالوا إن الله ثالثُ ثلاثةٍ} والمعلوم أنهم ما قصدوا تكذيب عيسى، بل قصدوا تصديقه، ويدل على هذا التعليل بالبلوغ، وعلى أن الجهل قبله عذرٌ لا بعده قوله تعالى: {ذلك أنْ لَمْ يَكُنْ رَبُّكَ مهلكَ القُرى بظُلْمٍ وأهلُها غافلون} وهي من أوضح الأدلة على ذلك ولله الحمد.

وثانيهما: ما لا يعرف تواتره إلاَّ الخاصة، فلا يُكفرُ مستحلُّه من العامة، لأنه لم يبلُغه، وإنما يكفر من استحلَّه وهو يعلم حرمته بالضرورة، مثل: تحريم الصلاة على الحائض إلى أمثالٍ لذلك كثيرة، وقد شربلخمر مُستحلاً متأولاً قُدامة بن مظعون الصحابي البدري فجلده عمر، ولم يقتله ويجعل ذلك رِدّةً، وأقرت الصحابة عمر على ذلك، وكان شبهته في ذلك قوله تعالى بعد آية الخمر في المائدة: {ليس على الذين آمنوا وعملوا الصالحات جُناحٌ فيما طَعِمُوا} فدلَّ على أنَّ الشُّبهة قد تدخلُ في بعض الضروريات.[1]

چوتھی وجہ

جیسا کہ سابقہ تفصیلات سے واضح ہو چکا کہ ضروریاتِ دین کا کوئی جامع ومانع معیار شریعت مطہرہ نے مقرر نہیں فرمایا، جن حضرات فقہاء کرام یا متکلمین نے اس پر بحث فرمائی ہیں، انہوں نے بھی اپنے زمانے اور معاشرے کے دینی اور علمی فضا کو دیکھ کر اس کی وضاحت کی۔

---

[1] العواصم والقواصم في الذب عن سنة أبي القاسم، الفصل الثالث: في الإشارة إلى حُجة من كفَّر هؤلاء، ج٤ص ١٧٣.

یہی وجہ ہے کہ قدیم متکلمین نے ضروریات دین کی جو مثالیں ذکر فرمائی ہیں، ان میں سے بعض ایسے بھی مثالیں موجود ہیں جو آج کل بہت سے علم دوست لوگوں کی نظروں سے بھی اوجھل رہتی ہیں، اوراسی بناء پراس کوموجودہ زمانے میں ضروریات دین میں سے شمار کرنا بھی اہل علم کے لئے ایک قابل غور نکتہ ہے۔

لہذا تکفیر جیسے اہم باب کواس پر موقوف کرنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے۔

پانچویں وجہ: قطعی اور ضروری مترادف ہیں یا نہیں؟ تحقیقی مبحث

بہت سے مستند فقہاء کرام اور معتمد متکلمین نے "قطعی" کو "ضروری" کے مترادف قرار دیا ہیں، ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ شریعت کا جو حکم بھی ثبوت اور دلالت دونوں کے اعتبار سے قطعی ہو وہ ضروریاتِ دین میں سے بھی ہے، اوراس کا حکم بھی ضروریاتِ دین والا ہی ہے کہ اگر کوئی اس کا انکار کرے یااس کے متوارث مفہوم کے خلاف کوئی بے جا تاویل کرے تو کافر ہو جائے گا۔

جن حضرات کے نزدیک قطعی اور ضروری مترادف الفاظ ہیں

علامہ ابوالشکور سالمی

علامہ ابوالشکور السالمی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

قال اهل السنة والجماعة شرائط الايمان مايجب الايمان به ولايصح بدونه ويكفر بالانكار والرد وهو كل ماثبت بالنص اوبالمتواتر اوباجماع الامة فانه يوجب القبول والاعتقاد به[1]

---

[1] تمهيد ابي شكور السالمي، القول الرابع في شرائط الايمان، ص٩٨.

"اہل سنت والجماعت نے کہا کہ ایمان کی شرائط وہ ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے اوراس کے بغیر ایمان درست نہیں ہوتا، اس کے رد کرنے اور اس سے انکار کرنے کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے، اور (اس معنی میں ایمان کے شرائط میں) ہر وہ حکم داخل ہے جو نص، یا متواتر یا اجماع امت سے ثابت ہو کیونکہ اس کو قبول کرنا اور اس کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔"

قاضی عیسی بن ابان

امام محمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے مایہ ناز شاگرد رشید اور بصرہ کے دور رس اور عمیق النظر فقیہ و قاضی عیسی ابن ابان رحمہ اللہ تعالیٰ حدیث متواتر کا حکم بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

قال عيسى رحمه الله: والعلم بهذه الأشياء علم اضطرار وإلزام، لما ذكرنا من جملة هذه الشرائع، ردا على النبي عليه السلام كأنه سمع النبي عليه السلام يقول ذلك فرده عليه، فيكون بذلك كافرا، خارجا عن ملة الإسلام، لأن العلم كان علم ضروري، كالعلم بالمحسوسات والمشاهدات، وكالعلم بأنه قد كان قبلنا في هذه الدنيا قوم، وأن الموجودين أولاد أولئك، وكالعلم بأن السماء كانت موجودة قبل ولادتنا، وما جرى مجرى ذلك.[1]

اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ تواتر سے علم اضطراری وبدیہی حاصل ہو جاتا ہے اور متواتر چیز محسوس ومشاہد اشیاء کی طرح یقینی ہوتی ہے، اس کے بعد بھی اگر کوئی اس کا

---

[1] الفصول في الأصول، باب ذكر وجوه الأخبار ومراتبها وأحكامها، ج٣ص٣٥.

انکار کرے تو گویا اس نے خود حضورﷺ کی بات سنی اور پھر اس کی تردید کردی، اور اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز کا موقف

برصغیر کے مشہور فقیہ ومحدث حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

ضروريات الدين عندهم منحصرة فی ثلاثة:

١۔مدلول الكتاب بشرط ان يكون نصا صريحا لايمكن تاويله كتحريم الخمر والميسر واثبات العلم والقدرة والارادة والكلام له تعالي وكون السابقين الاولين من المهاجرين والانصار مرضيين عند الله تعالي وانه لايجوز اهانتهم والاستخفاف بهم.

٢۔مدلول السنة المتواترة لفظا اومعنا سواء كان من الاعتقاديات اومن العمليات وسواءكان فرضااونفلا كوجوب محبة اهل البيت من الازواج والبنات والجمعة والعيدين.

٣۔والمجمع عليه اجماعا قطعيا كخلافة الصديق والفاروق ونحوذلك، ولا شبهة ان من انكر امثال هذه الامور لم يصح ايمانه بالكتاب والنبيين[١]

"خلاصہ عبارت:"ضروریات دین تین ہیں:

ا۔کتاب اللہ کا مدلول بشرطیکہ صریح نص ہو جس میں تاویل ممکن نہ ہو جیسے شراب اور جوا کا حرام ہونا، اللہ تعالیٰ کے لئے علم، قدرت، اراہ اور کلام ثابت کرنا، پہلے

---

[١] فتاوي عزيزي،ص: ٣٩٧.

مہاجرین وانصار کا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ ہونا اور یہ کہ ان کی توہین اور تذلیل جائز نہیں۔

۲۔ سنت متواترہ کا لفظاً اور معنیً مدلول ہو، چاہے اس کا تعلق اعتقادی مسائل کے ساتھ ہو یا عملی مسائل کے ساتھ، چاہے فرض ہو یا نفل جیسے اہل بیت یعنی حضور ﷺ کے ازواج وبنات کی محبت کا ضروری ہونا، جمعہ اور عیدین۔

۳۔ قطعی اجماع سے ثابت شدہ مسائل جیسے حضرت صدیق وفاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت، اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جو کوئی ان جیسی چیزوں کا انکار کرے تو کتاب اللہ اور انبیاء کرام پر اس کا ایمان درست نہیں ہوتا۔"

علامہ کشمیری کا موقف

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" میں حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی اس عبارت کو نقل فرما کر یہی موقف اپنایا کہ ہر قطعی حکم ضروری بھی ہے کیونکہ ضروری کا مفہوم یہی ہے کہ شارع سے اس کا ثبوت اتنا محکم ہو کہ جس میں مزید خوض وکلام کی ضرورت پیش نہ آئے بلکہ جو شخص بھی شریعت کا معتقد ہو، اس کے نزدیک اس حکم کا ثبوت گویا بالکل بدیہی ہو۔

اور ظاہر ہے کہ جو حکم ثابت ہونے کے لحاظ سے بھی قطعی ہو، اپنے مفہوم ومدلول پر دلالت کرنے کے اعتبار سے بھی بالکل قطعی ہو اس میں دیگر احتمالات موجود نہ ہوں، تو ایسے حکم کو یہی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

علامہ بنوری کی تحقیق

محدث العصر حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

جو چیز متواتر ہو جائے وہ دین میں "ضروری" ہو جاتی ہے، کیونکہ متواتر کا افادہ علم ضروری قطعی مسلمات میں سے ہے۔ پس اگر کسی کو علم ہو جائے کہ یہ حدیث احادیث متواترہ میں سے ہے یا یہ بات حدیث متواتر سے ثابت ہے تو اس پر ایمان لانا ضروری ہو جاتا ہے، خواہ اس کا تعلق کائنات ماضیہ سے ہو یا مغیبات مستقبلہ سے، خواہ عقائد کے متعلق ہو خواہ احکام کے بارے میں ہو، تصدیق رسالت کے لئے اس سے چارہ نہیں، ورنہ تکذیب رسول کا کفر ہونا کسی دلیل کا محتاج نہیں۔ بہرحال تصدیق رسول کا ایمان کے لئے ضروری ہونا اور تکذیب سے کفر کا لازم آنا یہ خود دین کی ضروریات میں داخل ہے۔[1]

ایک بنیادی اشکال اور اس کا حل

اس موقف پر اگرچہ یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ شریعت کے قطعی احکام کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان میں سے بہت سے احکام ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ ہر فرد کا کوئی واسطہ پیش نہیں آتا، ممارست نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات اس میں بہت غموض پایا جاتا ہے جس کے نہ جاننے میں عوام معذور ہیں، تو اس کے باوجود ان کو کافر کیسے قرار دیا جائے؟

لیکن اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اس دوسرے موقف اختیار کرنے والوں نے یہ

---

[1] عقید نزول مسیح، ص۲۱.

شرط لگائی کہ جو شخص کسی ایسے قطعی حکم کاانکار کرے، توپہلے اس کو بتلایا جائے کہ جس حکم کا آپ انکار کررہے ہو، یہ شریعت کاہر لحاظ سے قطعی حکم ہے وغیرہ وغیرہ،اس کے بعد بھی اگروہ انکارہی پر مصر رہاتویقیناًیہ ایک حکم شرعی ہی کاانکار تصور ہوگا جس کے کفر ہونے میں کوئی شک نہیں ہونی چاہیئے۔

حنفیہ کے موقف کی توجیہ محققین کی نظر میں

علامہ ابن الہمام کی توجیہ

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ حنفیہ کے اس موقف کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

ويجب حمله على ما إذ علم المنكر ثبوته قطعا لأن مناط التكفير، وهو التكذيب أو الاستخفاف عند ذلك يكون أما إذا لم يعلم فلا إلا أن يذكر له أهل العلم ذلك فيلج[1]

ضروری ہے کہ اس قول کواس صورت پر حمل کیاجائے جبکہ خود منکر کو بھی اس حکم کے قطعیت کے ثابت ہونے کاعلم ہو، کیونکہ تکفیر کادار مدار(جوکہ یا تکذیب ہے یااستخفاف) تبھی متحقق ہوسکتاہے،اگر منکر کواس درجہ ثبوت کاعلم نہ ہوتو تکفیر کرنا درست نہیں،البتہ اگراہل علم اس کوبتائے اور پھر وہ انکارپر اصرار کرتارہے(توپھر البتہ تکفیر کی جائے)

---

[1] كـذا في المسـايرة في العقائـد المنجيـة في الاخرة،الخاتمـة في بحـث الايمـان، ص:٣٠٠، وكـذلك في حاشـية ابـن عابـدين علـى الـدر المختار (كتاب الجهاد،باب المرتد،ج٤ص٢٢٣.

علامہ ہیثمی کی توجیہ

علامہ احمد بن حجر الہیتمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احناف کے موقف کا یہی محمل بیان فرمایا، چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

ولا يكفر بإنكار قطعي غير ضروري كاستحقاق بنت الابن السدس مع بنت الصلب، وظاهر كلام الحنفية كفره ويجب حمله أي بناء على قواعدهم على منكر علم أنه قطعي وإلا فلا يكفر إلا إذا ذكر له أهل العلم أنه من الدين، وأنه قطعي، فتمادى فيما هو عليه عنادا فيكفر لظهور التكذيب منه حينئذ كما دل عليه كلام إمام الحرمين.

"حنفیہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قطعی غیر ضروری حکم کا انکار بھی موجب کفر ہے، لیکن خود ان کے قواعد کے مطابق اس بات کو اس صورت پر حمل کرنا ضروری ہے کہ جہاں انکار کرنے والے کو اس حکم کے قطعی ہونے کا علم ہو ورنہ تو اس کو کافر نہیں کہا جائے گا الّا یہ کہ اہل علم اس کو بتادیں کہ یہ دینی حکم ہے اور قطعی ہے اور اس کے بعد بھی وہ اپنے انکار پر ہٹ دھرمی کے ساتھ اصرار کرے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا کیونکہ اس صورت میں اس سے تکذیب سرزد ہوئی جیسا کہ امام الحرمین نے ذکر فرمایا ہے۔[1]

علامہ کشمیری رحمہ اللہ

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إن إنكار القطعي كفر، ولا يشترط أن يعلم ذلك المنكر قطعيته ثم ينكر فيكون بذلك كافراً على ما يتوهمه الخائلون، بل يشترط قطعيته

---

[1] الفتاوى الحديثية، مطلب: اصول الدين، ص: ٢٦٣.

في الواقع، فإذا جحد شخص ذلك القطعي استتيب، فإن تاب وإلا قتل على الكفر، وليس وراء الاستتابة مذهب كما قال القائل:

وليس وراء الله للمرء مذهب.

"قطعی حکم کا انکار کرنا کفر ہے اور اس میں یہ کوئی شرط نہیں کہ انکار کرنے والے کو اس حکم کا قطعی ہونا معلوم بھی ہو اس کے بعد انکار کرے جیسا کہ خیال کرنے والوں کا وہم ہے، بلکہ کسی حکم کا حقیقت میں قطعی ہونا ہی کافی ہے، جب کوئی شخص اس جیسے قطعی حکم کا انکار کرے گا تو اس سے توبہ طلبی کی جائے گی، اگر توبہ کیا تو بہت اچھا ورنہ قتل کیا جائے گا۔"[1]

علامہ محمد زاہد الکوثری کی توجیہ

علامہ کوثری رحمہ اللہ نے قراءات متواترہ اور اس کے انکار کرنے کے متعلق ایک مختصر سا مقالہ لکھا، اس میں انکار کے حکم میں یہ تفصیل لکھی کہ قراءات کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم ان متواتر قراءات کی ہے جو متواتر ہونے کے ساتھ ساتھ جمہور اہل اسلام کو معلوم بھی ہیں اور دوسری قسم ان قراءات کی ہے جو اگرچہ سنداً تو متواتر ہے مگر اتنی مشہور نہیں کہ عام اہل اسلام کو معلوم ہو سکے، پھر ان دونوں قسموں کے انکار کا حکم لکھتے ہوئے تحریر فرمایا:

"فانكار شيئ من القسم الاول كفر بالاتفاق واما الثاني فانما يعدّ كفرا بعد اقامة الحجة على المنكر وتعنّته بعد ذلك"

"پہلی قسم قراءات کا انکار تو بالاتفاق کفر ہے اور دوسری قسم کی قراءات کے انکار کو تب کفر کہا جا سکتا ہے جبکہ انکار کرنے والے کے سامنے دلیل قائم کی جائے (کہ یہ

---

[1] إكفار الملحدين في ضروريات الدين، ص: ٣٣.

قراءات متواتر ہے) اور اس کے بعد بھی وہ ہٹ دھرمی کرے (اور متواتر قراءات کاانکار کرے)"[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جس طرح ضروریات دین کاانکار کفر ہے اسی طرح اس شرعی حکم کاانکار کرنا بھی کفر ہے جو تواتر کے ساتھ شریعت سے ثابت ہو، تاہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کاانکار تو مطلقاً کفر ہے اور دوسری قسم احکام کے انکار کو تب تک کفر نہیں قرار دیا جائے گا جب تک منکر کے سامنے حجت قائم نہ کی جائے، جب اس کو تسلی بخش طریقے سے اصل حقیقت حال سے آگاہ کر دیا جائے تو اگر اس کے بعد بھی وہ خدانخواستہ انکار ہی پر قائم رہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

علامہ ابن الہمام، علامہ ہیثمی اور علامہ کشمیری رحمہم اللہ کے مندرجہ بالا عبارات سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات نے جو صورت بیان فرمائی ہے اس میں صرف فقہاء حنفیہ ہی کا یہ موقف نہیں بلکہ دیگر فقہاء کرام کا بھی اس پر اتفاق ہے کیونکہ اتمام حجت کے بعد متواتر چیز کے انکار پر اصرار کرنا در حقیقت تکذیب رسالت ہے جس کا کفر ہونا اور اس کا بنائے تکفیر ہونا شاید خود ضروریات دین میں سے ہے۔

چھٹی وجہ: تواتر مفیدِ علمِ ضروری ہے

متواتر کے بارے میں ابتداء سے اختلاف چلا آرہا ہے کہ آیا یہ مفید یقین ہے یا نہیں؟ اور اگر مفید یقین ہے تو یہ یقین کس درجہ کی ہے؟ اصطلاحی الفاظ میں یہ یقین نظری ہے یا ضروری؟

---

[1] مقالات الکوثری، ص ۲۱.

خبرِ متواتر کے متعلق جمہور امت کا موقف

جمہور امت کا ہمیشہ سے یہ موقف رہا ہے کہ خبر متواتر مفید یقین ہے، اس کا مفہوم قطعی اور یقینی ہوتا ہے اور یقین بھی "ضروری" ہے، یہاں ضروری کا معنی یہ ہے کہ اس میں غور و فکر کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ جوں ہی تواتر کا علم ہو جائے تو ساتھ ہی یقین حاصل ہو جاتا ہے اس میں مزید مقدمات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

واضح رہے کہ ان جیسے مباحث میں اصولیین ضروری کی اصطلاح استعمال فرماتے ہیں لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہوتا ہے کہ یہ حکم بدیہی ہے بلکہ ان حضرات کے بحث کا موضوع "کسی حکم کا ثبوت" ہے اور جہاں یہ اصول بیان کرتے ہیں کہ متواتر سے حاصل شدہ علم ضروری ہے تو اس کا معنی یہ ہوتا ہے کہ اس کا ثبوت ایسا یقینی ہے جیسا کہ آنکھ، کان وغیرہ حواس خمسہ سے حاصل شدہ بات کا علم، اس میں مزید کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔

علامہ صفی الدین ہندی

علامہ صفی الدین الہندی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس پر کافی تفصیل سے بحث فرمائی کہ تواتر مفید یقین ہے اور یہ یقین ضروری ہے استدلالی نہیں، بعض حضرات نے تواتر سے حاصل شدہ علم کو جو نظری قرار دیا ہے، ان کا موقف درست نہیں بلکہ حق یہی ہے کہ اس سے حاصل شدہ علم ضروری ہے۔

اس باب میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

اختلف القائلون بان التواتر يفيد العلم، اختلفوا في ان ذلك العلم ضروري او نظري؟ فذهب الجمهور من الفقهاء والمتكلمين من

الفريقين الي انه ضروري وهو الحق، وذهب الكعبي وابو الحسين البصري من المعتزلة والدقاق منا الي انه نظري وهو قول امام الحرمين، لانه جعل العلم الحاصل عقيبه من باب العلم المستند الي القرائن

"جو حضرات تواتر کو مفید علم مانتے ہیں، ان کا آپس میں اختلاف ہے کہ اس سے حاصل شدہ علم ضروری ہے یا نظری؟ دونوں فریقوں کے جمہور فقہاء و متکلمین کے نزدیک یہ علم بدیہی ہے اور یہی حق مذہب ہے، جبکہ معتزلہ میں سے کعبی، ابوالحسین بصری اور اہل سنت میں سے علامہ دقاق کا موقف یہ ہے کہ یہ علم نظری ہے، حضرت امام الحرمین کا بھی یہی قول (معلوم ہوتا) ہے کیونکہ اس نے تواتر سے حاصل ہونے والے علم کو ان علوم میں سے قرار دیا ہے جو کہ قرائن سے حاصل ہوتے ہیں۔"[1]

علامہ عبد العلی رحمہ اللہ علامہ بہاری رحمہ اللہ کے کلام کی شرح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

مسئلة: الجمهور علي ان ذلك العلم الحاصل من المتواتر ضروري غير متوقف علي النظر حاصل بالعادة.

"جمہور کے نزدیک تواتر سے حاصل ہونے والا علم ضروری (بدیہی) ہوتا ہے جو کہ نظر و استدلال کے بغیر یوں ہی عام عادت کے مطابق حاصل ہوتا ہے۔"[2]

---

[1] نهاية الوصول في دراية الاصول، المسئلة الثالثة، ص:۲۷۲۷.

[2] فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت، الاصل الثاني :السنة، ج۲ص۱۳۹.

امام غزالی رحمہ اللہ وغیرہ بعض حضرات سے اس مسئلہ میں جو اختلاف منقول ہے، علامہ عبدالعلی رحمہ اللہ نے مندرجہ بالا عبارت کے بعد اس اختلاف میں ایک مناسب تطبیق بھی دی ہے۔

جن حضرات نے شریعت کے ہر قطعی حکم کو "ضروری" قرار دیا ہیں جن کی عبارات پہلے ذکر کی جاچکی، اصولیین حضرات کے ان تفصیلات سے ان حضرات کی فی الجملہ تائید ہوتی ہے۔

ساتویں وجہ: فقہاء کرام کی تصریحات

بہت سے حضرات فقہاء کرام اور متکلمین نے اصولی بحث کے دوران کفر کی بنیاد قطعیات کے انکار پر رکھی، اور یہ قید نہیں لگائی کہ کسی قطعی کا انکار تب ہی موجب کفر ہوگا جب وہ ضروریات دین میں سے بھی ہو، حالانکہ اگر ان حضرات کے کلام کا تتبع کیا جائے تو فی الجملہ اس قید کے یہ حضرات بھی قائل ہیں اور متعدد مسائل کی تفصیل کرتے ہوئے یہ قید لگائی بھی ہیں۔

ان حضرات کے اس طرز عمل سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ کفر کی اصل بنیاد شریعت کے کسی قطعی الثبوت والدلالۃ حکم کا انکار کرنا ہے اور بس۔ جہاں تک ضروریات دین میں سے ہونے کی شرط ہے تو اس کا اضافہ صرف اس لئے کیا جاتا ہے کہ ان جیسے احکامات کے مشہور ہونے کی وجہ سے منکر کے لئے عذر کی کوئی گنجائش نہیں رہ پاتی، جس کی تفصیل پہلے ذکر ہو چکی۔

اس قسم کی چند عبارتیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں۔

علامہ بدر الرشید کی تصریح

۱۔ فقہاءِ احناف میں سے علامہ بدر الرشید رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

فی المحیط: من انکر الاخبار المتواترة في الشريعة كفر مثل حرمة لبس الحرير علي الرجال.

"جو شخص شرعی احکام کے باب میں متواتر احادیث کا انکار کرے وہ کافر ہے جیسا کہ کوئی مردوں کے لئے ریشم پہننے کی حرمت کا انکار کرے۔"[1]

۲۔ فتاویٰ ہندیہ میں خبر متواتر، مشہور اور خبر واحد کا حکم بیان کیا گیا جس سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ اصل موجب تکفیر تواتر کا انکار ہی ہے۔

چنانچہ اس میں لکھا ہے:

ومن أنكر المتواتر فقد كفر، ومن أنكر المشهور يكفر عند البعض، وقال عيسى بن أبان: يضلل ولا يكفر، وهو الصحيح ومن أنكر خبر الواحد لا يكفر غير أنه يأثم بترك القبول هكذا في الظهيرية.

"جو متواتر امر کا انکار کرے وہ کافر ہے اور جو حدیث مشہور کا انکار کرے وہ بعض کے نزدیک تو کافر ہے لیکن قاضی عیسی ابن ابان نے فرمایا کہ کافر تو نہیں البتہ گمراہ ہے اور یہی قول صحیح ہے، جو شخص خبر واحد کا انکار کرے وہ بھی کافر تو نہیں البتہ اس کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے گناہگار ہوگا۔"[2]

---

[1] كتاب الفاظ الكفر للعلامة البدرالرشيد مع شرح الامام علي القاري ، ص١١٨.

[2] الفتاوى الهندية ،كتاب السير، الباب التاسع فى احكام المرتدين،مطلب في موجبات الكفر، ج٢ص٢٦٥.

۳۔ علامہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

وكذلك نقطع بتكفير كل من كذب وأنكر قاعدة من قواعد الشرع وما عرف يقينا بالنقل المتواتر من فعل الرسول ووقع الإجماع المتصل عليه كمن أنكر وجوب الصلوات الخمس وعدد ركعاتها وسجداتها ويقول إنما أوجب الله علينا في كتابه الصلاة على الجملة وكونها خمسا وعلى هذه الصفات والشروط لا أعلمه.

"ہم ہر اس شخص کی تکفیر پر جزم کرتے ہیں جو شریعت کے کسی قاعدے کی تکذیب وانکار کرے یا حضور ﷺ کے کسی ایسے فعل کا انکار کرے جو یقین وتواتر کے ساتھ ثابت ہو اور اس پر اجماع ہو چکا ہو جیسا کہ کوئی پنج وقتہ نمازوں اور ان کی رکعات وسجدات کا انکار کر بیٹھے اور کہے کہ ہم پر تو صرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز فرض کی ہے، اس سے زیادہ باتیں (مثلا پانچ وقت ہونا وغیرہ وغیرہ) میں نہیں جانتا۔"[1]

۴۔ شیخ الاسلام تقی الدین بن دقیق العید الشافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

والحق أنه لا يكفر أحد من أهل القبلة، إلا بإنكار متواتر من الشريعة عن صاحبها، فإنه حينئذ يكون مكذبا للشرع، وليس مخالفة القواطع مأخذا للتكفير وإنما مأخذه مخالفة القواعد السمعية القطعية طريقا ودلالة.

حق بات یہ ہے کہ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کی جائے مگر جب کوئی کسی دین کے ایسے حکم کا انکار کرے جو تواتر کے ساتھ صاحب شریعت ﷺ سے ثابت ہو

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى، فصل في بيان ما هو من المقالات كفر ، ج٢ص٢٨٧.

کیونکہ اس صورت میں یہ شریعت کو جھٹلانے والا ہو گا۔"[1]

۵۔علامہ عبدالوہاب بن احمد شعرانی الشافعی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"الکفر هو التکذیب لانه مخالفة نص مقطوع به اومخالفة الاجماع، وفيهما جميعا تكذيب الرسول"

"کفر تکذیب ہی ہے کیونکہ (تکذیب کی طرح کفر بھی) قطعی نص اور اجماع کی مخالفت کو کہا جاتا ہے اوران دونوں صورتوں میں حضورﷺ کی تکذیب ہوتی ہے۔"[2]

۶۔علامہ محمد علی ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

من قال بنبيّ بعد النبي عليه الصلاة والسلام أو جحد شيئا صح عنده بأن النبي صلى الله عليه وسلم قاله فهو كافر.

"جو کوئی نبی کریمﷺ کے بعد دوسرے نبی آنے کو جائز سمجھے یا کسی ایسے دینی حکم کاانکار کرے جواس کے نزدیک حضورﷺ سے ثابت ہو تو وہ کافر ہے۔"[3]

آٹھویں وجہ: ضروریات دین کی تقسیم

امام تقی الدین سبکی اور امام ابن حجر ہیتمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے ضروریات دین کی دو قسمیں بیان فرمائی:

الف۔ایک وہ امور جو ہر دین دار عوام اور خواص کو معلوم ہوں۔

---

[1] إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام ،كتاب اللعان، من وصف غيره بالكفر، ج۲ص۲۱۰.

[2] اليواقيت والجواهر في بيان عقائد الاكابر، ج۲ص۱۱۰.

[3] الفصل في الملل والأهواء والنحل، ج۳ص ۱۴۲.

ب۔ وہ مسائل جن کا علم خواص کو پوری طرح حاصل ہو لیکن عوام سے بعض اوقات مخفی رہتا ہو۔

پہلی قسم کا حکم یہ بیان فرمایا کہ اس کا انکار مطلقاً کفر ہے، خدانخواستہ عوام انکار کریں تو بھی کافر، اور خواص انکار کریں تو بھی تکفیر کی جائے گی، لیکن دوسری قسم کا حکم یہ بیان فرمایا کہ اس کا انکار خواص کے حق میں تو موجب کفر ہے کیونکہ خواص کے حلقہ تک اس کا علم ضروریات میں سے بن گیا۔

لیکن عوام اگر اس کا انکار کریں تو فوراً ان کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا کیونکہ جب ان کو پوری طرح مسئلہ معلوم نہیں اور اس مسئلہ کے حکم شرعی ہونے سے وہ واقف نہیں ہیں تو ان کے انکار کو شارع ﷺ کی تکذیب پر محمول کرنا درست نہیں ہے، اس لئے اس کو پہلے تحقیق کرنے کا کہا جائے گا تاکہ "جہل" کا یہ عذر ختم ہو جائے۔

امام سبکی کی تفصیلی عبارت

امام تقی الدین سبکی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۷۵٦ھ) تحریر فرماتے ہیں:

لكني أنبه هنا على شيء وهو أن المعلوم بالضرورة من الشرع قسمان: أحدهما يعرفه الخاص والعام، والثاني: قد يخفى على بعض العوام، ولا ينافي هذا قولنا: إنه معلوم بالضرورة؛ لأن المراد أن من مارس الشريعة وعلم منها ما يحصل به العلم الضروري بذلك وهذا قد يحصل لبعض الناس دون بعض بحسب الممارسة وكثرتها أو قلتها أو عدمها فالقسم الأول من أنكره العوام أو الخواص فقد كفر؛ لأنه مكذب للنبي صلى الله عليه وسلم في خبره..... والقسم الثاني من أنكره من العوام الذين لم يحصل لهم من ممارسته الشرع مما يحصل له به العلم الضروري وإن كانت كثرة الممارسة أوجبت للعلماء العلم

الضروري بذلك، ومن هذا القسم عموم رسالته صلى الله عليه وسلم إلى الجن فإنا نعلم بالضرورة ذلك لكثرة ممارستنا لأدلة الكتاب والسنة وأخبار الأمة.

وأما العامي الذي لم يحصل له ذلك إذا أنكر ذلك فإن قيد الشهادة بالرسالة إلى الإنس خاصة خشيت عليه الكفر كما قدمته في أول هذه الفتوى، وإن أطلق الشهادة بأن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله ولم ينتبه؛ لأن إنكاره لعموم الدعوى للجن يخالف ذلك فلا أرى الحكم بكفره ولكن يؤدب على كلامه في الدين بالجهل ويؤمر بأن يتعلم الحق في ذلك لتزول عنه الشبهة التي أوجبت الإنكار.[1]

"ضروریاتِ دین" کی اس تقسیم سے زیر بحث مسئلہ بالکل صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کے قطعی احکام کا انکار کفر ہے، تاہم تمام قطعیات کا علم ہر مسلمان پر فرضِ عین نہیں، اس لئے اگر کسی کو کسی ایسے حکم شرعی کا علم نہ ہو اور وہ اس کا انکار کر بیٹھے تو اس کو معذور سمجھا جائے گا اور اسی نکتہ کی خاطر حضرات متکلمین نے تکفیر کے لئے عام طور "ضروریات دین" میں سے ہونے کی قید لگائی ہیں، ورنہ نفس تکفیر کے لئے اس قید کی کوئی اہمیت نہیں۔

لہٰذا اگر کسی شخص کو شریعت کا کوئی قطعی حکم معلوم ہے اور اس علم کے باوجود وہ اس کا انکار کر بیٹھے تو اس انکار کی وجہ سے وہ کافر ہو جائے گا اگرچہ وہ حکم ضروریات دین میں سے نہ ہو، فقہاء کرام نے متعدد جزئیات میں اس کی تصریح فرمائی ہیں۔

---

[1] فتاوى السبكي، الدلالة على عموم الرسالة، ج٢ص٦٢١. وكذافى الفتاوىٰ الحديثية، مطلب فى ايمان المقلد، ص٢٦٩.

نویں وجہ: اصولیین کا ضابطہ

حضرات اصولیین کے ذکر کردہ تفصیلات پر اگر مجموعی طور پر غور کیا جائے تو بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ شریعتِ اسلام کے تمام قطعی احکام کا انکار موجبِ کفر ہے، تاہم اگر کسی کو اس کا حکم شرعی ہونا معلوم نہ ہو تو اولاً اُس کو سمجھایا جائے گا، اس کے بعد بھی اگر وہ انکار پر مصر رہا تو کافر قرار دیا جائے گا، کافر ہونے کے لئے صرف ضروریات دین میں سے کسی حکم کا انکار کرنا ہی کوئی شرطِ لازم نہیں۔

اصول فقہ میں مسئلہ تکفیر کے ضمنی مباحث

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ اصول فقہ میں کفر کی بحث ضمنی طور پر مندرجہ ذیل مباحث کے تحت ذکر کی جاتی ہے:

فرض اور واجب کی تحت۔

سنت کی بحث میں۔

اجماع کی بحث میں۔

فرض اور واجب کے درمیان فرق کی ضمن میں تکفیر کا مسئلہ

فقہاءِ احناف کے نزدیک فرض اور واجب دونوں مختلف اصطلاحات ہیں، دونوں کے ثبوت اور حکم میں فرق ہے، فرض کا ثبوت کتاب وسنت کے کسی ایسے قطعی دلیل سے ہوتا ہے جو ثبوت اور دلالت دونوں چیزوں کے لحاظ سے قطعی ہو، جبکہ واجب کے لئے ایک طرح کی قطعیت بھی کافی ہے لہٰذا اگر کوئی نص صرف ثبوت یا صرف دلالت کے لحاظ سے قطعی ہو تو اس سے بھی وجوب ثابت ہو سکتا ہے، ثبوت کے لحاظ سے دونوں کے درمیان یہی فرق ہے۔

اور حکم کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق ہے وہ یہ کہ فرض کے انکار کو تمام احناف اصولیین کفر قرار دیتے ہیں اور واجب کے انکار کو گمراہی اور فسق وفجور تو کہتے ہیں لیکن کفر نہیں کہہ سکتے۔

امام سرخسیؒ

امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

الفرض اسم لمقدر شرعا لا يحتمل الزيادة والنقصان وهو مقطوع به لكونه ثابتا بدليل موجب للعلم قطعا من الكتاب أو السنة المتواترة أو الإجماع---وحكم هذا القسم شرعا أنه موجب للعلم اعتقادا باعتبار أنه ثابت بدليل مقطوع به ولهذا يكفر جاحده--فما كان ثابتا بدليل موجب للعمل والعلم قطعا يسمى فرضا لبقاء أثره وهو العلم به أدى أو لم يؤد وما كان ثابتا بدليل موجب للعمل غير موجب للعلم يقينا باعتبار شبهة في طريقه يسمى واجبا.

فرض شریعت کے اس مقررہ قطعی حکم کو کہاجاتا ہے جس میں کمی وزیادتی کا احتمال نہ ہو کیونکہ وہ کتاب اللہ، سنت متواترہ یا اجماع کے کسی قطعی حکم سے ثابت ہوتا ہے۔۔اس کا حکم یہ ہے کہ یہ اعتقاد کی حد تک بھی یقین کا فائدہ دیتاہے اس لئے اس کا منکر کافر ہوگا۔۔لہٰذا جو حکم بھی ایسی دلیل سے ثابت ہو جو قطعی طور پر علم وعمل کا موجب ہو تو اس کو فرض کہا جائے گا کیونکہ اس کا لازمی اثر یعنی علم برقرار رہتا ہے چاہے عملی طور پر اس کو ادا بجالا یا جائے یا نہیں۔۔"[1]

---

[1] أصول السرخسي، فصل في بيان المشروعات من العبادات وأحكامها، ج١ص١١٠.

حنفیہ ہی میں سے ایک اور مشہور اصولی امام بزدوی رحمہ اللہ نے اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ فرض اور واجب کے درمیان اس فرق کی وضاحت کی، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

أما الفرض فحكمه اللزوم علما وتصديقا بالقلب، وهو الإسلام وعملا بالبدن، وهو من أركان الشرائع ويكفر جاحده ويفسق تاركه بلا عذر، وأما حكم الوجوب فلزومه عملا بمنزلة الفرض لا علما على اليقين لما في دليله من الشبهة حتى لا يكفر جاحده

"فرض کا حکم یہ ہے کہ وہ علماً بھی لازم ہے اور دل میں اس کی تصدیق کرنا بھی ضروری ہے (اسی کو اسلام کہتے ہے) اور اعضاء کے ذریعے اس کو بجالانا بھی واجب ہے اور یہ شرائع کے ارکان میں سے ہے، اس کا منکر کافر اور بلاعذر چھوڑنے والا فاسق ہے، اس کے مقابلے میں وجوب ہے کہ عمل میں تو فرض کی طرح وہ بھی لازم ہے مگر علم ویقین کا موجب نہیں کیونکہ اس کی دلیل میں شبہ موجود ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا منکر کافر نہیں ہے۔[1]

ان دونوں عبارات کا حاصل یہ ہے کہ فرض اور واجب میں ثبوت کے اعتبار سے یہ فرق ہے کہ واجب کے لئے ثبوت یا دلالت کسی ایک لحاظ سے قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے، اور فرض کے لئے ہر لحاظ سے قطعی دلیل ضروری ہے اور حکم کے لحاظ سے دونوں میں فرق یہ ہے کہ فرض کا منکر کافر ہے اور واجب کا منکر کافر نہیں، البتہ فاسق ہے۔

[1] أصول البزدوي مع شرحه كشف الأسرار ، باب العزيمة والرخصة، ج٢ص٣٠٣.

اس تفصیل اور دونوں اصطلاحات کے درمیان اس تفریق سے واضح ہوا کہ اصولیین کے نزدیک کفر کا اصل مدار قطعی حکم کے انکار پر ہی ہے، اسی لئے فرض کے انکار کو کفر کہا اور واجب چونکہ ہر لحاظ سے قطعی نہیں ہے بلکہ قطعیت نہ ہونے کی وجہ اس میں شبہات بھی موجود ہو سکتے ہے، اسی لئے اس کے انکار کو کفر نہیں کہا۔

سنت اور اجماع کی ضمن میں تکفیر کی بحث

اس کے علاہ سنت اور اجماع کے مباحث میں بھی اصولیین حضرات ضمنی طور پر اپنی کتابوں میں تکفیر کا مسئلہ بیان فرماتے ہیں، اوران سب مقامات پر اصولیین نے کفر کا مدار قطعیت اور یقین کے انکار پر ہی رکھا ہیں بلکہ بعض اصولیین نے تو قطعیت اور تواتر کے بعد لفظ کفر پر "ف" داخل کی ہیں جس سے صراحت کے ساتھ یہی مفہوم حاصل ہو جاتا ہے۔

اصولیین کی چند عبارات

چنانچہ یہاں اس قسم کی چند عبارات ذکر کی جاتی ہیں:

اجماع کی بحث میں نور الانوار میں لکھا ہے کہ:

الاجماع في امور الشريعة في الاصل يفيد اليقين والقطعية فيكفر جاحده[1]

خبر متواتر اور مشہور کے بحث میں لکھا کہ:

---

[1] نور الانوار، باب الاجماع، ص:٦٢٩

وانه(المتواتر) يوجب علم اليقين كالبيان علماضروريا۔ثم قال في بحث الخبر المشهور۔ وقال الجصاص انه احد قسمي المتواتر فيفيد علم اليقين ويكفر جاحده كالمتواتر علي مامر[1]

اصول الشاشی میں تحریر ہے کہ :

ثم المتواتر يوجب العلم القطعي ويكون رده كفرا[2]

اصول فقہ کے مبسوط کتابوں میں ان تمام مباحث کی تفصیلات مذکور ہیں جو وہی ملاحظہ کی جاسکتی ہیں، یہاں صرف اتنا ذکر کرنا ضروری ہے کہ حضرات اصولیین کے اس طرز نگارش سے معلوم ہوتا ہے کہ تکفیر کا موجب قطعی اور یقینی احکام ہی کا انکار ہے۔

تواتر کی شرائط:

کوئی حکم ثبوت کے لحاظ سے کب تواتر کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے؟ حضرات اصولیین نے اس کو تفصیل سے ذکر فرمایا ہیں اور اس کے لئے مختلف شرائط مقرر فرمائی ہے جن میں سے بعض شرائط تو اتفاقی ہیں اور بعض شرائط ایسے ہیں جن کے شرط ہونے میں خود اصولیین کا اختلاف ہے، لیکن علامہ ابن الہمام، ، علامہ شامی اور ان کے علاوہ بہت سے فقہائے اصولیین کا موقف یہ ہے کہ اگر کہیں مندرجہ ذیل تین شرائط پائی جائیں تو وہ متواتر شمار ہوگا:

---

[1] نفس المصدر، ص:۵۰۳

[2] أصول الشاشي، البحث الثاني فى اقسام الخبر، ص: ۲۷۲.

ا۔ نقل کرنے والے اتنے زیادہ ہوں کہ عقل عام طور پر ان کے جھوٹ پر متفق ہو جانے کو تسلیم نہ کرے۔

۲۔ کسی محسوس بات کو نقل کریں مثلاً حضور ﷺ سے کچھ سنا یا آپ ﷺ کو کچھ کرتے دیکھا، اگر ناقلین کسی عقلی بات پر متفق ہو جائیں تو اس کو درجہ تواتر حاصل نہیں ہوگا۔

۳۔ حضور ﷺ کے دور مبارک سے لے کر بعد کے ادوار تک یہ سلسلہ اتنی ہی کثرت کے ساتھ برابر نقل ہوتا رہا ہو، اگر درمیان میں نقل کرنے والوں کی تعداد اس معیار سے کم ہوگئی یا اول و آخر میں کم ہوئی تو بھی وہ روایت متواتر نہیں کہلائے گی۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

والحاصل ان شروطه ثلاثة كما في التحرير: تعدّد النقلة بحيث يمتنع التوطؤ على الكذب عادة، والاستناد الى الحسّ، واستواء الطرفين والوسط في ذلك.[1]

تواتر کی قسمیں:

پھر تواتر کی بھی قسمیں ہیں، بعض اوقات تو کوئی حکم اسناداً متواتر ہوتا ہے مثلاً ایک حکم کا ثبوت کسی ایسی روایت سے ہے جو سنداً درجہ تواتر تک پہنچ چکا ہو یعنی حضور ﷺ کے دور مسعود سے لے کر آخر تک اس کے روایت کرنے والے اتنے زیادہ لوگ ہیں کہ عقل ان کے جھوٹ پر اتفاق کرنے کا وہم نہیں کرتی جیسے کہ حدیث مبارکہ " مـــن

---

[1] نسمات الاسحار على افاضة الانوار، باب في بيان اقسام السنة، ص١٧٧.

كذب عليّ متعمدا فليتبوأ مقعده من النّار"اوراسی طرح حضور نبی کریم ﷺ کے ختم نبوت کے احادیث۔

بعض اوقات کوئی چیز متواتر تو ہوتی ہے لیکن اس کے اسناد دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ طبقہ در طبقہ اور نسل در نسل کثرت کے ساتھ منتقل ہوتی رہتی ہے جیسے کہ قرآن کریم اوراس کے تمام الفاظ کا تواتر ہے، کہ حضور ﷺ کے دور مبارک سے لے کر آج تک تمام مسلمان قرآن کو یوں ہی پڑھ رہے ہیں اور سب اس کو کلام الٰہی یقین کرتے ہیں، اسی طرح کبھی عمل اور توارث کے ساتھ بھی تواتر کا ثبوت ہوتا ہے۔[1]

یہ سب اقسام تواتر کی ہے اور سب کا حکم یہ ہے کہ ان طرق سے ثابت شدہ حکم کا انکار کرنا موجب کفر ہے لیکن شرط یہ ہے کہ جس چیز کا انکار کیا جارہا ہے وہ کوئی حکم شرعی ہو کیونکہ احکام شریعت کے علاوہ متواترات کا اگر کوئی انکار کرے تو اس کو جاہل، ناواقف یا متعصب وہٹ دھرم تو کہا جاسکتا ہے لیکن کافر قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ کفر شارع کی تکذیب کا نام ہے نہ کہ ہر متواتر کا، لہذا اگر کوئی یہاں پاکستان میں رہ کر بغداد وبصرہ یا امریکہ وبرطانیہ کا انکار کرے کہ کرہ ارض پر یہ مقامات موجود ہی نہیں ہیں تو اس کے بناء پر اس کی تکفیر کرنی جائز نہیں ہے کیونکہ اس نے شارع کی تکذیب نہیں کی۔

---

[1] انظر اكفار الملحدين،ص٥و٦.

اصول تکفیر

کفر کے بنیادی طور پر تین اسباب ہیں:

۱۔اعتقاد

۲۔ قول

۳۔ عمل

کسی مسلمان شخص کو ان ہی تین چیزوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے کافر قرار دیا جاسکتا ہے، بعض اوقات کوئی ایسا عقیدہ رکھا جاتا ہے جو اسلام کے بالکل منافی ہوتا ہے، بسا اوقات اسلام کا کوئی ضروری عقیدہ ہوتا ہے جس پر ایمان واسلام لانا ضروری ہوتا ہے اور کوئی شخص اسی میں متردد ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس کو کافر کہا جاتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی کوئی شخص ایسا قول و فعل اختیار کرتا ہے جس کی بنیاد پر حضرات فقہاء کرام اس کی تکفیر کرتے ہیں۔

اعتقاد سے متعلق تفصیلات تو مندرجہ بالا مباحث میں ذکر ہوں چکی، یہاں قول و عمل کے متعلق تفصیلات ذکر کی جاتی ہیں۔

تکفیر کی دوسری اور تیسری بنیاد: قول و عمل

جن افعال واقوال کی وجہ سے متکلمین اور فقہاء کرام کسی مسلمان شخص کی تکفیر کرتے ہیں، اس کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

الف: ایک قسم ان افعال واقوال کی ہے جن کا کرنا ہی کفر ہے، اور جب کوئی شخص وہ قول و فعل اختیار کرتا ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ اس میں جائز یا مباح سمجھنے کی کوئی شرط نہیں۔

واضح رہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نزدیک ایمان چونکہ دلی تصدیق ہی نام ہے اس لئے ان حضرات کے نزدیک کوئی فعل و عمل بذات خود موجب کفر نہیں ہوتا جب تک وہ دلی تصدیق ختم ہونے پر دلالت نہ کرے، یہاں اس قسم سے بھی ایسے ہی اعمال واقوال مراد ہیں جو یقینی طور پر دلی تصدیق فوت ہونے پر دال ہیں۔

ب: دوسری قسم میں وہ افعال واقوال داخل ہیں جو بذات خود کفر نہیں ہوتے بلکہ ان میں کفر کا اصل دار و مدار دوسرے امور پر ہوتا ہے، اس لئے فقہاء کرام جہاں بھی اس کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں تو وہ قید ضرور ذکر فرماتے ہیں۔

پہلی قسم افعال واقوال کی تفصیلی بحث و تحقیق تو اسی باب کے فصل دوم میں ذکر کی جائے گی انشاءاللہ تعالٰی۔ یہاں دوسری قسم سے متعلق فقہاء کرام کے ذکر کردہ مباحث کا خلاصہ ذکر کیا جاتا ہے۔

قول و فعل کے موجب کفر بننے کی اصل وجوہات

فقہاء کرام نے اس قسم کے افعال واقوال کی ایک بڑی لمبی فہرست ذکر فرمائی ہے بلکہ فقہ کے اکثر مبسوط کتابوں میں کلمات الکفر وغیرہ عنوان کے ساتھ ایک مستقل باب ذکر کیا جاتا ہے جس میں زندگی کے مختلف مشاغل سے متعلق ان تمام کلمات وافعال کو جمع کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو سکتا ہے، بعض کتابوں میں اس طرح ذکر کردہ جزئیات کی تعداد تقریباً چار سو (۴۰۰) تک پہنچتی ہے،

لیکن جیسا کہ واضح کیا گیا ان میں اکثر وہ امور ہوتے ہیں جو بذاتِ خود کفر کے موجب نہیں ہوتے بلکہ دیگر قیودات وشرائط کی وجہ سے وہ کفر کا سبب بن جاتے ہیں۔

فقہ حنفی کی جامعیت

مذاہب اربعہ میں سے یہ فقہ حنفی کا ایک امتیاز اور بڑی خصوصیت ہے کہ اس باب کی طرف سب سے زیادہ توجہ اسی فقہ حنفی میں کی گئی اور بنیادی کام بھی تقریباً فقہاء حنفیہ ہی نے کیا، محققین کے نزدیک علامہ محمد بن اسماعیل بدر الرشید رحمہ اللہ تعالیٰ پہلی وہ شخصیت ہے جس نے اس بحث کو باقاعدہ ایک رسالہ کی شکل میں مرتب فرمایا اس کے بعد سے یہ باب باقاعدہ بحث و تمحیص کا موضوع بنا، اور دیگر حضرات نے بھی اس پر تحقیق فرمائی، فجزاہم اللہ تعالیٰ عنّا وعن جمیع الامۃ خیر الجزاء۔

علامہ شامی رحمہ اللہ تعالیٰ کی تصریح کے مطابق اس پر سب سے جامع اور منضبط کام علامہ نشانجی زادہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے کیا جس نے باقاعدہ ایک کتاب لکھی اور تمام فقہاءِ حنفیہ کے تحقیقات کو نقد و نظر کے اصول کے ساتھ منضبط طور پر جمع فرمایا، آپ نے اس مفید رسالے کا نام "تنویر الجنان فی بیان حفظ الایمان" رکھا اور اپنی کتاب "نور العین فی اصلاح جامع الفصولین" کے آخر میں اپنا یہ پورا رسالہ بھی ضم کیا۔

اس کے علاوہ فتاویٰ ہندیہ میں بھی اس قسم کے تقریباً اکثر جزئیات جمع کئے گئے، اور چونکہ فتاوی ہندیہ کا زمانہ تالیف کافی بعد کا ہے اس لئے اس میں تمام جزئیات وفروعات کو سمیٹنے کی بڑی حد تک کامیاب کوشش کی گئی۔

قول وعمل کے موجب کفر بننے کے متعلق تحقیق کا حاصل

ناکارہ راقم ان دونوں کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:

ان تفصیلات میں بنیادی طور پر مندرجہ بالا دو قسم کے اعمال واقوال ذکر کئے جاتے ہیں، ایک وہ اعمال واقوال جو ایمان کے لوازم اور اس کے شرائط کے سراسر منافی ہوں، ان میں تو خود اس فعل کو موجب کفر قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دل میں تصدیق باقی نہیں رہی، یا اگر نام کی تصدیق برقرار بھی ہو تو شریعت میں اس کا اعتبار نہیں۔

اور جو افعال واقوال ایمان یا اس کے لوازم وشرائط کے منافی نہیں ہیں، اس کو حضرات فقہاء کرام مندرجہ ذیل تین امور کی وجہ سے موجب کفر قرار دیتے ہیں اور اس کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں۔

۱۔استحلال

۲۔استخفاف

۳۔استہزاء

ان تینوں امور کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ بدر الرشید رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب "الفاظ الکفر" میں صرف جزئیات ہی ذکر فرمائے ہے ان کے دلائل ذکر نہیں کئے نہ ہی اس بات کی طرف تعرض فرمایا کہ کسی جزئیہ میں کفر کا حکم کیوں لگایا گیا؟ اہمیت کے باوجود ان دلائل کو ذکر نہ کرنے کی وجہ کیا ہے؟ آپ

خود ہی مقدمہ میں اس کی وجہ تحریر فرماتے ہیں:

وما اوردت الدلائل لان دلائلها لاتخلو من احدي الثلاثة، اما بالاستهزاء او بالاستخفاف او بالاستحلال.

"میں نے اس کتاب میں دلائل ذکر نہیں کئے کیونکہ دلائل یہی تین امور ہی ہیں: ۱۔استہزاء۔ ۲: استخفاف۔ ۳: استحلال"[1]

ذیل میں ان ہی تین امور کی وضاحت کی جاتی ہے۔

استحلال کی تحقیق اور اس کا مفہوم

استحلال "حل" سے مشتق ہے جس کا بنیادی معنی "کھولنا، آزاد ہونا اور "رہائی" ہے، جب کوئی شخص گرہ کھولتا ہے تو عرب کہتے ہیں کہ "حلّ العقدة" اس نے گرہ کھولا، شریعت مطہرہ نے جن چیزوں کو جائز قرار دیا، ان کو بھی حلال اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں انسان آزاد ہے، اس کے کرنے میں مکلف پر کوئی قید و بند نہیں، بلکہ اگر چاہے تو شریعت کی طرف سے بلا روک ٹوک وہ کام کر سکتا ہے۔

استحلال باب استفعال سے مصدر کا صیغہ ہے جس کے خاصیات میں سے یہاں "وجدان" یا "حسبان" پایا جاسکتا ہے یعنی کسی چیز کو صاحب ماخذ خیال کرنا، وجدان اور حسبان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وجدان کی صورت میں متکلم یقین کرتا ہے اور حسبان کی صورت میں صرف صاحب ماخذ ہونے کا خیال ہوتا ہے، متکلم کو اس کا یقین نہیں بلکہ صرف گمان ہوتا ہے جس کے لئے وہ باب استفعال کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

---

[1] کتاب الفاظ الکفر، مخطوط، لوحة:۳.

اس تفصیل کے مطابق "استحلال" کا معنی ہوا کسی چیز کو حلال سمجھنا، یا کسی چیز کو حلال خیال کرنا، یعنی جن امور کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے اس کے بارے میں آزادی کا خیال کرنا، جن امور کو شریعت نے منع کر دیا ہے اس کے بارے میں اپنے آپ کو رہا اور آزاد تصور کر لینا کفر ہے۔

استحلال کا حکم

شریعت اسلام نے جن چیزوں کو معاصی قرار دیا، ان کو اعتقاداً معصیت سمجھنا اور عملاً اس سے کنارہ کش رہنا ضروری ہے اگر کہیں عملی کوتاہی کر کے اس کا ارتکاب کیا جائے تو اس کی وجہ سے آدمی عاصی اور گناہگار بن جاتا ہے، لیکن۔ خدانخواستہ۔ اگر کہیں اعتقاد میں تزلزل آئے اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز کو حلال سمجھا جائے تو یہ ایک نہایت خطرناک جرم ہے، ایسا کرنا صرف معصیت ہی نہیں ہے بلکہ کفر ہے جس کی وجہ سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

اس پر تقریباً پوری امت کا اتفاق ہے کہ "استحلالِ حرام" کفر ہے، لیکن یہ قاعدہ اتنا مطلق نہیں ہے جتنا عام طور پر بیان کیا جاتا ہے، بلکہ اس کے لئے کچھ حدود و شرائط ہیں جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور اس کے بغیر تکفیر جیسا حساس اقدام کرنا کئی غلطیوں اور منکرات کا پیش خیمہ بن سکتا ہے، ان شرائط کے نہ سمجھنے کی وجہ سے آج پورے عالم اسلام میں افراط و تفریط کی نہایت خطرناک اور افسوسناک لہر جاری ہے جو ہزاروں معصوم جانوں کو اپنے چنگل میں لے کر موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد بھی روز افزوں عروج پر جاتا ہوا محسوس ہوتا ہے، اس لئے مسئلہ تکفیر کو کماحقّہ سمجھنے کے لئے اس

بحث کو سمجھنا بھی ناگریز ہے اور اس عقدہ کو حل کئے بغیر "اصول تکفیر" کا کوئی بھی کام شاید ادھورا ہی ہے۔

یہاں انہی شرائط کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ ذکر کر دیا جاتا ہے۔

ان شرائط کو آسانی کی خاطر مندرجہ ذیل تین عنوانات کے اندر تقسیم کیا جاتا ہے۔

۱۔ وہ شرائط جن کا مستحِل (معصیت کو حلال سمجھنے والے) میں پایا جانا ضروری ہے۔

۲۔ وہ شرائط جن کا مستحَل (معصیت) میں پایا جانا ضروری ہے۔

۳۔ نفس استحلال کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل۔

مستحِل کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

استحلال کے بنیاد پر چونکہ مستحل کو کافر قرار دیا جاتا ہے اس لئے اصولی لحاظ سے اس بنیاد پر تکفیر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مستحل کے اندر وہ تمام شرائط پائی جائیں جن کا اس شخص کے اندر پایا جانا ضروری ہے جس کو اس کی کسی اقدام کی وجہ سے کافر قرار دیا جاتا ہے اس کی تفصیل اسی کتاب کے باب سوم میں تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے، اس لئے یہاں مزید تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں خصوصیت کے ساتھ ان شرائط کو بیان کیا جاتا ہے جن کی طرف عام طور پر توجہ دئے بغیر لوگ استحلال کو کفر سمجھ بیٹھتے ہیں۔

پہلی شرط: مسئلہ کا علم ہونا

کسی کو استحلال کے بنیاد پر کافر قرار دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو اس معصیت کے معصیت ہونے کا علم ہو جس کو وہ حلال سمجھ رہا ہے، اگر کوئی شخص لاعلمی میں حرام چیز کو حلال کہے تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

لو قال للحرام: هذا حلال، لترويج السلعة او بحكم الجهل لا يكفر.

"اگر کوئی اپنے سودا بیچنے کے لئے یا ناواقفی کی وجہ سے حرام چیز کو حلال کہہ ڈالے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائیگی۔"

علامہ فرہاروی رحمہ اللہ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

لترويج السلعة او بحكم الجهل او عدم العلم بكونه حراما لا يكفر

لعدم تکذیب الشارع.[1]

"سودا بیچنے کے لئے، جہالت کی وجہ سے یا حرمت کے علم نہ ہونے کی وجہ سے حرام کو حلال کہنے والے کی تکفیر اس لئے نہیں کی جاتی کہ اس نے (دراصل) شارع کی تکذیب (ہی) نہیں کی۔"

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ولا بقوله لحرام هذا حلال من غير أن يعتقده فلا يكفر السوقي بقوله هذا حلال للحرام ترويجا لشرائه[2]

"اگر کوئی شخص کسی حرام کو کہے کہ یہ حلال ہے لیکن یہ عقیدہ نہ رکھے تو کافر نہیں ہوگا، لہٰذا اگر بازاری آدمی اپنا سامان فروخت کرنے کے لئے حرام کو حلال کہے تو اس کو کافر نہیں کہا جائے گا۔"

انہی کی کتاب "الاشباہ والنظائر" میں یتیمۃ الفتاویٰ سے نقل فرمایا ہے کہ:

ظن لجهله أن ما فعله من المحظورات حلال له، فإن كان مما يعلم من دين النبي صلى الله عليه وسلم ضرورة، كفر وإلا فلا[3].

اگر کسی نے اپنی جہالت کی وجہ سے گمان کیا کہ جن محرمات کا اس نے ارتکاب کیا ہے وہ حلال ہیں، تو اگر یہ محرمات ضروریات دین میں سے ہو تو کافر ہو جائے گا ورنہ نہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص ناواقفیت کی وجہ سے شریعت کے کسی حرام چیز کو حلال کہے تو اس کی تکفیر کرنا غلط ہے جبکہ وہ حکم ضروریات دین میں سے نہ ہو،

---

[1] النبراس، ص٥٤٥.

[2] البحر الرائق ،كتاب السير، باب احكام المرتدين، ج٥ص ١٣٢.

[3] الأشباه والنظائر ،الفن الثالث، احكام الجهل،ص: ٢٦٢.

کیونکہ کفر تکذیبِ شارع کا نام ہے اور جب دل میں پورے اعتقاد کے باوجود محض کسی دنیوی لالچ یا ناواقفیت کی وجہ سے حرام کو حلال کا نام دے تو اس صورت میں شارع کے ساتھ معارضہ کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی جس کو تکذیب شارع اور کفر کہا جاسکے، اس لئے اس کو کفر نہیں کہا گیا۔

یہاں یہ سوال کہ خواہ مخواہ یہ شرط لگائی گئی؟ نیز ہر معصیت کو حلال سمجھنے کا یہ حکم ہے یا اس میں کچھ تفصیل بھی ہے؟ تو ان باتوں کی تفصیل باب سوم "موانعِ تکفیر" کے ضمن میں پہلے گزر چکی ہے، وہی ملاحظہ فرمائیں۔

دوسری شرط: استحلال تاویل کے ساتھ نہ ہو

اگر کوئی شخص کسی دلیل کے بنیاد پر ناجائز چیز کو جائز سمجھے تو اس کی بھی تکفیر نہیں کی جائیگی، اس کا استدلال اصول فقہ کے لحاظ سے غلط سہی، لیکن بہر حال اس کو کافر نہیں قرار دیا جاسکتا، حضرات مجتہدین کے باہمی اختلافات میں ایک طویل فہرست ان مسائل کی بھی ہے جہاں کسی چیز کے جائز ہونے اور نہ ہونے میں ہی اختلاف ہے، ایک مجتہد کے نزدیک کوئی چیز جائز ہوتی ہے دوسرے کے ہاں وہی چیز ناجائز و حرام، ایک امام کسی چیز کو دلائل کے بنیاد پر معصیت اور حرام سمجھتا ہے لیکن دوسرے امام کے نزدیک وہی چیز بالکل مباح ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود چونکہ سب کا سر چشمہ قرآن وسنت کے دلائل ہی ہیں اس لئے ان اختلافات کی وجہ سے تکفیر تو در کنار، کسی کو گمراہ قرار دینا بھی جائز نہیں ہے۔

خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان ایسے کئی واقعات سامنے آئیں لیکن ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان مسائل کی وجہ سے کسی شخص کی تکفیر

کی ہو، امام بیہقی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت قدامہ بن مظعون رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے آیت کریمہ "ليس على الذين امنو وعملوا الصالحات جناح فيما طعموا" سے یہ استدلال کیا کہ اگر کوئی مسلمان شخص شراب نوشی کرے تو اس پر حد نہیں لگائی جائے گی، حضرت فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آپ کی یہ تفسیر وتاویل غلط ہے اور اس کے بعد اس پر حد بھی قائم کر دی۔[1]

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی کسی غلط تاویل کی وجہ سے استحلال معصیت کا مرتکب ہو جائے تو اس سے وہ کافر نہیں ہو گا، ورنہ تو شراب کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، اس کو مباح سمجھنے کی وجہ سے حد شراب قائم کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کو ارتداد قرار دیکر دوبارہ دین اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا چاہئے تھا ورنہ اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں اس کو قتل کرنا ضروری تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تاویل کو غلط قرار دیدینے کے باوجود اس کو ارتداد نہیں سمجھا اور آپ کے علاوہ دیگر حضرات صحابہ کرام نے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس اقدام پر خاموشی اختیار کر کے اس کی تائید کی جو ایک گونہ اجماع سکوتی ہے۔

خوارج مسلمانوں کو قتل کرنے، ان کا مال لوٹنے اور ان کے خلاف لڑنے کو حلال

---

[1] السنن الكبرى للبيهقي، كتاب الاشربة والحد فيها، باب من وجد منه ريح شراب أو لقي سكران، رقم الحديث:١٧٥١٦، ج٨ص ٥٤٧.

سمجھتے تھے حالانکہ ان امور کی حرمت میں کوئی شبہ نہیں لیکن یہ سب کچھ وہ تاویل کے سہارے کرتے تھے بعض اصولی باتوں میں غلط فہمی یا کج فہمی کی وجہ سے وہ ان محرمات کو حلال کہتے اور سمجھتے تھے اس لئے جمہور امت نے ان کو کافر نہیں کہا۔

علامہ کمال ابن الہمام رحمہ اللہ تعالیٰ خوارج کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مکالمہ سے استنباط کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

في هذا دليل على أن ما لم يكن للخارجين منعة لا نقتلهم، وأنهم ليسوا كفارا لا بشتم علي ولا بقتله. قيل إلا إذا استحله،فإن من استحل قتل مسلم فهو كافر، ولا بد من تقييده بأن لا يكون القتل بغير حق أو عن تأويل واجتهاد يؤديه إلى الحكم بحله، بخلاف المستحل بلا تأويل، وإلا لزم تكفيرهم؛ لأن الخوارج يستحلون القتل بتأويلهم الباطل[1].

"یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اگر بغاوت کرنے والوں کے پاس کوئی طاقت نہ ہو تو ہم ان کو قتل نہیں کریں گے اور وہ کافر نہیں نہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو سب وشتم کرنے کی وجہ سے نہ ہی ان کو قتل کرنے کی وجہ سے، بعض حضرات نے کہا کہ اگر اس کو حلال سمجھیں تو کافر ہوں گے کیونکہ جو کوئی بھی کسی مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے تو وہ کافر بن جاتا ہے، اور اس میں یہ قید ضروری ہے کہ قتل ناحق نہ ہو اور کسی تاویل واجتہاد کے بغیر نہ ہو، بر خلاف اس شخص کے جو کسی تاویل کے بغیر ہی حلال سمجھتا ہے، ورنہ (اگر یہ قید نہ لگائی جائے) تو خوارج کی تکفیر لازم آئیگی کیونکہ وہ اپنے باطل تاویل کے سہارے قتل مسلم کو حلال سمجھتے تھے۔"

---

[1] فتح القدير، كتاب السير،باب البغاة، ج٦ص ١٠٠.

یاد رہے کہ تاویل اگرچہ تکفیر سے مانع ہے لیکن ہر تاویل کا یہ حکم نہیں ہے، اس بات کی مزید تفصیل باب سوم کے "موانع تکفیر" میں ذکر کر دی گئی ہے، وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

بدعتی کی تکفیر کا مسئلہ

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شرعی دلائل سے جس چیز کا معصیت ہونا ثابت ہو اس کو جائز اور مباح سمجھنا موجب کفر ہے، بعض لوگوں نے اسی اصول پر بدعت کو مطلقاً کفر قرار دیا کیونکہ بدعت کی بنیاد عام طور پر کسی ناجائز چیز کو جائز سمجھنے پر ہوتی ہے، مبتدع صرف اس کو جائز نہیں سمجھتا بلکہ بعض اوقات اس کو مستحسن بھی خیال کرتا ہے لہٰذا ان حضرات نے ہر مبتدع کو کافر کہا کیونکہ معصیت کو جائز قرار دیا۔

لیکن جمہور امت نے اس موقف سے بالکل ہی اتفاق نہیں فرمایا، یہ اصول بالکل مسلم ہے کہ استحلال معصیت کفر ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ استحلال کسی شرعی دلیل کے بغیر صرف عناد و مکابرہ کے بنیاد پر کیا جائے، جبکہ مبتدع دلیل کا سہارا لے کر کسی چیز کو جائز کہتا ہے اس لئے اس کو کافر کہنا بالکل غلط ہے اگرچہ مبتدع کے پاس دلیل بھی غلط اور بے بنیاد ہی ہوتی ہے لیکن دلیل کی غلطی کی وجہ سے تکفیر کرنا درست نہیں، اسی طرح حضرات ائمہ مجتہدین کے درمیان آپس میں مختلف امور کے متعلق جائز و ناجائز، افضل و غیر افضل کے جو اختلافات ہیں کہ کوئی عمل ایک مجتہد کے نزدیک جائز ہوتا ہے اور دوسرا مجتہد اس کو ناجائز قرار دیتا ہے، اس اختلاف کی بنیاد بھی چونکہ شرعی دلیل ہے اس لئے محض اس کی بنیاد پر تکفیر کی جسارت کرنا نہایت خطرناک اور بڑے جرأت کی بات ہے۔

علامہ ابن الہمام کی صراحت

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

(وأورد استباحة المعصية كفر) وكثير منهم إن لم يكن عامتهم يستبيحها فيكونون كفارا (وأجيب) بأن عد فعلها مباحا إنما يكون كفرا (إذا كان عن مكابرة وعدم دليل بخلاف ما) يكون (عن دليل شرعي) ، فإنه لا يكون كفرا (والمبتدع مخطئ في تمسكه) بما ليس عند التحقيق بدليل لمطلوبه (لا مكابر) لمقتضى الدليل.

اعتراض وارد ہوتا ہے کہ گناہ کو مباح سمجھنا کفر ہے اور ان مبتدعہ میں سے بہت سے لوگ اس کو جائز سمجھتے ہیں تو اس اصول کے مطابق وہ کافر قرار پائیں گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کو مباح سمجھنا تب کفر ہے جبکہ ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہو اور کسی دلیل کے بغیر ہو، اگر دلیل شرعی کی وجہ سے ایسا کیا جائے تو کفر نہیں اور مبتدع شخص غلطی اور خطا کا تو مرتکب ہے کہ اس نے غیر دلیل سے استدلال کیا لیکن دلیل کے مفہوم سے ہٹ دھرم نہیں ہے (اس لئے اس کو مطلقاً کافر کہنا درست نہیں)[1]

---

[1] التقرير والتحبير علي تحرير الكمال بن الهمام،المقالة الثالثة، مسألة المسألة الاجتهادية أي التي لا قاطع فيها من نص أو إجماع، ج٣ص٣١٨.

مستحل کے اعتبار سے شرائط کا بیان

ہر معصیت کو حلال سمجھنا کفر نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مندرجہ ذیل شرائط ہیں:

معصیت کا ثبوت قطعی ہو

جس گناہ کو حلال سمجھنے کی وجہ سے کسی کی تکفیر کی جارہی ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اس گناہ کا گناہ ہونا قطعی ہو، یعنی قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ دلائل سے اس کا معصیت ہونا ثابت ہو، لہٰذا جن گناہوں کا ثبوت اس درجہ قطعی نہ ہو تو اس کو مباح سمجھنا کفر نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مکروہ تحریمی بھی ایک معصیت ہے لیکن اگر کوئی اس کو مباح سمجھے تو کافر نہیں ہوگا کیونکہ اس کا ثبوت جن دلائل سے ہوتا ہے وہ ثبوت اور دلالت دونوں کے لحاظ سے قطعی نہیں ہوتے بلکہ صرف ایک جہت سے قطعیت بھی اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

علامہ قاسم قونوی حنفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

والمكروه: ما ثبت النهي فيه مع العارض، وحكمه: الثواب بتركه وخوف العقاب بالفعل، وعدم الكفر بالاستحلال.[1]

"مکروہ وہ حکم ہے جس کی ممانعت ثابت ہو مگر ساتھ کوئی عارض بھی ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ چھوڑنا ثواب ہے اور کرنے کی صورت میں سزا کا اندیشہ ہے اور حلال سمجھنا کفر نہیں ہے۔"

---

[1] انیس الفقهاء في تعريفات الألفاظ المتداولة بين الفقهاء ،باب الوتر والنوافل،ص: ۳۲.

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے جہاں کسی معصیت کے استہانت کو کفر قرار دیا وہاں ساتھ یہ بھی ذکر فرمایا کہ:

ولا خفاء في أن المراد ما يثبت بقطعي.

"اور اس بات میں کوئی پوشیدگی نہیں ہے کہ یہاں مقصود وہ حکم ہے جو دلیل قطعی سے ثابت ہو۔"[1]

اس شرط کو ضروری قرار دینے کی وجہ وہی ہے جو شرائط تکفیر کی بحث میں ذکر کی گئی ہے کہ بنائے کفر کا یقینی ہونا ضروری ہے، احتمالات کے بنیاد پر کسی کو کافر کہنا جائز نہیں بلکہ جس چیز کے بنیاد پر کسی کو کافر کہا جارہا ہے اس کا یقینی طور پر شریعت کی طرف سے ثابت ہونا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض متکلمین نے کسی معصیت کے استحلال کو کفر قرار دینے کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس کا معصیت ہونا متفق ہو، اگر کسی عمل کے معصیت ہونے میں ہی ائمہ مجتہدین کا اختلاف ہو تو اس کا استحلال کفر نہیں ہے۔

علامہ سید شریف جرجانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

المحرم: ما ثبت النهي فيه بلا عارض، وحكمه الثواب بالترك لله تعالى، والعقاب بالفعل والكفر بالاستحلال، في المتفق.[2]

"حرام اس کام کو کہا جاتا ہے جس کی ممانعت بغیر کسی عارض کے ثابت ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے چھوڑنا موجب ثواب ہے، اس کا ارتکاب کرنا موجب عقاب ہے اور اتفاقی ہونے کی صورت میں اس کو حلال سمجھنا کفر ہے۔"

---

[1] شرح المقاصد في علم الكلام، ج٢ص: ٢٧٠.

[2] التعريفات ،باب الميم،ص: ٢٠٥.

حرمت لعینہ ہو

حرام کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ حرام جس کی حرمت کی اصل وجہ خود اس عمل کی ذات میں موجود ہو کہ جب بھی وہ عمل پایا جائے گا تو حرمت کی بنیاد بھی ساتھ موجود ہو گی اور اس کا کرنا حرام قرار ہو گا، اس کو حرام لعینہ کہا جاتا ہے، بعض اوقات کوئی کام خود ناجائز نہیں ہوتا لیکن اس کے ساتھ کوئی اور چیز متصل ہوتی ہے اور اسی غیر کی وجہ سے اصل کام میں حرمت پیدا ہو جاتی ہے اس کو حرام لغیرہ کہا جاتا ہے مثلاً اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرنا بذات خود کوئی ناجائز کام نہیں ہے لیکن حالت حیض میں چونکہ اس کے ساتھ "اذی" موجود ہوتی ہے اس غیر کی وجہ سے حالت حیض میں جماع کرنے سے ممانعت کر دی گئی۔

فقہائے کرام کی آراء

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس حرام کو حلال سمجھنے کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے کیا اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ حرام لعینہ ہی ہو یا حرام لغیرہ کو حلال سمجھنا بھی کفر ہے؟

یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے، جس کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ فقہاءِ احناف میں سے امام سرخسی، علامہ ابن مازہ بخاری، علامہ موصلی، علامہ ابن الہمام وغیرہ بہت سے فقہاءِ کرام کے نزدیک اس کا حرام لعینہ ہونا کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ حرام لغیرہ کا انکار کرنا یا اس کو مباح سمجھنا بھی کفر ہے جبکہ حرمت ثبوت و دلالت کے لحاظ سے قطعی ہو، علامہ طاہر بن عبد الرشید اور علامہ حصکفی رحمہا اللہ وغیرہ فقہاء کرام کے نزدیک استحلال حرام کے کفر ہونے کے لئے یہ بھی ایک لازمی شرط ہے کہ اس کی حرمت لعینہ ہو۔

علامہ حصکفی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

(و) وطؤها (يكفر مستحله) كما جزم به غير واحد، وكذا مستحل وطء الدبر عند الجمهور مجتب (وقيل لا) يكفر في المسألتين، وهو الصحيح خلاصة (وعليه المعول) ؛ لأنه حرام لغيره[1]

"حائضہ (بیوی) کے ساتھ جماع کو حلال سمجھنے والے کو کافر کہا جائے گا جیسا کہ ایک سے زائد فقہاء کرام نے جزم کے ساتھ فرمایا ہے اور جمہور کے نزدیک دبر میں وطی کو حلال سمجھنے والا کا بھی یہی حکم ہے، ایک قول یہ بھی ہے کہ ان دونوں صورتوں میں تکفیر نہیں کی جائے گی کیونکہ یہ (دونوں کام) حرام لغیرہ ہیں۔"

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"اگر کوئی حرام کو حلال جانے تو اگر اس کی حرمت لعینہ ہو اور دلیل قطعی سے ثابت ہو تو اس کی وجہ سے حلال جاننے والا کافر ہو جائے گا ورنہ تو اگر حرمت لغیرہ ہو یا دلیل ظنی سے ثابت ہو تو کافر نہیں ہو گا، اور بعض فقہاء نے حرام لعینہ اور حرام لغیرہ کے درمیان (اس مسئلہ میں) کوئی فرق نہیں فرمایا۔۔"[2]

راجح بات

دونوں موقف کے دلائل پر غور کرنے سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلا ہی موقف راجح ہے کیونکہ تکفیر کا دار مدار تکذیب پر ہے اور جب ایک چیز کی حرمت قطعیت کے ساتھ ثابت ہو اور شریعت کے اس حکم کو جاننے کے باوجود کوئی اس کو حلال

---

[1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين ،كتاب الطهارة، باب الحيض، ج١ص٢٩٧.

[2] شرح العقائد،ص: ٥٤٤.

سمجھتا ہے تو وہ شریعت کی تکذیب اور اس کا انکار ہی ہے جس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، خود تکذیب کے متحقق ہونے کے لئے حرام لعینہ ہونا کوئی ضروری نہیں اور یہی در حقیقت مدارِ تکفیر ہے۔

علامہ عبد العزیز فرہاروی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ثم المختار ان المعصية اعم من ان تكون بعينها كأكل الدم او بغيرها كأكل المسروق.[1]

"پسندیدہ بات یہ ہے کہ معصیت عام ہے چاہے بعینہ معصیت ہو جیسے خون کھانا یا بغیرہ معصیت ہو جیسے چوری کی ہوئی چیز کھانا (دونوں معاصی کو حلال سمجھنا کفر ہے)۔"

تاہم یہ ضرور ہے کہ ایسی چیز کو فی نفسہ حلال سمجھنا اور چیز ہے اور اس کو کلی طور پر مباح سمجھنا اور ہے ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے، اسی طرح جس غیر کی وجہ سے حرمت پیدا ہو جاتی ہو وہ اگر وصف مفارق کے قبیل سے ہو تو اس کو حلال سمجھنے کی وجہ سے تبھی کسی کو کافر کہا جا سکتا ہے جب وہ اِس غیر کے ہوتے ہوئے بھی اس کو حلال جانے۔

اس کی نظیر یہ ہے کہ مردار کھانا اور شراب پینا قطعاً حرام اور معاصی ہیں، عام حالات میں اس کو مباح سمجھنا کفر ہے لیکن اگر کوئی شخص حالت اضطرار کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کو حلال کہے تو اس کو کافر نہیں کہا جا سکتا، اسی طرح اذان جمعہ کے بعد خرید

---

[1] النبراس شرح شرح العقائد، ص:٥٤٤.

وفروخت ناجائز ہے لیکن فی نفسہ خرید وفروخت میں کوئی مضائقہ نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگراذان جمعہ کا عارض موجود نہ ہو تو خرید وفروخت بالکل جائز ہے۔

عالم وعامی کا فرق

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ وغیرہ بعض فقہاء نے اس مسئلہ میں عالم وعامی کا جو فرق ذکر فرمایا ہے کہ اگر کوئی عالم حرام کو حلال کہے تو اس میں مندرجہ بالا تفصیل ہے لیکن اگر کوئی عام آدمی ایسا کرے تو اس کے لئے حرام لعینہ اور حرام لغیرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں بلکہ اگر حرمت قطعی ہو تو ہر صورت میں اس کی تکفیر کی جائے گی، دونوں کے درمیان اس فرق کی بنیاد بھی شاید یہی بات ہے کہ عوام لعینہ ولغیرہ کے حدود وقیود سے ناوقف ہوتے ہیں، لہٰذا اگر وہ کسی حرام کو حلال کہے تو یہ براہ راست تکذیب شارع ہے جو یقینی کفر ہے اور علماء کو عام طور پر ان دونوں قسم احکام کے درمیان فرق معلوم ہوتا ہے اس لئے ممکن ہے کہ وہ اس غیر سے قطع نظر اصل حکم کے اعتبار سے حلال کہہ رہا ہو۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

والأصل أن من اعتقد الحرام حلالا فإن كان حراما لغيره كمال الغير لا يكفر. وإن كان لعينه فإن كان دليله قطعيا كفر وإلا فلا وقيل التفصيل في العالم أما الجاهل فلا يفرق بين الحلال والحرام لعينه ولغيره وإنما الفرق في حقه إنما كان قطعيا كفر به وإلا فلا فيكفر إذا قال الخمر ليس بحرام وقيده بعضهم بما إذا كان يعلم حرمتها.[1]

---

[1] البحر الرائق ، كتاب السير، باب احكام المرتدين، ج٥ص ١٣٢ .

"قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص حرام کو حلال اعتقاد کرے تو (دیکھا جائے گا) اگر حرام لغیرہ ہو جیسا کہ دوسرے شخص کے مال کو کوئی حلال کہے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائیگی اور اگر حرام لعینہ ہو تو پھر (مزید دیکھا جائے گا) اگر اس کی دلیل قطعی ہو تو (اس کو حلال سمجھنے والا) کافر ہو گا ورنہ نہیں، اور یہ بھی ایک قول ہے کہ عالم اور جاہل کے درمیان فرق ہے، جاہل شخص حرام لعینہ ولغیرہ میں فرق نہیں کرتا اس کے حق میں تو بس یہی فرق ہے کہ اگر قطعی حرام ہو تو اس کے حلال سمجھنے سے اس کی تکفیر کی جائے گی اور اگر قطعی نہ ہو تو تکفیر نہیں ہو گی جیسا کہ وہ کہے کہ شراب حرام نہیں ہے (تو اس کو کافر کہا جائے گا کیونکہ اس کی حرمت قطعی ہے) بعض حضرات نے اس میں یہ قید بھی لگائی کہ جاہل کو تب ہی اس کافر قرار دیا جائے گا جبکہ اس کو پہلے سے اس چیز کا حرام ہونا معلوم ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں قیدیں اپنی جگہ ضروری ہیں، تکفیر کے لئے حرمت کا قطعی ہونا بھی ضروری ہے اور اگر کوئی عام آدمی اس کو حلال سمجھے تو اس پر کفار کے احکام جاری کرنے سے پہلے اس بات کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ وہ پہلے سے اس مسئلہ کو جانتا بھی ہو، جس کی پوری تفصیل موانعِ تکفیر کے ذیل میں گذر گئی۔

ضروریات دین میں سے ہونا:

بعض متکلمین حضرات نے یہ تصریح بھی فرمائی ہیں کہ کسی معصیت کو حلال سمجھنا تبھی کفر ہے جبکہ اس کا معصیت ہونا ضروریات دین میں سے ہو، یعنی عوام وخواص میں اس کا گناہ ہونا مشہور ہو اور اس کے باوجود کوئی اس کو گناہ سمجھنے کے بجائے مباح کہے تو کفر ہے، اس بات کی پوری تفصیل اور اس قید لگانے کا پس منظر باب دوم اور سوم میں مذکور ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

استحلال کے اعتبار سے شرائط کی تفصیل

استحلال کے اعتبار سے بنیادی شرط یہی ہے کہ استحلال اپنے اصل مفہوم کے ساتھ موجود ہو یعنی اعتقاداً کسی حرام کو حلال سمجھا جائے، کیونکہ جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں تحریر کیا گیا کہ استحلال کسی چیز کو جائز اور مباح سمجھنے کا نام ہے اور استحلالِ معصیت سے مراد یہ ہے کہ معصیت کو اعتقاداً حلال جانے، اس مفہوم کے اعتبار سے استحلال کے کفر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کیونکہ کسی چیز کے حرمت پر قطعی دلائل کے موجود ہونے کے باوجود اس کو مباح سمجھنا در حقیقت ان تمام قطعی دلائل کی تکذیب و انکار کرنا ہے اور قطعیات کا انکار کفر ہے۔

استحلال کسی چیز کو جائز سمجھنے اور مباح قرار دینے کا نام ہے، جب کوئی شخص کسی چیز کو جائز سمجھتا ہے تو عرب کہتے ہیں "استحلہ"، اہل لغت میں سے علامہ ابو نصر اسماعیل فارابی جوہری نے "الصحاح" میں، علامہ ابن سیدہ مرسی رحمہ اللہ نے "المخصص" علامہ زین الدین رازی رحمہ اللہ نے "مختار الصحاح" اور علامہ سید مرتضی زَبیدی رحمہ اللہ نے اپنی جامع کتاب "تاج العروس" میں استحلال کا یہی معنی لکھا ہیں[1]، اس کے علاوہ قدیم و جدید کتب لغت نے بھی تقریباً استحلال کا یہی مفہوم لکھا ہے۔

---

[1] الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية، ج٤ص ١٦٧٥.

المخصص ،ج٤ص ٦٨.

مختار الصحاح ،ج١ص ٧٩.

اہل لغت کے علاوہ حضرات فقہاء کرام اور متکلمین نے بھی استحلال کا یہی مفہوم مراد لیا اور اسی کو موجب کفر سمجھا ہے، چنانچہ شرح العقائد میں جہاں علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے استحلال کو کفر قرار دیا، اس کی تشریح کرتے ہوئے علامہ فرہاروی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"واستحلال المعصية" اي اعتقاد كونها حلالا "صغيرة كابت او كبيرة كفر" لانه تكذيب للشارع.[1]

"استحلال معصیت یعنی گناہ کے حلال ہونے کا عقیدہ رکھنا کفر ہے چاہے یہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ، کیونکہ یہ شارع کی تکذیب ہے۔"

علامہ شاطبیؒ رحمہ اللہ ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

ثم لفظ الاستحلال إنما يستعمل في الأصل فيمن اعتقد الشيء حلالا[2]

"لفظ استحلال دراصل اس شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو کسی چیز کو حلال سمجھے۔"

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أن من فعل المحارم مستحلا لها فهو كافر بالاتفاق فإنه ما آمن بالقرآن من استحل محارمه وكذلك لو استحلها بغير فعل والاستحلال اعتقاد أن الله لم يحرمها وتارة بعدم اعتقاد أن الله

تاج العروس ،ج٢٨ص ٣٢٧.

[1] النبراس،ص٥٤٣.

[2] الاعتصام للشاطبي،الباب السابع، فصل أفعال المكلفين التي تكون من قبيل العادات هل يدخل فيها البدع ،ج٢ص٥٨٢.

حرمها وهذا يكون لخلل في الإيمان بالربوبية أو لخلل في الإيمان بالرسالة[1]

"جو کوئی استحلال کے ساتھ حرام کاموں کا ارتکاب کرے تو وہ بالاتفاق کافر ہو جاتا ہے کیونکہ (جیساکہ حدیث شریف میں ہے کہ) جو کوئی قرآن کے حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھے، وہ (گویا) قرآن پر ایمان ہی نہیں لایا، اور استحلال (کی دو صورتیں ہیں، ایک) یہ ہے کہ اس بات کا عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام ہی نہیں قرار دیا اور یا (دوسری صورت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس چیز کے حرام نہ ہونے کا خیال رکھا جائے، ایسا تب ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کے ربوبیت یا حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان لانے میں کوئی خلل باقی ہو۔"

حضرت مولانا مفتی رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ ارشاد فرماتے ہیں:

"استحلال معصیت یہ ہے کہ اس کو مباح جانے، لہذا خوف اس پر عذاب کا مطلقاً جائز ہے بلکہ جائز جانے، نہ یہ کہ دل میں غیر جائز جان کر کچھ اندیشہ غالب نہ ہو یا اس قدر علم ہو کہ یہ فعل اچھا نہیں، یہ بھی استحلال نہیں، اور استحلال بھی اس معصیت کا کفر ہے کہ ثبوت معصیت کا نص قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ سے ہو اور حرمت بھی اس کی لعینہ ہو نہ لغیرہ[2]، اگر ان قیود میں سے کوئی مرتفع ہو جائے تو کفر نہ ہوگا، لہٰذا کم ایسے لوگ ہوں گے کو کفر کے درجہ تک پہنچیں گے۔"[3]

---

[1] الصارم المسلول على شاتم الرسول، ص: ٥٢١.

[2] بہت سے حضرات فقہاء کرام اور متکلمین نے استحلال کے بنیاد پر تکفیر کے لئے یہ شرط بھی لگائی ہے جس کی پوری بحث پہلے گذر چکی۔

[3] فتاوی رشيديه (محقّق ومدلّل)، كتاب الايمان والكفر، ص٦٢.

استحلالِ عملی

یہاں اس بات کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے کہ استحلال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے جس کو استحلالِ عملی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے چنانچہ بہت سے متکلمین نے استحلال کا یہی مفہوم ذکر کیا ہیں کہ اگر کوئی شخص برملا زبان سے تو کسی حرام کو حلال نہ کہے لیکن معصیت کا ارتکاب ہی اس ڈھنگ سے کرے جس سے ناظرین کو یہی دکھائی دے کہ یہ شخص اس عمل کو حرام اور معصیت سمجھتا ہی نہیں، تو یہ بھی استحلال میں داخل ہے، کیونکہ استحلال شارع کی براہ راست تکذیب و انکار کو نہیں کہا جاتا بلکہ یہ تکذیب کے ایک علامت اور پہچان کا نام ہے جہاں خود تکذیب کرنے والا اپنی تکذیب پر کسی کو اطلاع نہیں دیتا بلکہ اس کی حرکات وسکنات ہی اس کی ترجمان بن جاتی ہیں۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

"مجرد الإقدام على الكبيرة لغلبة شهوة أو حمية أو أنفة أو كسل خصوصاً إذا اقترن به خوف العقاب ورجاء العفو والعزم على التوبة لا ينافيه، نعم إذا كان بطريق الاستحلال والاستخفاف كان كفراً لكونه علامة للتكذيب." [1]

"شہوت کے غلبہ، غیرت وحمیت یا سستی کی وجہ سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنا ایمان وتصدیق کے منافی نہیں ہے خصوصاًاگر اس کے اخروی سزا کا بھی خوف اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کی امید اور توبہ کرنے کا عزم بھی شامل ہو، تاہم استحلال واستخفاف کے طور پر کبیرہ کا ارتکاب کرے تو یہ کفر ہے کیونکہ یہ

[1] شرح العقائد النسفية ، مبحث مرتكب الكبيرة، ٦٣.

اندر روانی تکذیب کی علامت ہے۔"

اس کی وضاحت کرتے ہوئے شرح عقائد کے مشہور شارح علامہ خیالی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

"بطریق الاستحلال" علی وجه یفهم منه عده حلالا، فان الکبیرة علی هذا الوجه علامة عدم التصدیق القلبي."

""استحلال" سے مقصود اس طور پر ارتکاب کرنا ہے جس سے سمجھا جائے کہ وہ اس کو حلال جان رہا ہے، کیونکہ کبیرہ کا اس طور پر ارتکاب کرنا دلی تصدیق نہ ہونے کا قرینہ ہے۔"

علامہ خیالی کی اس عبارت کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی رحمہ اللہ تعالیٰ اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"یعني انه لیس المرادبالاستحلال عده حلالا لانه نفس تکذیب الشارع، والکلام فیماجعله الشارع علامة التکذیب"

"استحلال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی اس کو حلال سمجھے کیونکہ حلال سمجھنا تو شارع کی (صریح) تکذیب ہے اور ہماری بحث تو ان امور کے متعلق ہے جن کو شارع نے تکذیب کی علامت قرار دیا (نہ کہ بعینہ تکذیب کے متعلق، لہٰذا اس سیاق میں اس کو ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے)۔"

شرح العقائد ہی کے ایک اور مستند شارح علامہ عبدالعزیز فرہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی علامہ خیالی کے اس نکتہ کے ساتھ اتفاق کیا۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

"بطریق الاستحلال والاستخفاف" اي بوجه یدل علي انه یعتقدهاحلالا او خفیفا، کذا فسّرهما المحققون لان الاستحلال

والاستخفاف ان حملا علي ظاهرهما فهماعين التكذيب والكلام في اماراته"[1]

یہ چند عبارات ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ صرف اعتقاداً استحلال ہی کفر نہیں بلکہ بعض اوقات عملی استحلال بھی موجب کفر بن جاتا ہے یعنی استحلال کے لئے اعتقاداً مباح سمجھنا کوئی ضروری نہیں ، بلکہ اگر کوئی شخص کسی گناہ کا ارتکاب اس انداز سے کرے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتا بلکہ جائز سمجھتا ہے تو وہ بھی کافر ہے۔

عملی استحلال کے متعلق ایک ضروری وضاحت

یہ حضرات متکلمین کی چند عبارات ہیں اور حضرات فقہائے کرام نے بھی مختلف جزئیات کے ضمن میں اس کی فی الجملہ تائید فرمائی ہیں، البتہ بسااوقات ان عبارات کی بناء پر ایسے استدلالات کئے جاتے ہیں جو اس مسئلہ کی نزاکت اور اس میں غیر معمولی احتیاط سے سراسر متصادم ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قطعی دلائل سے ثابت شدہ گناہ کو گناہ نہ سمجھنا کفر ہے لیکن جیسا کہ "شرائط تکفیر" کے ضمن میں تفصیل کے ساتھ یہ بات تحریر کی گئی کہ کسی معین شخص کو کافر قرار دینے سے پہلے اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ مدار تکفیر اس شخص میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر اطمینان بخش دلائل مثلاً گواہوں یا خود اس شخص کے زبانی اعتراف واقرار سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ بنائے تکفیر کا قائل ہے اور بنائے

---

[1] النبراس شرح شرح العقائد، ص۲۲۷.

تکفیر بھی ایسی ہو کہ اس میں کفریہ پہلو کے علاوہ اور کوئی قابلِ التفات پہلو نہ ہو، تو اس کے بعد اس بات کی بھی تحقیق ضروری ہے کہ "موانع تکفیر" میں سے کوئی مانع موجود تھا یا نہیں؟ اگر تکفیر کے موانع میں سے کوئی مانع بھی موجود نہ ہو تب ہی اس کی تکفیر کرنا درست ہے، محض افواہوں اور اندازوں سے کسی کا نام لے کر تکفیر کرنا شرعاً جائز نہیں۔

اس ضابطہ کو ملحوظ رکھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان شخص کسی گناہ کا ارتکاب کرے اور ارتکاب بھی کچھ ایسے بے پرواہی کے ساتھ ہو کہ بظاہر اس گناہ کی شناعت وقباحت ہی گویا دل ودماغ میں برقرار نہ ہو تو یہ اگرچہ نہایت خطرناک اور افسوسناک اقدام ہے جس کی شریعت میں کسی طرح گنجائش نہیں ہوسکتی بلکہ ایسا لااُبالی پن کفر کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتا ہے لیکن ہر جگہ اس کو تکذیب واستحلال کی کوئی ایسی یقینی دلیل سمجھنا درست نہیں جس میں کوئی اور احتمال ہی موجود نہ ہو اس لئے محض اس بناء پر قطعی تکفیر کرنا درست معلوم نہیں ہوتا، بلکہ جیسا کہ پہلے مندرجہ بالا عبارات سے واضح ہوا کہ اگر کوئی زبان سے بھی حرام کو حلال کہے لیکن اس کہنے کی بنیاد کوئی دنیوی لالچ یا ناواقفیت ہو تو بھی اس کی تکفیر کرنا درست نہیں جیسا کہ شرح عقائد اور البحر الرائق وغیرہ کی عبارات سے پہلے واضح ہوچکا، حالانکہ اقوال کی بنسبت افعال میں اس سے زیادہ احتمالات موجود ہوتے ہیں۔

اس لئے محض کسی کے عمل سے ہر حال میں اس قسم کا استدلال کرنا اور بہر صورت اس پر تکفیر کی بنیاد رکھنا درست نہیں ہے جبکہ اس بات کا اچھی طرح اطمینان حاصل نہ ہوجائے کہ وہ عملی کوتاہی کے ساتھ ساتھ اس کو حلال بھی سمجھتا ہے، ہاں البتہ اگر خود عامل کا یہی خیال ہو اور وہ دل میں بھی اس کو حلال سمجھتا ہو تو البتہ یہ ایسا کرنا موجبِ کفر

ہے اور اس سے وہ کافر ہو سکتا ہے لیکن کسی کے متعلق محض ایسا گمان رکھنا تکفیر کے لئے کافی نہیں یعنی ایسا کرنا کفر کا موجب تو ہو سکتا ہے لیکن تکفیر کا نہیں، اسی طرح اگر کسی کو دوسرے ایسے قرائن سے اس بات کا یقین ہو جائے جس میں دوسرے پہلو کا کوئی قابل توجہ پہلو موجود ہی نہ ہو تو بعض شرائط کی رعایت رکھنے کے ساتھ اس کا حکم مختلف ہو سکتا ہے جیسا کہ نبراس وخیالی وغیرہ کی عبارات میں ذکر ہو چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ متکلمین حضرات کی مندرجہ بالا عبارات سے عام قانون بنانا اور ہر جگہ معصیت کے ارتکاب کو دیکھ کافر قرار دینا درست نہیں جب تک کہ قطعیت کے ساتھ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ اس کو جائز سمجھ رہا ہے، متکلمین حضرات جس دلیل استخفاف کی بناء پر تکفیر کا ذکر کرتے ہیں اس سے ہر دلیل مراد نہیں بلکہ ایسی دلیل ضروری ہے جو قطعیت کے ساتھ اپنے مدلول یعنی استحلال پر دلالت کریں، اگر معصیت کے ساتھ ساتھ کوئی ایسی دلیل پائی جائے تب ہی تکفیر کی جا سکتی ہے۔

ورنہ اگر یوں ہی کسی کے عمل سے اس کے جائز سمجھنے کا دروازہ کھلا رہا تو امتِ مرحومہ کے اگر کروڑوں نہیں تو لاکھوں افراد ضرور تکفیر کے ضد میں آجائیں گے، پھر اگر اس طرح استدلال کرنے میں مزید کچھ سخاوت سے کام لیا جائے جیسا کہ بعض اوقات دیکھنے میں آتا ہے تو خطرہ ہے کہ امت مسلمہ کی اکثریت ہی کو اپنے اصل سرمایہ نجات سے محرومی کا سامنا نہ کرنا پڑے، اللہ تعالیٰ ہی اپنے حبیب ﷺ کے اس لاڈرلی امت کا حامی وناصر ہو۔

استخفاف

"استخفاف" خف سے بنا ہے جو ہلکے پن اور پست ہو جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے، استخفاف چونکہ باب استفعال کا صیغہ ہے جس کے خاصیات میں سے وجدان یاحسبان بھی ہے، اس لئے اس کا معنی ہوا کسی چیز کو ہلکا سمجھنا، حقیر سمجھنا، ذلیل خیال کرنا، اسی طرح کسی چیز کے توہین اور تذلیل کرنے کو بھی "استخفاف" کہا جاتا ہے۔

استخفاف کی صورتیں

استخفاف کی دو شکلیں ہیں:

ا۔ جن چیزوں کو شریعت نے عزت واحترام بخشا ہے اس کو حقیر سمجھنا یا اس کی توہین کرنا، مثلاً قرآن کریم ہے اگر کوئی (نعوذ باللہ) اس کی توہین کرے اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے یا اس کو حقارت یا عناد کے ساتھ زمین پر پھینک مارے تو اس نے اس کا استخفاف کیا اور اس کی وجہ سے اس کی تکفیر کی جائے گی، یہی حکم تمام شعائر اللہ کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تعظیم واحترام کے مقابلے میں اس کی توہین وتذلیل کفر ہے۔

۲۔ جن امور کو شریعت نے معاصی قرار دیا، اس کے کرنے پر وعید سنائی اور اس کو سنگین جرم قرار دیا، اگر کوئی شخص جاننے کے باوجود اس کام کو بالکل معمولی بات سمجھے، اسی کا اعتقاد رکھے اور شریعت کی بیان کی ہوئی ہولناکی اور سنگینی کو کوئی اہمیت نہ دے تو یہ بھی شریعت کے حکم کا استخفاف ہے جو موجبِ کفر ہے۔

فقہاءِ کرام ایسے شخص کی تکفیر کرتے ہیں کیونکہ شریعتِ مطہرہ نے جس چیز کو احترام وعزت دی ہے اس کو ذلیل سمجھنا خود شریعت کے ساتھ معارضہ ہے اسی طرح جس کام کو شریعت نے ایک سنگین جرم قرار دیا اس کی سنگینی پر یقین نہ کرنا خود شارع کی تکذیب ہے اور شارع کی تکذیب یقیناً کفر ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

أعلم أن من استخف بالقرآن أو المصحف أو بشئ منه أو سبهما أو جحده أو حرفا منه أو آية أو كذب به أو بشئ منه أو كذب بشئ مما صرح به فيه من حكم أو خبر أو أثبت ما نفاه أو نفى ما أثبته على علم منه بذلك أو شك في شئ من ذلك فهو كافر عند أهل العلم بإجماع..

جان لو کہ جو شخص قرآن کریم، مصحف یا اس کے کسی حصہ کا استخفاف کرے یا اس کی گستاخی کرے یا اس کا انکار کرے، اس کے کسی حرف یا آیت کا انکار کرے، جس حکم، خبر وغیرہ کی تصریح قرآن نے کی ہے اس کی تکذیب کرے، جس چیز کو قرآن نے نفی کیا ہے اس کو کوئی ثابت کرے یا جس کو ثابت کیا ہے کوئی جاننے کے باوجود اس کی نفی کرے یا اس میں شک کرے تو تمام اہل علم کے اتفاق سے کافر ہو جائے گا۔"[1]

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

وأما استحلال المعصية بمعنى اعتقاد حلها فكفر صغيرة كانت أو كبيرة وكذا الاستهانة بها بمعنى عدها هينة ترتكب من غير مبالاة وتجري مجرى المباحات.

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى، الباب الثالث في حكم من سب الله تعالى وملائكته وأنبياءه، فصل، ج٢ص٣٠٤.

"استحلال اگر جائز سمجھنے کے معنی میں لیاجائے تو یہ کفر ہے چاہے گناہ کبیرہ کااستحلال ہو یاصغیرہ کا،اسی طرح استہانت کا معنی ہے سستا اور ہلکا سمجھنا کہ سوچ وپرواہ کے بغیر مباح کام کی اس کا ارتکاب کرتا رہے۔"[1]

قطب الارشاد حضرت مفتی رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ایک سکول کے متعلق استفسار کیا گیا جس میں عیسائی مشنری ہندوستان کے اندر مسلمان عورتوں سے حضرت عیسی علیہ السلام کے متعلق کفریہ کلمات کہلواتی تھی،اس سوال کے جواب میں حضرت رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

"اوران سخت کلمات کی پروانہ کرنا اور سہل جاننا بھی یہ کفرہے"الاستهانة بالمعصية بان يعدها هينة ويرتكبها من غير مبالاة بها ويجريها مجرى المباحات في ارتكابها كفر" [2]

---

[1] شرح المقاصد في علم الكلام، ج٢ص: ٢٧٠.

[2] تاليفات رشيدية، عنوان"عمدا كلمه كفربولنا"ص٦٦.

استہزاء

"استہزاء"ہزء سے مشتق ہے، جو اگرچہ لغت میں کئی معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر بنیادی طور پر یہ لفظ کسی کے ساتھ مذاق اور مسخرہ پن کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، خود قرآن کریم نے بھی متعدد جگہوں پر اس مادے کو اسی معنی میں استعمال فرمایا ہے۔

علامہ ابن فارس رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

(هزأ) الهاء والزاء والهمزة كلمة واحدة. يقال: هزئ واستهزأ، إذا سخر[1].

علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ استہزاء اگرچہ باب استفعال کا صیغہ ہے جس میں عام طور پر طلب کا معنی پایا جاتا ہے جس کے مطابق اس کا "معنی مزاق ومسخرہ طلب کرنا" ہونا چاہئے، لیکن یہاں اس سے یہ معنی مراد نہیں لیا جاتا بلکہ مسخرہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔[2]

استہزاء کیا ہے؟

قرآن وسنت کے متعدد دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا مذاق اڑانا کفر ہے حضرات فقہاء کرام نے دین کے تمام ثابت شدہ احکام کو بھی اس میں داخل فرمایا کہ دین کے کسی بھی حکم کے ساتھ استہزا کرنا کفر ہے، استہزاء چونکہ

---

[1] مقاييس اللغة، ج٦ ص:٥٢.

[2] المفردات في غريب القرآن ،ص ٨٤١.

کوئی مشکل یا کوئی نیا لفظ نہیں تھا اس لئے اس کے تعریف کرنے کی کوئی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی، عام عادت میں لوگ جس چیز کو استہزاء ومذاق سمجھتے ہیں اسی کو استہزاء قرار دیا جائے گا، اسی طرح کسی کی کمزوری، اس کے عیوب ونقائص کو مسخرانہ انداز میں بیان کرنا بھی استہزاء کی شکل ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

ومعنى السخرية الاستهانة والتحقير والتنبيه على العيوب والنقائص على وجه يضحك منه وقد يكون ذلك بالمحاكاة في الفعل والقول وقد يكون بالإشارة والإيماء.[1]

سخریہ کا معنی مذاق اڑانا، حقارت کرنا، اور عیوب ونقائص کی طرف ایسے انداز میں اشارہ کرنا ہے جس سے ہنسا جائے۔"

نیز استہزاء کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ خاص زبان سے کوئی مضحکہ خیز بات نکالی جائے، بلکہ بعض اوقات اشارات اور حرکات وسکنات کے ذریعے بھی کسی کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اس کو مذاق کہا اور سمجھا جاتا ہے، ایسی تمام صورتیں استہزاء کے عموم میں داخل ہیں، اگر کوئی شرعی احکام یا شعائر اللہ کے ساتھ اس طرح استہزاء سے پیش آئے تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔

امام غزالی رحمہ اللہ مندرجہ بالا عبارت کے بعد لکھتے ہیں:

وقد يكون ذلك بالمحاكاة في الفعل والقول وقد يكون بالإشارة والإيماء.

[1] إحياء علوم الدين ، كتاب آفات اللسان، ج٣ص١٣١.

کبھی یہ مذاق کام یا گفتگو میں نقل اتارنے کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی اشارہ کے ذریعے بھی ہوتا ہے۔[1]

شرعی احکام کا مذاق کفر ہے

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو ملک شام فتح ہونے اور وہاں کے خزانے غنیمت میں آنے کی پیش گوئی فرمائی، تو چند منافقین بطور مسخرہ یہ کہنے لگے کہ "اس شخص" کا یہ خیال ہے کہ ملک شام فتح ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو منافقین کے اس کرتوت کی اطلاع دیدی، حضور ﷺ نے ان منافقین کو واضح فرمایا کہ ایسا کہنا کفر ہے۔

چنانچہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ (٦٥) لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ إِنْ نَعْفُ عَنْ طَائِفَةٍ مِنْكُمْ نُعَذِّبْ طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ (٦٦)

"اور اگر آپ ان سے پوچھیے تو کہدینگے کہ ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے آپ (ان سے) کہدیجئیے گا کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے۔ تم اب (یہ بیہودہ) عذر مت کرو تم اپنے کو مومن کہہ کر کفر کرنے لگے اگر ہم تم میں سے بعض کو چھوڑ بھی دیں تاہم بعض کو تو (ضرور ہی) سزا دینگے بسبب اس کے کہ وہ (علم ازلی) میں مجرم تھے۔"

---

[1] ایضا.

اس آیت کریمہ میں منافقین کی اس مسخرہ بازی کو کفر قرار دیا گیا، امام ابو بکر الجصاص الرازی رحمہ اللہ تعالیٰ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

فيه الدلالة على أن اللاعب والجاد سواء في إظهار كلمة الكفر على غير وجه الإكراه لأن هؤلاء المنافقين ذكروا أنهم قالوا ما قالوا لعبا فأخبر الله عن كفرهم باللعب بذلك وروي عن الحسن وقتادة أنهم قالوا في غزوة تبوك أيرجو هذا الرجل أن يفتح قصور الشام وحصونها هيهات هيهات فأطلع الله نبيه على ذلك فأخبر أن هذا القول كفر منهم على أي وجه قالوه من جد أو هزل فدل على استواء حكم الجاد والهازل في إظهار كلمة الكفر ودل أيضا على أن الاستهزاء بآيات الله وبشيء من شرائع دينه كفر فاعله

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکراہ کے بغیر کلمہ کفر کہنے میں سنجیدگی کے ساتھ کہنے والے اور مذاق کرنے والے کا حکم ایک ہے،۔۔۔اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور دین کے احکام کے ساتھ استہزاء کرنا کفر ہے۔"[1]

استہزاء کے موجب کفر بننے کی اصل وجہ

اس سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ کا استہزا کفر ہے جس کی وجہ سے کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعظیم و محبت ایمان کے ان بنیادی لوازمات میں سے ایک ہے جن کے نہ ہونے سے ایمان کا اعتبار نہیں ہوتا، اور استہزا کرنے کی صورت میں چونکہ تعظیم باقی نہیں رہتی اس لئے اس کو بالاتفاق کفر قرار دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ استہزاء کے موجب کفر ہونے کے لئے یہ کوئی ضروری نہیں کہ

[1] أحكام القرآن للجصاص، ج٤ص ٣٤٨.

فرائض واجبات کا مذاق اڑائے بلکہ اگر سنت کا بھی کوئی مذاق اڑائے تو بھی کافر ہو جائے گا بشرطیکہ اس کو اس کے مسنون ہونے کا علم ہو۔

علامہ داماد آفندی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ومن استخف بسنة أو حديث من أحاديثه عليه الصلاة والسلام.. كفر.

"جو شخص کسی سنت یا حضور ﷺ کے احادیث میں سے کسی حدیث کا مذاق اڑائے تو وہ کافر ہے۔"[1]

ایک اصولی اشکال اور اس کا جواب

عام طور پر اصولیین حضرات جب خبر واحد کا حکم ذکر فرماتے ہیں تو اس میں یہ تفصیل ذکر کرتے ہیں کہ اس کا استخفاف کے ساتھ اس کو چھوڑنا فسق ہے اور تاویل کے ساتھ ترک کرنا فسق بھی نہیں، اس سے یہ اشکال پیدا ہو جاتا ہے کہ فقہاء کرام کے نزدیک تو کسی بھی حدیث و سنت اور دینی احکام کا استخفاف بھی کفر ہے، یعنی اگر کسی کے علم کے مطابق کوئی حدیث یا سنت حضور ﷺ سے ثابت ہو اور اس کے باوجود اس کا استخفاف کرے تو فقہاء کرام کے جزئیات کے مطابق وہ کافر قرار پائے گا جبکہ اصولیین کے نزدیک یہ فسق ہے کفر نہیں، جس سے خیال ہوتا ہے کہ فقہاء کرام کے یہ جزئیات خلاف اصول ہیں۔

---

[1] مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر، كتاب السير، باب المرتد، ج١ص ٦٩٢.

لیکن یہ شبہ کرنادرست نہیں ہے کیونکہ فقہاء کرام کے نزدیک استخفاف کا معنیٰ اور ہے اور اصولیین کے نزدیک اور، فقہاء صرف خبر واحد پر عمل نہ کرنے کو استخفاف نہیں کہتے بلکہ اگر چھوڑنے کے ساتھ ساتھ استہزاء کا ارتکاب کیا جائے تو استخفاف کہلائے گا جبکہ اصولیین صرف عمل نہ کرنے یا ثبوت سے انکار کرنے کو بھی استخفاف قرار دیتے ہیں اگرچہ اس میں استہزاء کا کوئی پہلو موجود نہ ہو، لہٰذا یہ محض اصطلاحات کا فرق ہے حقیقت میں دونوں حضرات کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔

فقہاء کرام جس چیز کو استخفاف سمجھتے ہیں وہ دونوں کے نزدیک کفر ہے اور اصولیین کے نزدیک جو چیز استخفاف قرار پاتی ہے وہ دونوں کے نزدیک کفر نہیں بلکہ فسق ہے۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

وقد ظهر لي انّ معنى الاستخفاف مختلف فمراد الاصوليين به الانكار بغير تاويل مع رسوخ الادب ومراد الفقهاء الانكار مع الاستهزاء ولا شكّ في كون الثاني كفرا. [1]

مجھے واضح ہوا کہ استخفاف کا معنیٰ مختلف ہے، اصولیین کے نزدیک اس سے تاویل کے بغیر انکار کرنا مراد ہے جبکہ پورے ادب واحترام کے ساتھ ہو اور فقہاء کرام کے نزدیک اس سے استہزا کے ساتھ ترک کرنا مراد ہے، اور دوسرے مفہوم کے مطابق اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

---

[1] مشكوة الانوار في اصول المنار، ص:۲۵۳. مكتبه اسلاميه كوئته.

استہزاء کے بناء پر تکفیر کرنے کی شرائط

استہزاء تب ہی موجب کفر بنے گا جب خود حکم شرعی پر استہزاء کی جسارت کی جائے، اگر دیگر عناصر کی وجہ سے کوئی استہزاء کرے خود حکم شرعی کا استہزاء کرنا مقصود نہ ہو تو جس چیز کا استہزاء کیا جارہا ہے اگر اس کا شریعت سے کوئی نسبت ہو تو ایسی صورت میں استہزاء کرنا اگرچہ خطرہ سے خالی نہیں مگر محض اس کی بناء پر اس کو کافر قرار دینا بھی درست نہیں، مثلاً ایک شخص نے داڑھی رکھی ہے مگر اس کا پوری طرح خیال نہیں رکھتا جس کی وجہ سے بال ادھر ادھر بکھرے پڑے رہتے ہیں، اب اگر کوئی شخص اس بد حالی اور پراگندی کی وجہ سے اس کا مذاق اڑائے، خود داڑھی کا مذاق واستخفاف بالکل مقصود نہ ہو تو اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا کیونکہ خود داڑھی رکھنا شریعت کا حکم ہے جس کا مذاق اڑانا کفر ہے لیکن داڑھی والے کا مذاق کفر نہیں۔

یہی حکم علماءِ کرام کے مذاق اڑانے اور ان کی توہین وتذلیل کرنے کا بھی ہے کہ اس منصب کی حامل شخصیات کا توہین وتحقیر کرنا بالکل ناجائز اور بڑی ناشکری ہے لیکن اس اقدام کی وجہ سے کسی کو تبھی کافر قرار دیا جاسکتا ہے جبکہ اسی علم دین کی وجہ سے مذاق اڑائے، اگر کسی ذاتی رنجش یا دنیوی ناراضگی کی وجہ سے کوئی ایسا کرے تو اس کو کافر قرار دینا غلط ہے، البتہ اگر کہیں کسی کے بارے میں یقین ہو جائے کہ وہ محض اسی دینی علم کی یا دینی نسبت کی وجہ سے مسخرہ کررہا ہے تو اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

علامہ ابن قاضی سماوہ رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

أبغض عالماً أو فقيهاً بلا سبب ظاهر خيف عليه الكفر..جلس على مكان مرتفع وتشبه بالمذكرين ويتمسخر والقوم يضحكون كفروا وكذا

من تشبه بالمعلمين في مجمع ويضحك القوم كفروا جميعاً.[1]

اگر کسی ظاہری وجہ کے بغیر کسی فقیہ یا عالم (دین) سے نفرت رکھے تو اس پر کفر کا ڈر ہے۔۔ کوئی شخص کسی بلند جگہ بیٹھا، واعظ کی طرح مشابہت اختیار کر کے مسخرہ کرنے لگا اور لوگ اس کو دیکھ کر ہنسے تو سب کافر ہوئے، اسی طرح جو شخص کسی مجلس میں (دینی علوم کے) معلمین کی طرف مشابہت اختیار کرے اور لوگ اس سے ہنسے تو سب کافر ہو جائیں گے۔"

پہلی صورت میں جزم کے ساتھ کافر نہ کہنے کی وجہ یہی ہے کہ وہاں خود علم دین کی توہین یقینی نہیں جبکہ دوسری صورت میں چونکہ دین علم و تعلیم ہی کا مذاق مقصود ہے اس لئے اس کو جزم کے ساتھ موجب قرار دیا گیا۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے ان دونوں مسائل کو نقل کرنے کے بعد مزید فرمایا:

يكفر الجميع لاستخفافهم بالشرع. وكذا لو لم يجلس على مكان مرتفع ولكن يستهزئ بالمذكرين ويتمشى والقوم يضحكون.[2]

"سب (مذاق اڑانے والے اور ہنسنے والے ناظرین) کافر ہو جائیں گے کیونکہ انہوں نے شریعت کا مذاق اڑایا، اسی طرح اگر کوئی اونچی جگہ تو نہ بیٹھے لیکن واعظین کا استہزاء کرے، (تذلیل کے لئے ان کی طرح) چلے اور لوگ اس سے ہنسے (تو بھی سب کافر ہو جائیں گے۔)"

---

[1] جامع الفصولين، الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية، ج۲ص ۱۷۱.

[2] البحر الرائق، كتاب السير، باب أحكام المرتدين، ج٥ص ۱۳۲.

ان عبارات میں ہنسنے والے ناظرین کو بھی کافر قرار دیا گیا کیونکہ ہنسنا خوشی اور رضامندی کی دلیل ہے لہٰذا اس موقع پر ہنسنے کا مطلب یہ ہے کہ مذاق اڑانے پر خوش ہو رہا ہے اور چونکہ خود یہ مذاق اڑانا کفر ہے لہٰذا اس پر راضی ہونا بھی کفر ہے، لیکن اگر کہیں کوئی کلام ایسا مضحکہ خیز ہو کہ جس کے بعد ہنسنا اختیار میں نہ رہے تو البتہ اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ کفر وارتداد کے لئے اختیار ورضامندی شرط ہے۔

علامہ ملا خسرو رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں:

ومن تكلم بكلمة الكفر وضحك غيره يكفر الضاحك إلا أن يكون الضحك ضروريا بأن يكون الكلام مضحكا.[1]

"جو کوئی کفریہ بات کہے اور دوسرا شخص سن کر ہنسے تو ہنسنے والا کافر ہو جائے گا، تاہم اگر ہنسنا ضروری ہو کہ مثلاً کلام مضحکہ خیز ہو (تو اس صورت میں ہنسنا کفر نہیں)۔"

دوسری شرط: دینی حکم ہونے کا علم

استہزاء کے موجب کفر ہونے کے لئے دوسری بڑی شرط یہ ہے کہ مذاق اڑانے والے کو یہ معلوم ہو کہ جس چیز کا میں مذاق اڑا رہا ہوں، وہ واقعۃً دینی حکم ہے، اگر کسی نے لاعلمی میں کسی سنت کا مذاق اڑایا تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی جیسا کہ موانعِ تکفیر کے ضمن میں تفصیل سے گزر چکا۔

---

[1] درر الحكام شرح غرر الأحكام ، قبيل كتاب النكاح، ج١ ص ٣٢٤.

فقہاءِ کرام کے ذکر کردہ تفصیل پر اشکال کا جواب

بعض لوگوں کی طرف سے اس پر یہ اشکال اٹھایا جاتا ہے کہ ایمان و کفر کا دار مدار اصلاً قلب پر ہے جو ایک پوشیدہ امر ہے اس لئے اصل مدار کو معلوم کئے بغیر محض قرائن کی بنیاد پر تکفیر جیسا بڑا اقدام جائز نہیں، اپنے اسی خیال کے تحت وہ فقہاء کرام کے ان تفصیلات کو قابل توجہ نہیں سمجھتے بلکہ (معاذاللہ) اس کو بے احتیاطی اور حد سے تجاوز قرار دیتے ہیں، اور اپنے اسی خیال کی بناء پر ان حضرات کی فیاضی کا یہ عالم ہے کہ شاید دنیا میں کسی کو بھی کافر نہیں کہتے۔

لیکن یہ اشکال بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ متعدد نصوص میں اسی بناء پر کسی کو کافر قرار دیا گیا چنانچہ سورۃ براءۃ کی مندرجہ بالا آیت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کو کافر قرار دیا، حالانکہ انہوں نے یہ معذرت کر دی تھی کہ ہم صرف خوش دلی اور مذاق کے طور پر یہ کہتے ہیں، حضور ﷺ کی تکذیب کرنا ہمارا مقصود نہیں، لیکن قرآن کریم میں ان کے باوجود اس کو کافر کہا گیا اور ان کی اس معذرت کو قبول نہیں فرمایا۔

آپ ﷺ کے بعد خلفاء راشدین اور امت کا اجماعی تعامل بھی یہی رہا کہ کسی کے دل کے اندر جھانک کر یہ معلوم نہیں کیا کہ تصدیق برقرار ہے یا اس کی جگہ تکذیب نے گھیر لی ہے بلکہ امت نے ہمیشہ شریعت کے دئے ہوئے معیار کے مطابق ایمان و کفر کا فیصلہ کیا اور اسی کے مطابق شرعی احکام کو جاری فرمایا۔

منکرینِ زکوۃ کے متعلق حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مکالمہ اور اس کے بعد تمام صحابہ کرام کے اتفاق کے بعد اس بات میں کوئی اشکال باقی نہیں رہ پاتا۔

ایک مسلم ضابطہ

اس کے علاوہ دین اور عقل دونوں کا مسلمہ ضابطہ ہے کہ جو چیز پوشیدہ ہو جس کی حقیقی صورت حال معلوم کرنا انسان کے بس میں نہ ہو تو وہاں ظاہری قرائن ہی کے بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے، مثلاً خوش ہونا دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے اسی طرح غمگیں ہونا بھی ایک خاص دلی کیفیت ہے اور ظاہر ہے کہ دلی کیفیات کی یقینی صورت حال معلوم نہیں ہوسکتی، بلکہ اگر کوئی دل کھول کر بھی معلوم کرنا چاہے تو ناکامی ہی اس کی تقدیر بنے گی کیونکہ کیفیت آنکھ سے نظر آنے والی چیز ہے ہی نہیں، اس لئے اس کا تقاضا یہ ہے کہ کم از کم اس دنیا میں کسی کو خوش یا غمگیں نہ کہا جائے ورنہ یہ جھوٹ شمار ہوگا کہ دل کی حالت کا علم حاصل کئے بغیر ہی اس کا فیصلہ کیا اور جھوٹ کے گناہ کبیرہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کوئی نہیں کرتا، پوری انسانیت اس تکلف کا کوئی خیال نہیں کرتی بلکہ انسان کی ظاہری صورت حال دیکھ کر بلا تکلف خوش ہونے یا ناخوش ہونے کے فیصلے کرتی رہتی ہے، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان جیسے پوشیدہ امور کے متعلق فیصلہ کرنے میں ظاہری قرائن ہی کافی ہیں، بس یہی حال کفر و اسلام کا بھی ہے کہ ان دونوں کا اصل مدار اگرچہ دل کے تصدیق و تکذیب پر ہے لیکن چونکہ اس کا یقینی علم ہمیں حاصل نہیں ہوسکتا، اس لئے شریعت مطہرہ میں بعض مضبوط قرائن کو اس کا قائم مقام ٹھہرایا۔

علامہ موصلی، قاسم قطلوبغا اور علامہ خیالی کی وضاحت

علامہ ابن مودود موصلی رحمہ اللہ ایک مسئلہ کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

أن الإتيان بخاصية الكفر يدل على الكفر، فإن من سجد لصنم أو تزيا بزنار أو لبس قلنسوة المجوس يحكم بكفره.[1]

کفر کے امتیازی کام کا ارتکاب کرنا کفر پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جو شخص بت کو سجدہ کرے، یا زنار باندھے یا مجوسیوں والی ٹوپی پہنے تو اس کے کافر ہونے کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

علامہ زین الدین قاسم بن قطلوبغار حمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

ان الشارع اعتبر في اثبات الكفر وجود علامة التكذيب فقط

"شریعت نے کفر کے اثبات میں تکذیب کی علامت موجود ہونے کا اعتبار کیا ہے۔"[2]

علامہ خیالی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

ان امارة الامور الخفية كافية في صحة اطلاق اللفظ علي سبيل الحقيقة كالغضبان والفرحان[3]

"پوشیدہ امور کی نشانی کا موجود ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ حقیقی معنی میں لفظ اس کے لئے استعمال کیا جائے جیسے غصہ اور خوشی کے نشانات دیکھ کر کسی کو غصہ آور یا خوش کہنا"۔

---

[1] الاختيار لتعليل المختار ،كتاب السير،فصل فيما يصير به الكافر مسلما،ج٤ ص ١٥٠.

[2] حاشية الامام قاسم علي المسائرة، الخاتمة: في بحث الايمان، ص٢٨١.

[3] خيالي على شرح العقائد،ص١٣٣.

فصل دوم

یہاں تک جو تفصیلات ذکر کی گئی، اس میں تکفیر اور اصول تکفیر کے متعلق مختلف مباحث ذکر ہوئے جن کو عام طور پر حضرات فقہاء کرام اور متکلمین مختصراً ذکر فرماتے ہیں، ان مختلف مباحث کے بعد تکفیر کے منضبط قاعدہ بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ متفرق مباحث عام طور ان جیسے گھمبیر مسائل کا یقینی حل نہیں بنتے، نہ ہی ہر وقت اس کا استحضار ہو سکتا ہے، بلکہ عام طور پر ترتیب اور انضباط ہی سے یہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

تکفیر کے باب میں نہایت جامع اور منضبط ضابطہ

ایمان اور کفر دو متضاد حقائق ہیں، ایمان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے تعلیمات کی یقین اور تصدیق کرنے کو کہا جاتا ہے جس کا تقاضا شریعت کی موافقت اور اس کی اتباع ہے اور کفر نام ہے شریعت کی مخالفت کا، لیکن شریعت میں ہر مخالفت کو کفر قرار نہیں دیا گیا بلکہ اس میں کچھ تفصیل مقرر کی گئی، اسی تفصیل کو یہاں ذکر کرنا مقصود ہے۔[1]

شریعت کے مخالفت کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں:

---

[1] اس ضابطہ کے تیاری میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ ابراہیم بن عامر الرحیلی صاحب کی کتاب "التکفیر وضوابطہ" سے بھی ایک حد تک استفادہ کیا گیا۔

۱۔ شریعت نے ایک کام کرنے کا حکم دیا، اس کو نہ کرنا یعنی شریعت کے اوامر اور مشروعات پر عمل نہ کرنا۔

۲۔ جن چیزوں سے روکا گیا، ان سے نہ رکنا، یعنی نواہی اور ممنوعات کا ارتکاب کرنا۔

ان دونوں اقسام کی تین تین ذیلی قسمیں ہیں۔

چونکہ ایمان وکفر کا تعلق انسان کے تین چیزوں کے ساتھ ہے، اعتقاد، قول اور عمل، اس لئے شریعت کے احکام واوامر پر عمل نہ کرنے کی بھی یہی تین صورتیں ہیں:

الف: شریعت نے جن عقائد کا حکم دیا، اس میں شریعت کا حکم نہ ماننا، قرآن وسنت نے جن عقائد کے رکھنے کا حکم دیا وہ نہ رکھنا۔

ب: شریعت نے جن باتوں کے کہنے کا حکم دیا، اس کو بجا نہ لانا۔

ج: دین اسلام نے جن کاموں کے کرنے کا پابند بنایا، اس کی پابندی نہ کرنا یعنی اس پر عمل نہ کرنا۔

اعتقاد میں شریعت کے مخالفت کی پہلی قسم

جن امور کے اعتقاد کا شریعتِ مطہرہ نے حکم دیا ہے، ان کا اعتقار کھنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی پیغامِ ہدایت لے کر آئے، اس کو حق وسچ سمجھنا اور اس کی تصدیق کرنا شرعاً لازم ہے، ان ہی تعلیمات میں سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، توحید وعظمت، حضور ﷺ کی شخصیت، ان کی تعظیم ومحبت، دین اسلام کی حقانیت، اہمیت وضرورت اور قیامت قائم

ہونے وغیرہ وغیرہ مختلف ضروری اور بنیادی عقائد ہیں جن کو متکلمین حضرات اپنی اپنی کتابوں میں ذکر فرماتے ہیں ، شریعت نے مسلمان کو ان جیسے تمام ثابت شدہ عقائد رکھنے کا مکلف بنایا۔

اگر کوئی شخص اس باب میں شریعت کی مخالفت کرے یعنی جن امور کے اعتقاد کو شریعت نے ضروری قرار دیا، کوئی شخص وہ عقیدہ نہ رکھے، یا کوئی اس عقیدے کا انکار کر بیٹھے تو اس کا حکم یہ ہے کہ جن عقائد کا دینِ اسلام میں سے ہونا تواتر اور پورے قطعیت کے ساتھ ثابت ہو، اس کا انکار کرنا کفر ہے۔

اور جو عقائد اس درجہ یقین کے ساتھ ثابت نہ ہو مثلاً فرشتہ افضل ہے یا عام انسان؟ یا اس جیسے دیگر ظنی مسائل، تو اس کا اعتقاد نہ رکھنا اگرچہ کفر نہیں اور محض اس کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا، تاہم بعض اوقات فاسق قرار پاتا ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

وكذلك نقطع بتكفير كل من كذب وأنكر قاعدة من قواعد الشرع وما عرف يقينا بالنقل المتواتر من فعل الرسول ووقع الإجماع المتصل عليه كمن أنكر وجوب الصلوات الخمس وعدد ركعاتها وسجداتها ويقول إنما أوجب الله علينا في كتابه الصلاة على الجملة وكونها خمسا وعلى هذه الصفات والشروط لا أعلمه إذ لم يرد فيه في القرآن نص جلي والخبر به عن الرسول صلى الله عليه وسلم خبر واحد

"ہم ہر اس شخص کی تکفیر پر جزم کرتے ہیں جو شریعت کے کسی قاعدے کی تکذیب وانکار کرے یا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی ایسے فعل کا انکار کرے جو یقین وتواتر کے ساتھ ثابت ہو اور اس پر اجماع ہو چکا ہو جیسا کہ کوئی پنج وقتہ نمازوں اور ان کی رکعات وسجدات کا انکار کر بیٹھے اور کہے کہ ہم پر تو صرف اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں نماز

فرض کی ہے، اس سے زیادہ باتوں کو (مثلاً پانچ وقت ہونا وغیرہ وغیرہ) میں نہیں جانتا کیونکہ قرآن میں اس کے متعلق کوئی واضح نص موجود نہیں ہے اور حضور ﷺ کی حدیث خبر واحد ہے۔"[1]

امام طبری رحمہ اللہ نے بڑا اچھا نکتہ لکھا کہ اگر کوئی شخص دین کے تمام احکامات کی تصدیق کرے، اس کو دل و جان سے تسلیم بھی کرے لیکن صرف کسی ایک ثابت شدہ کا انکار کرے تو وہ مسلمان نہیں، بلکہ کسی نبی یا آسمانی کتاب پر ایمان لانے کا کا مطلب ہی یہی ہے کہ اس کے تمام مندرجات کی تصدیق کی جائے، اگر ان میں سے کسی ایک حکم کا بھی انکار کرے تو وہ ایمان نہیں بلکہ کفر ہے۔

آپ فرماتے ہیں:

أن المؤمن بالكتب والرسل، هو المصدق بجميع ما في الكتاب الذي يزعم أنه به مصدق، وبما جاء به الرسول الذي يزعم أنه به مؤمن. فأما من صدق ببعض ذلك وكذب ببعض، فهو لنبوة من كذب ببعض ما جاء به جاحد، ومن جحد نبوة نبي فهو به مكذب.

"کتابوں اور رسولوں پر ایمان لانے والا وہ شخص کہلائے گا جو اس کتاب کے تمام مندرجات پر ایمان لائے جس کی وہ خود تصدیق کر رہا ہے اور جس رسول ﷺ کی وہ تصدیق کرتا ہے اس کے لائے ہوئے تمام باتوں پر ایمان لائے، لہٰذا جو شخص ان میں سے کچھ کی تصدیق اور کچھ کی تکذیب کرتا ہے گویا وہ اس نبی کی نبوت کا انکار

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني،فصل في بيان ما هو من المقالات كفر وما يتوقف أو يختلف فيه وما ليس بكفر، ج٢ص٢٨٧.

کرتا ہے جس کی یہ بات ہے اور جو کسی نبی کی نبوت کا انکار کرے وہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔"[1]

اقوال میں شریعت کی مخالفت کی پہلی قسم

جن اقوال کا شریعت کی طرف سے ایک مسلمان کو پابند بنایا گیا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم ان اقوال کی ہے جن پر خود شریعت نے اسلام کا دار مدار رکھا ہے، اور اس کے نہ کہنے کی وجہ سے کسی پر کفر کے احکام جاری ہوتے ہیں، اور دوسری قسم زبان سے ادا کی جانے والے ان اوراد و عبادات کی ہے جس کو شریعت میں پہلی قسم کی طرح ایسا لازم نہیں قرار دیا گیا کہ جس کی بناء پر ایمان و کفر کا فیصلہ کیا جائے۔

شہادتین کی اہمیت

پہلی قسم میں صرف اور صرف شہادتین داخل ہیں یعنی توحید و رسالت کا اقرار، اگر کوئی شخص مطالبہ اور اصرار کے باوجود کسی عذر کے بغیر شہادتین کا تلفظ نہ کرے تو کم از کم دنیا کی حد تک اس پر کفار کے احکام جاری ہوں گے، کیونکہ ایمان و کفر کا اصل تعلق اگرچہ قلب کے ساتھ ہے لیکن شرعی احکام ظاہر پر مبنی ہوتے ہیں جس کا بہتر اور مناسب طریقہ یہی ہے کہ وہ زبانی توحیدِ خداوندی اور رسالتِ محمدی کا اقرار کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اعتراف کرے، اسی لئے بہت سے روایات میں بھی انسان کے معصوم ہونے کا دار مدار اسی تلفظ بالشہادتین پر رکھا گیا، اور شاید اسی اہمیت کی بناء پر امام صاحب

---

[1] جامع البیان ،رقم الایہ: ۱۵۰، ج۹ص ۳۵۳.

رحمہ اللہ نے ایمان کی تعریف میں اقرار باللسان کی قید بھی لگائی جیسا کہ بہت سے حضرات متکلمین نے امام صاحب سے یہ تعریف نقل فرمائی[1]۔

شہادتین کے بغیر زبان سے ادا کی جانے والے تمام عبادات دوسری قسم میں داخل ہیں جس کو چھوڑنے کی وجہ سے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا، مثلاً زبان سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے کا شریعت نے مسلمان کو مکلف بنایا، سلام کے جواب کو قرآن کریم نے ضروری قرار دیا، اذان واقامت وغیرہ مختلف امور کا شریعت اسلام نے حکم دیا، اور ایک مسلمان کو ان احکامات پر عمل کرلینا چاہیے، بلا عذر اس کو چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص اس کو بلا عذر بھی چھوڑ دے تو محض اس کی وجہ سے اس کو کافر کہنا جائز نہیں ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ شریعت میں جن اقوال کا حکم کا دیا گیا ان میں سے صرف ایک شہادتین ہی ہیں جس کو چھوڑنے سے کسی شخص کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے، باقی اقوال پر عمل نہ کرنا موجب کفر نہیں۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ کی تحقیق

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے ایمان کی تعریف پر تحقیقی بحث فرمائی ہے کہ اس میں اقرار باللسان کی قید لگانی چاہیے یا نہیں؟ اس میں متکلمین کے دو موقف بیان فرمائے ہے، اس کے بعد یہی تحریر فرمایا کہ اس بحث سے ہٹ کر، کہ ایمان کی تعریف میں تصدیق کے ساتھ ساتھ زبانی اقرار کی قید لگائی جائے یا نہیں، یہ بات تمام حضرات

---

[1] المسایرة، خاتمة: ص ٢٧٤.

کے نزدیک مسلم ہے کہ جب کبھی زبانی اقرار کا مطالبہ کیا جائے تو زبانی طور پر بھی اقرار کرنا ضروری ہے، ورنہ اگر ضرورت کے وقت مطالبہ کے باوجود بھی اس نے اقرار نہیں کیا اور کوئی عذر بھی موجود نہ ہو، تو اس عناد کی وجہ سے اور دنیا میں اس پر کفار کے احکام جاری ہوں گے۔

چنانچہ آپ لکھتے ہیں:

اتفق القائلون بعدم اعتبار الاقرار علي انه متي طولب به اتي به، فان طولب به فلم يقر فهو كفرعناد، وهذا ما قالوا ان ترك العناد شرط وفسروه به

"جو حضرات اقرار کا اعتبار نہیں کرتے، ان کا بھی اتفاق ہے کہ جب مطالبہ کیا جائے تو اقرار کرنا ضروری ہے، اگر مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہ کرے تو یہ کفر عناد ہے، یہی وہ چیز ہے جو وہ کہتے ہیں کہ (اسلام معتبر ہونے کے لئے) ترک عناد شرط ہے اور انہوں نے عناد کی یہی تفسیر کی ہیں۔"[1]

علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

من اعتقد الإيمان بقلبه ولم ينطق به بلسانه دون تقية فهو كافر عند الله تعالى وعند المسلمين.

"جو کوئی دل سے ایمان کا عقیدہ رکھے اور زبان سے تقیہ کے بغیر بھی تلفظ نہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک کافر ہے (یعنی دنیا و آخرت دونوں میں وہ کافر شمار ہوگا)۔"[2]

---

[1] نفس المصدر، ص:٢٧٩.

[2] المحلى بالآثار، كتاب التوحيدج١ص٦١.

اعمال میں شریعت کے مخالفت کی پہلی قسم

"اعمال" عمل کی جمع ہے اور یہاں عمل سے مراد شریعت کے وہ احکام وعبادات ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب ودماغ اور زبان کے علاوہ دیگر اعضاء وجوارح کے ساتھ ہو، مثلاً زکوۃ اور صوم وغیرہ عبادات۔

کونسے اعمال کفریہ ہیں اور کونسے نہیں؟

اس اعتبار سے اعمال کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک قسم وہ اعمال ہیں جن کے چھوڑنے کے بارے میں اہل سنت والجماعت کے حضرات ائمہ اور علماء کرام کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

۲۔ دوسری قسم ان اعمال کی ہے جس کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ ان کے چھوڑنے سے کوئی کافر نہیں ہوتا۔

پہلی قسم شہادتین کے علاوہ دین اسلام کے باقی چار بنیادی ارکان سے عبارت ہے جن کو حضور ﷺ نے اسلام کی بنیاد اور اس کے ستون کے مانند قرار دیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم " بني الإسلام على خمس:
شهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وإقام الصلاة، وإيتاء

الزكاة، والحج، وصوم رمضان "[1]

اس حدیثِ مبارکہ میں جن پانچ چیزوں پر اسلام کا مدار رکھا کیا گیا ہے، ان میں سے شہادتین کا حکم تو "اقوال" کے تحت گزر چکا۔ اس کے علاوہ باقی چار ارکان کے متعلق اہل سنت والجماعت میں اختلاف ہے، بعض حضرات بلا عذر نماز چھوڑنے والے کو مختلف احادیث کی وجہ سے کافر قرار دیتے ہیں لیکن نماز کے علاوہ دیگر ارکان کے تارک کو کافر نہیں کہتے، اور بعض حضرات کا چند دیگر روایات کی وجہ سے چاروں ارکان کے متعلق یہ موقف ہے کہ بلا عذر اگر کوئی مسلمان ان ارکان پر عمل نہ کرے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

امام زین الدین بن رجب رحمہ اللہ تعالیٰ (۷۹۵ھ) نے اپنی کتاب "جامع العلوم والحکم" میں اس حدیث کی تشریح میں ان تمام اقوال کو کافی بسط و تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا۔[2]

ان چار اعمال وعبادات کے علاوہ دیگر تمام عبادات کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ محض ان کو چھوڑنے کی وجہ سے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الايمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم "بني الإسلام على خمس" رقم الحديث: ٨.

[2] جامع العلوم والحكم، الحديث الثالث: بنى الاسلام على خمس، ج ١ ص ١٤٣ تا ١٥٣.

فقہاءِ احناف اور جمہور حضرات کا موقف

واضح رہے کہ ایمان کے ان چار ارکان کے متعلق اگرچہ بعض متقدمین ائمہ کرام سے یہ موقف منقول ہے کہ ان کا چھوڑنا کفر ہے اور چھوڑنے والا کافر دائرہ اسلام سے خارج ہے، لیکن جمہور امت اور فقہاء احناف کے نزدیک ان ارکان کا صرف چھوڑنا کفر ہے نہ چھوڑنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے، کیونکہ کفر ایمان کی ضد ہے، جس طرح ایمان تصدیق کا نام ہے اسی طرح کفر انکار و تکذیب کا نام ہے، اور نماز نہ پڑھنا، زکوۃ نہ دینا وغیرہ انکار کو مستلزم نہیں، بلکہ بعض اوقات دل میں مکمل تصدیق ویقین کے بغیر بھی ایسی کوتاہی ہو ہی جاتی ہے اس لئے جمہور حضرات کے نزدیک اس کو کفر کہنا درست نہیں۔

علامہ زین الدین عراقی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ذهب جمهور أهل العلم إلى أنه لا يكفر بترك الصلاة إذا كان غير جاحد لوجوبها، وهو قول بقية الأئمة أبي حنيفة ومالك والشافعي، وهي رواية عن أحمد بن حنبل أيضا.

"جمہور اہل علم کا مذہب یہ ہے کہ جب تک کوئی نماز کے واجب ہونے کا انکار نہ کرے تو صرف چھوڑنے کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوگا یہی قول باقی ائمہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کی بھی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔"[1]

یہاں تک شریعت کے مخالفت کی پہلی قسم کا حکم ذکر کیا گیا یعنی شریعت کے

---

[1] طرح التثريب في شرح التقريب، كتاب الصلاة، ج٢ص١٤٧.

اوامر پر عمل نہ کرنا، اس کے بعد شریعت کے دوسری قسم کی مخالفت کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے۔

مخالفت کی دوسری قسم

شریعت کے مخالفت کی دوسری بنیادی قسم یہ تھی کہ نواہی کا ارتکاب کیا جائے یعنی شریعت نے جن امور سے بچنے کی تلقین کی ہو کوئی شخص اسی کا ارتکاب کرے۔

پہلی قسم کی طرح اس کی بھی تین ذیلی قسمیں بنتی ہیں:

اعتقاد: یعنی جن عقائد سے بچنے کی ہدایت کی، اسی کو اختیار کرنا۔

اقوال: جن باتوں کے کہنے سے منع فرمایا گیا، انہی کا تلفظ کرنا۔

اعمال: جن کاموں کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا، ان کو کرنا۔

ذیل میں ہر ایک قسم کی تفصیل ذکر کر دی جاتی ہے۔

اعتقاد میں شریعت کے مخالفت کی دوسری قسم

شریعت نے جن اعتقادات سے بچنے کا حکم فرمایا، ان سے بچے رہنا ضروری ہے، رہاں یہ سوال کہ کیا اس طرح عقیدہ رکھنے سے کوئی شخص کافر بھی ہو جائے گا یا نہیں؟

تو اس کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ شریعت میں بعض بنیادی عقائد کو ضروری قرار دیا گیا، مثلاً اللہ تعالیٰ کے ذات وصفات پر ایمان لانا، اس کی ہر قسم وحدانیت کا عقیدہ، تمام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت ورسالت کا اعتراف، ان کی تعظیم و محبت، کلام الٰہی کی تصدیق اور قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا عقیدہ، موجودہ تمام ادیان

میں صرف اسلام کی حقانیت کا اعتقاد، قیامت قائم ہونے اور جزاو سزا، جنت و جہنم پر یقین رکھنا وغیرہ وغیرہ۔

اگر کوئی شخص اپنی طرف سے کوئی ایسا عقیدہ تراشے جو دین حق کے ان جیسے قطعی اور یقینی عقائد کی سراسر ضد ہو تو وہ یقیناً کفر ہے اور اس طرح عقیدہ رکھنے سے انسان دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، یہی حکم "ضروریات دین" کا بھی ہے جس کی پوری تفصیل اسی باب کے فصل اول میں گزر چکی ہے، اگر کوئی شخص ایسا عقیدہ رکھے جو ان ضروریات دین کی ضد یا نقیض ہو تو یہ بھی کفر ہے اور اس کی وجہ سے بھی انسان دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔

نیز باب اول میں ایمان کے کچھ شرائط ولوازم ذکر کئے گئے ہیں، اگر کوئی شخص ان کے سراسر خلاف کوئی عقیدہ رکھے تو یہ بھی کفر ہے۔

اقوال واعمال میں مخالفت کی دوسری قسم

جن باتوں سے شریعت نے روکا اس سے بچتے رہنا ضروری ہے، اسی طرح جن کاموں کے کرنے سے شریعت نے منع فرمایا، ان سے بچے رہنا لازم ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کی مخالفت کرے یعنی ان ممنوعہ باتوں کا تلفظ کرے یا ان ناجائز کاموں کا ارتکاب کرے جس سے شریعت میں منع فرمایا گیا تھا، تو کیا اس کی وجہ سے وہ شخص کافر ہو جائے گا یا نہیں؟ اس پر کفر کے احکام جاری ہوں گے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب کو پوری طرح سمجھنے سے پہلے ایمان کے شرائط وارکان کو ایک بار پھر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جو باب اول میں تحریر کئے گئے تھے، کیونکہ

اس جواب کو کماحقہ سمجھنا ان شرائط کے استحضار پر موقوف ہے، اس لئے یہاں اولاً ان شرائط کو اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے اس کے بعد اصل سوال کا جواب دیا جائے گا۔

ایمان کے چار بنیادی لوازم

کتاب کے شروع میں ایمان کے پانچ شرائط ذکر کئے گئے تھے، ان میں سے پہلی شرط اقرار باللسان تھی، یہاں اس کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ دنیوی احکام جاری ہونے کی شرط تھی اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اصرار کے باوجود اقرار نہ کرنا بھی دراصل باقی لوازم کے ضمن میں داخل ہو جاتا ہے، باقی کل چار لوازم رہ جاتے ہیں:

۱۔ رضاو محبت: دین اور تمام ضروریات دین پر راضی رہنا اور اس کے ساتھ محبت کرنا

۲۔ تعظیم واحترام: دین اور تمام ضروریات دین کی تعظیم کرنا، ان کو قابل عظمت واحترام سمجھنا

۳۔ تسلیم وانقیاد: دین اور اس کے سارے قطعی احکام کی فرمان برداری کرنا

۴۔ مخالف ادیان ومذاہب سے بیزار ہونا:

یہ چاروں امور ایمان کے ضروری لوازم ہیں، ان میں سے اگر کوئی ایک بھی فوت ہو جائے تو ایمان کالعدم شمار ہوگا اور اس طرح کرنے سے انسان مسلمان باقی نہیں رہے گا، کتاب کے شروع میں اس کی تفصیل گزر چکی کہ ان امور کو ایمان کا لازمہ کیوں قرار دیا گیا؟ وہاں حضرات متکلمین اور فقہاء کرام کی عبارات سے بھی اس لزوم کو واضح کیا گیا تھا اور عقلاً بھی اس کی وجہ لزوم بیان کی گئی تھی۔

ان امور کے لوازم ایمان ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کہیں یہ فوت ہو جائیں یا ان میں سے کسی ایک کی ضد یا نقیض پائی جائے [1] تو ایمان جاتا رہے گا اور ایسے شخص کی

ضد اور نقیض کے درمیان فرق

[1] ضد اور نقیض دو مختلف الفاظ ہیں، دونوں اگرچہ عام طور پر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں مگر اصل معنٰی کے لحاظ سے دونوں کے درمیان فرق ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ ضد اور نقیض دونوں الفاظ کا اطلاق کسی چیز کے منافی پر ہوتا ہے مگر دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ضدین میں سے ہر ایک وجودی ہوتا ہے جبکہ نقیضین کے درمیان عدم اور وجود کا تقابل ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نقیضین ایک جگہ جمع ہو سکتے ہیں نہ ہی بیک وقت ان دونوں کا ارتفاع ممکن ہے جبکہ ضدین کا اجتماع اگرچہ محال ہے لیکن ارتفاع بالکل ممکن بلکہ واقع ہے۔

مثلاً حرکت ایک لفظ ہے، اس کا معنی ہے گردش کرنا۔ اس کی نقیض سکون یعنی گردش نہ کرنا ہے، اب دنیا جہاں کے تمام اشیاء یا حرکت میں ہوں گے یا سکون ان کو لاحق ہوگا، کوئی بھی چیز ان دو حالتوں سے خارج نہیں ہے، نہ ہی یہ دونوں عوارض ایک ہی چیز کو ایک ہی وقت میں ایک ہی حیثیت سے عارض ہو سکتے ہیں کیونکہ نقیضین کا اجتماع وارتفاع دونوں ممکن نہیں ہے۔

اور ضدین کی مثال جیسا کہ سواد اور بیاض، یعنی سفیدی اور کالا پن، کہ ایک چیز ایک وقت میں ان دونوں اوصاف کی حامل نہیں ہو سکتی لیکن ممکن ہے کہ کوئی چیز نہ کالی ہو نہ سفید بلکہ زرد یا سبز ہو۔

علامہ عسکری لکھتے ہیں:

تکفیر کی جائے گی، مثلاً محبت کی ضد بغض ہے اور اس کی نقیض عدم محبت ہے اب اگر کوئی شخص اسلام کا دعوی کرتا ہے لیکن دین اسلام یا اس کے کسی قطعی حکم کے ساتھ بغض رکھے یا اس کے ساتھ بالکل محبت نہ کرے تو ایسے شخص کو کافر قرار دیا جائے گا۔

تعظیم واحترام ایمان کا لازمہ ہے، تعظیم کی ضد توہین ہے اور اس کی نقیض عدم تعظیم، اب اگر کوئی شخص دین اسلام یا اس کے کسی قطعی حکم کی توہین وگستاخی کرے یا اس کی عدم تعظیم کرے تو بھی اس کو کافر ہی قرار دیا جائے گا۔

تسلیم وانقیاد بھی ایمان کے لوازم میں سے ہے، تسلیم کی ضد رد اور تردید ہے انقیاد کی ضد انحراف، اور نقیض عدم تسلیم اور عدم انقیاد ہے، اگر کوئی شخص دین کے کسی قطعی حکم کو یہ جانتے ہوئے کہ یہ شریعت کا قطعی اور ثابت شدہ حکم ہے، تردید کرے یا اس کو تسلیم نہ کرے تو ایسا شخص مسلمان باقی نہیں رہے گا۔

یہی حال چوتھے لازمہ یعنی مخالف ادیان ومذاہب سے بیزار ہونے کا بھی ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے اپنے ایمان واسلام کا دعویٰ کرے لیکن وہ اسلام کے ماسوا دیگر ادیان مثلاً یہودیت، نصرانیت اور قادیانیت وغیرہ سے بری نہ ہو، یا زبان سے تو

الفرق بين الضد والنقيض:

قيل: النقيضان: ما كان التقابل بينهما تقابل النفي والاثبات أو العدم، والملكة، ولذا لا يمكن اجتماعهما في مادة، ولا ارتفاعهما كالحركة والسكون. وأما المتضادان: فيجوز ارتفاعهما ويمتنع اجتماعهما كالسواد والبياض.(معجم الفروق اللغوية، "ض"ص: ٣٢٦).

دعوی کرے مسلمان ہونے کا، لیکن اسلام کے ساتھ ساتھ موجودہ دور میں ان ادیان کے حقانیت کا بھی قائل ہو اور ان کو قابل اتباع سمجھتا ہو تو وہ مسلمان نہیں ہوگا۔

اس قسم کی مخالفت کا شرعی حکم

لوازم ایمان کی اس مختصر سی تفصیل کے بعد اب اصل مسئلہ کا حکم ذکر کیا جاتا ہے، اصل سوال یہ ہے کہ جن اعمال اور اقوال سے شریعت میں منع فرمایا گیا، اگر کوئی شخص اسی کا ارتکاب کرے تو کیا وہ مسلمان باقی رہے گا یا اس کا اسلام جاتا رہے گا؟

تو اس کا حکم یہ ہے کہ شریعت کے ممنوعات سے منع ہونا ضروری ہے ان کا ارتکاب کرنا معصیتِ خداوندی ہے جو اگرچہ گناہ اور جرم ہے لیکن یہ جرم اس درجے کا بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے کفر جیسے انتہائی اور سب سے بڑی سزا جاری ہو، ایسا کرنا زیادہ سے زیادہ گناہ کبیرہ ہو جائے گا اور اہل سنت والجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ محض گناہِ کبیرہ کے ارتکاب کرنے کوئی شخص دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا۔

گناہ کبیرہ کے متعلق اہل سنت والجماعت کا موقف

قرآن وسنت کے بیسوں نصوص سے یہی معلوم ہوتا ہے، اہل سنت والجماعت کے متکلمین نے مختلف انداز سے ایسے متعدد نصوص ذکر فرمائے ہیں جن سے مختلف طرقِ استدلال کے ساتھ یہی ثابت ہوتا ہے کہ محض گناہ کبیرہ کا ارتکاب موجب کفر نہیں اور صرف اس کی وجہ سے کسی کو کافر قرار دینا یا اس کو غیر مسلم قرار دینا بالکل جائز نہیں۔

امام طحاوی رحمہ اللہ تعالیٰ اہل سنت والجماعت کا یہی متفقہ موقف ذکر کرتے ہوئے

فرماتے ہیں:

لا نکفر أحدا من أهل القبلة بذنب ما لم يستحله

"ہم گناہ کی وجہ سے اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہیں کرتے جب تک وہ اس گناہ کو حلال نہ سمجھے۔"[1]

خود امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی یہی ذکر فرمایا، چنانچہ حضرت ابو مطیع البلخی رحمہ اللہ تعالیٰ کی روایت سے آپ کی جو "فقہ ابسط" ہم تک پہنچی، اس میں پہلا سوال ہی یہی تھا، اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا:

الا تكفر احدا من اهل القبلة بذنب ولا تنفي احدا من الإيمان

"آپ اہل قبلہ میں کسی کی تکفیر نہ کرے اور کسی سے ایمان نفی نہ کرے۔"[2]

اس قاعدے کے متعلق اگرچہ بہت کلام کیا گیا اور بعض جدت پسند حضرات اس کو بنیاد بنا کر تکفیر کے باب میں انتہائی تسامح بالکل تساہل پر زور دیتے ہیں جو شریعت کے مزاج، علم کلام کے اصول، امت کے اجماعی توارث اور خود اسی قاعدے کے اصل پس منظر کے بالکل خلاف ہے لیکن کم از کم اس حد تک اس ضابطہ پر اتفاق ہے کہ کسی مسلمان کو محض گناہ کبیرہ کی وجہ سے کافر قرار دینا جائز نہیں۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

من ارتكب كبيرة لكسل او حمية او ابقة او غلبة شهوة او رجاء عفو كان التصديق معه باقيا، ومادام التصديق موجودا كان

---

[1] العقيدة الطحاوية ،ص٦٠.

[2] الفقه الأبسط بتحقيق العلامة الكوثري ضمن كتابه" العقيدة وعلم الكلام"، ص٥٩٩.

التكـذيب معـدوما ضـرورة لمضـادة بينهمـا فبطـل القـول بكفـره والتكذيب معدوم او بزوال الايمان والتصديق موجود او ثبوت النفاق والتصديق في القلب باق.

"جو شخص سستی، غیرت وحمیت، غلبہ شہوت یا معافی کی امید پر کبیرہ کا ارتکاب کرے تو تصدیق اس کے ساتھ موجود ہوتی ہے اور جب تک تصدیق موجود ہے تو تکذیب معدوم ہے کیونکہ دونوں میں تضاد (بمعنی تناقض ہے اور اجتماع نقیضین محال ہے) لہٰذا اس کو کافر کہنا غلط ہے اسی طرح جب تصدیق برقرار ہے تو اس کے ایمان ختم ہونے یا اس کے منافق ہونے کی بات بھی باطل ہے [1]

مزید تفصیل کے لئے امام محمد ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالیٰ (المتوفی ۳۳۳ھ) کی "کتاب التوحید" ملاحظہ فرمانا مفید ہے، جس میں آپ نے بڑی تفصیل اور تدقیق کے ساتھ اس بات کو ثابت فرمایا ہے اور اپنے معمول کے مطابق معتزلہ وغیرہ کے استدلالات معقولانہ انداز میں جوابات دئے ہے [2]۔

البتہ جن اقوال واعمال سے مندرجہ بالا لوازم ایمان میں سے کسی لازم کی نقیض یا اس کی ضد یقینی طور پر لازم آرہی ہو تو ایسا قول و عمل البتہ موجبِ کفر شمار ہوگا اور اس کی وجہ سے وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا، لیکن ظاہر ہے کہ اس تکفیر کی اصل وجہ صرف اس ناجائز کام کا ارتکاب نہیں ہے بلکہ لازمِ ایمان کا فوت ہونا اس کی اصل وجہ اور بنیادی سبب ہے۔

---

[1] الاعتماد في الاعتقاد، ص:٤٠٦

[2] كتاب التوحيد مسألة:اختلاف المسلمين في مرتكبي الكبائر، من صفحة ٣٢٩تا٣٦٥.

ذیل میں مندرجہ بالا ایمان کے چاروں لوازم کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہے جن کی بنیاد پر فقہاء کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے کہنے والے کو کافر قرار دیا۔

رضا ومحبت فوت ہونے کے بنیاد پر تکفیر کی مثال

کفر پر خوش ہونا، اس کی نشر واشاعت پر راضی ہونااور خوشی خوشی اس کی تبلیغ تلقین کرنا، ان تینوں امور کو حضرات فقہاءِ کرام موجبِ کفر قرار دیتے ہیں، اوراس میں یہ تفصیل ذکر کرتے ہیں کہ کسی شخص کا خود اپنے کافر ہونے پر خوش ہونا یااپنے کفر کو اچھا سمجھنا باالاتفاق کفر ہے، اور دوسرے شخص کے کافر ہونے پر راضی ہونے کی وجہ سے کوئی مطلقاً کافر نہیں ہوتا لیکن اگر یہ رضامندی خود کفر ہی کو اچھا سمجھنے کی وجہ سے ہو تو اس کے کافر ہونے میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔[1]

شرح العقائد وغیرہ کتب میں بھی یہی ذکر کیا گیااور حضرات فقہاء کرام بھی کلمات الکفر میں اس کو بڑے اہتمام سے ذکر فرماتے ہیں بلکہ اس قاعدہ کی بناء پر متعدد مسائل متفرع فرماتے ہیں۔

رضا بالکفر کیوں کفر ہے؟

اگر غور کیا جائے تو یہ قاعدہ مندرجہ بالا ضابطہ میں داخل ہو جاتا ہے کیونکہ ایمان اور کفر آپس میں دو متقابل اور متضاد اشیاء ہیں، جن کا ایک ہی جگہ ایک ہی وقت میں جمع ہونا ممکن نہیں، لہذا اگر کوئی شخص کفر پر راضی ہوتا ہے تو وہ یقیناً ایمان کے ایک "لازم"

---

[1] درر الحكام شرح غرر الأحكام، كتاب الكراهية والاستحسان، ج۱ص۳۲٤.

کو ضائع کر رہا ہے کیونکہ ایمان کے لوازم میں سے ایک لازم یہ بھی ہے کہ دین اسلام اور اس کے احکامات کے ساتھ رضا و محبت رکھی جائے، کفر کے ساتھ محبت کا علاقہ استوار نہ کیا جائے بلکہ وہ تو انتہائی قابل نفرت چیز ہے، لہذا کفر پر راضی ہونے میں چونکہ یہ لازم ایمان فوت ہو رہا ہے اس لئے اس کے کفر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی کافر ہونے پر راضی ہو تو وہ کافر ہے، البتہ اگر کوئی شخص خود اپنے کفر پر خوش نہ ہو بلکہ دوسرے آدمی کے کافر ہونے کو پسند کرے، یا اس کے لئے کفر پر مرنے کی بددعاء کرے، تو کیا یہ بھی کفر ہے؟ اور اس کی وجہ سے بھی ایسا شخص کافر تصور ہو گا یا نہیں؟

تو اس کے متعلق تفصیل یہ ہے کہ اگر تکفیر کے متعلق سابقہ تمام ابحاث پر ایک نظر دوڑائی جائے تو مطلقاً ایسے شخص کی تکفیر درست معلوم نہیں ہوتی بلکہ اس میں تفصیل کرنے کی ضرورت ہے، کفر پر رضامندی اور اس کو مرغوب سمجھنا یقیناً کفر ہے لیکن اپنے کفر پر خوش ہونے اور دوسرے کے کفر پر راضی ہونے میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے، وہ یہ کہ چونکہ ایمان و کفر (کم از کم) انسان کی حد تک ضدین ہیں جن میں سے کسی کو ایک پسند کرنا دوسرے کے ناپسند کرنے کو مستلزم ہے (نیز خود کفر کو پسند کرنا بھی کفر ہی ہے) گویا ایک ضد کے وجود سے دوسرے کا انتفاء یقینی طور پر لازم آ رہا ہے۔

اس کے مقابلے میں اگر دوسرے مسئلے پر غور کیا جائے یعنی دوسرے شخص کے کفر پر خوش ہونا، تو وہ اس حد تک متقابل نہیں بلکہ اس میں اور واسطے اور مزید احتمالات بھی موجود ہیں، مثلاً کوئی شخص اپنے کسی دشمن کے بارے میں یہ پسند کرے کہ وہ کافر ہے رہے، کفر پر ہی اس کا موت واقع ہو تو دشمن کے کفر پر اس طرح راضی ہونے اس کو

کافر نہیں کہا جائے گا کیونکہ اس میں جس طرح یہ احتمال موجود ہے کہ اس چاہنے والے کو کفر سے محبت ہے اسی لئے وہ دوسروں کے لئے اس کو پسند کرتا ہے، اسی طرح یہ احتمال بھی موجود ہے کہ وہ کفر کو ایک انتہائی سخت عذاب کا موجب جرم سمجھتا ہے اور دشمن کے بارے میں وہ چاہتا ہے کہ اسی عذاب سے اس کا سامنا ہو، اس لئے اس نے مذکورہ جملہ کہا۔

تکفیر کے متعلق اصول کے سلسلہ میں اسی کتاب کے باب دوم میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جاچکا ہے کہ جس بات میں کفر کے ساتھ ایمان کے موجود ہونے کا بھی احتمال ہو گو وہ کمزور ہی کیوں نہ ہو تو اس بات کی وجہ سے کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، اس لئے اس صورت میں بھی محض کسی دوسرے شخص کے کفر کی تمنا کرنے اور اس کو اچھا سمجھنے کی وجہ سے اس کو کافر کہنا احتیاط کے خلاف ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو اس چاہت میں دوسرا احتمال ہی راجح معلوم ہوتا ہے کیونکہ دشمن کے لئے عام طور پر اچھے چیز کی تمنا نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے حق میں اسی چیز کی کوشش کی جاتی ہے جو نقصان دہ اور تکلیف کا باعث ہو تا کہ چاہنے والے کے دلی حسد و بغض کی آگ ٹھنڈی ہو، اس لئے اس مضبوط احتمال کے باوجود اس کو کافر کہنا درست نہیں۔

تاہم اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی شخص اسی صورت میں کفر ہی اچھا سمجھنے کی صراحت کرے تو اس صورت میں چونکہ یہ احتمال باقی نہیں رہتا ہے اس لئے اس کو کافر قرار دیا جائے گا۔

امام سرخسی رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی یہی نکتہ ذکر فرمایا، آپ فرماتے ہیں:

فإن قيل: إذا كعموه حتى لا يسلم ينبغي أن يكون ذلك كفرا منهم؛ لأنهم رضوا بكفره، ومن رضي بكفر غيره يكفر. قلنا: لفعلهم ذلك تأويلان: أحدهما أنهم علموا أنه لا يسلم حقيقة، ولكن يظهر الإسلام تقية لينجو من القتل. فلا يكون ذلك رضا منهم بكفره. والثاني أن مقصودهم من ذلك الانتقام منه والتشديد عليه، لكثرة ما آذاهم لا على وجه الرضى بكفره. ومن تأمل قوله تعالى {ربنا اطمس على أموالهم واشدد على قلوبهم فلا يؤمنوا حتى يروا العذاب الأليم} يتضح له هذا المعنى.

اگر کہاجائے کہ جب انہوں نے فرعون کا منہ بند کر دیا تاکہ وہ اسلام نہ لائے تو مناسب یہ ہے کہ یہ منہ بند کرنے کو کفر کہاجائے کیونکہ اس فعل سے وہ فرعون کے کفر پر راضی ہوئے اور جو کوئی دوسرے کے کفر پر راضی ہو جائے وہ کافر ہے۔ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ ان کے اس فعل کی دو توجیہات ہیں:

۱: ان کو معلوم ہوا تھا کہ یہ در حقیقت اسلام نہیں لائے گا لیکن قتل سے بچنے کی خاطر تقیہ کے طور پر اسلام کا اظہار کرے گا۔ ۲: دوسری بات یہ ہے کہ اس اقدام سے ان کا مقصود اس سے انتقام لینا اور اس پر سختی کرنا تھا کیونکہ اس نے ان کو بہت ستایا تھا، کفر پر راضی ہونے کے لئے ایسا نہیں کیا (بلکہ جذبہ انتقام کے تحت ایسا ہوا)، جو کوئی مندرجہ بالا آیت میں اچھی طرح غور کرے گا اس پر یہ بات واضح ہو جائے گی۔"[1]

---

[1] شرح السير الكبير، باب ما يتكلم به الرجل فيكون أمانا أو لا يكون، ص: ٥٠٤.

دوسروں کے کافر ہونے پر خوش ہونے کو جامع الفصولین وغیرہ بعض کتب میں اگرچہ اس تفصیل کے بغیر بھی مطلقاً کفر کہا گیا لیکن فتاویٰ ہندیہ میں اسی تفصیل کو مفتی بہ قرار دیا گیا:

ومن يرضى بكفر نفسه فقد كفر، ومن يرضى بكفر غيره فقد اختلف فيه المشايخ رحمهم الله تعالى في كتاب التخيير في كلمات الكفر إن رضي بكفر غيره ليعذب على الخلود لا يكفر، وإن رضي بكفره ليقول في الله ما لا يليق بصفاته يكفر، وعليه الفتوى كذا في التتارخانية.

"جو شخص اپنے کفر پر راضی ہوگا وہ کافر ہو جائے گا اور جو دوسرے کے کفر پر راضی ہوتا ہے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ ۔اگر کوئی دوسرے کے کفر پر اس لئے خوش ہوتا ہے تاکہ اس کو ہمیشہ کے لئے عذاب ملتا رہے تو وہ کافر نہیں ہوگا اور اگر خوشی اس لئے ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی شان میں نازیبا کلمات کہے تو وہ کافر ہے، اسی قول پر فتویٰ ہے۔"[1]

کفر کی تعلیم، تبلیغ اور اس کا مشورہ دینا بھی کفر ہے

امام ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ تعالیٰ نے "رضا بالکفر" کے اس مسئلہ کو کافی تنقیح اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے ور یہ بھی فرمایا ہے کہ رضا بالکفر کی طرح کسی کو کافر ہو جانے کا مشورہ دینا، کفر کی تعلیم دینا اور اس کے تبلیغ و تلقین کرنا بھی کفر ہے، اگر کوئی شخص کفر

[1] الفتاوى الهندية، الباب التاسع فى احكام المرتدين، مطلب في موجبات الكفر أنواع منها ما يتعلق بالإيمان والإسلام، ج٢ص ٢٥٧.

کی نشر واشاعت کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

بخلاف ما لو قال لمسلم: سلبه الله الإيمان، أو لكافر: لا رزقه الله الإيمان، فإنه لا يكون كفراً على الأصح، لأنه ليس رضاً بالكفر, وإنما هو دعاء عليه بتشديد الأمر والعقوبة عليه. هذا ما ذكره الشيخان, وأنت خبير من قولهما: لأنه ليس رضاً بالكفر إلى آخره أن محل ذلك ما إذا لم يذكر ذلك رضاً بالكفر وإلا كفر قطعاً, والذي يظهر من فحوى كلامهما أنه لو أطلق، ولم يقله على جهة الرضا بالكفر، ولا على جهة تشديد العقوبة عليه لا يكون كافراً وهو ظاهر. ولو رضي كافر بالإسلام أو أكره كافراً آخر عليه أو عزم عليه في المستقبل لم يكن بذلك مسلماً.

"اگر کوئی مسلمان دوسرے مسلمان سے ایمان سلب ہونے یا کافر کو ایمان نصیب نہ ہونے کی بددعاء کرے تو صحیح قول کے مطابق یہ کفر نہیں ہے کیونکہ یہ کفر پر رضامندی نہیں ہے بلکہ مخاطب پر سختی اور سزا ملنے کی بددعاء ہے۔۔اگر کوئی کافر اسلام پر راضی ہوا یا دوسرے کافر کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا یا مستقبل میں اسلام لانے کا عزم کیا تو اس کی وجہ سے وہ ابھی مسلمان نہیں ہوگا۔"[1]

تبلیغ و تعلیم کے کفر ہونے اور بددعاء کے کفر نہ ہونے کے درمیان بنیادی فرق

علامہ ہیتمی رحمہ اللہ تعالیٰ کی اس تفصیل سے واضح ہوا کہ کفر کی تعلیم و تلقین کرنا اور عملی طور پر اس کی نشر واشاعت کرنا کفر ہے، لیکن دوسری طرف حضرات

---

[1] نفس المصدر.

فقہاء کرام رحمہ اللہ تعالیٰ نے کلمات الکفر کے ضمن میں یہ بھی تحریر فرمایا ہیں کہ کسی مسلمان کے لئے کفر پر مرنے کی بددعا کرنا اگرچہ ناجائز اور حرام ہے لیکن محض اس کی وجہ سے بددعا کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہو گا۔

بعض اوقات ان دونوں جزئیات کو ایک دوسرے کے خلاف تصور کیا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں ہی مسائل اپنی جگہ درست ہیں، آپس میں کوئی تعارض نہیں ہے۔

دوسرے شخص کے کافر ہونے کی تمنا کرنا بذات خود کفر نہیں جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے کہ اس میں کفر پر رضامندی یقینی نہیں بلکہ اس میں کفر کے علاوہ اور احتمال بھی موجود بلکہ غالب ہے جس کی تفصیل ابھی ذکر ہوئی، اس لئے اس بناء پر جب تک خود متکلم اسی کفریہ احتمال مراد لینے کی تصریح نہ کرے تب تک اس کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

لیکن کفر کی تبلیغ کرنا اور لوگوں کو کافر ہو جانے کا مشورہ دیدینے کا مسئلہ اس سے مختلف ہے کیونکہ یہ ایمان کے سابقہ چار (۴) لوازم کے خلاف ہے، کیونکہ کفر کی تبلیغ اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ دل میں اس کے ساتھ رضاو محبت بھی موجود ہے، اور اسلام کے متوازی ادیان و مذاہب کی تبلیغ خود اسلام کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے جو کہ اسلام کے تعظیم و احترام کے بھی خلاف ہے، اسی طرح نمبر چار میں ایمان کا یہ بھی ایک لازم ذکر ہوا کہ مخالف ادیان سے تبری بھی ہو اگر کوئی شخص ہندو ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام قبول کرنا چاہے اس طور پر کہ ہندومت بھی نہ چھوڑنا پڑے اور اسلام میں بھی داخل ہو جائے، تو ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ایمان و اسلام کے معتبر ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دیگر ادیان سے بری ہو جبکہ اس کی تعلیم و تبلیغ کرنا اور لوگوں کو اس کے اختیار کرنے

کے مشورہ دینا اس کے سراسر خلاف ہے اس لئے اس کو کفر قرار دیا گیا۔

علامہ ابنِ حجر ہیتمی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ومن المكفرات أيضاً أن يرضى بالكفر ولو ضمناً كأن يسأله كافر يريد الإسلام أن يلقنه كلمة الإسلام فلا يفعل, أو يقول له: اصبر حتى أفرغ من شغلي أو خطبتي لو كان خطيباً, أو كأن يشير عليه بأن لا يسلم وإن لم يكن طالباً للإسلام فيما يظهر, وكلام الحليمي الآتي قريباً قد يدل على أن إشارته عليه بأن لا يسلم إذا كانت لكونه عدوه فيشير عليه بما يكرهه، وهو الكفر، ويمنعه عما يحبه وهو الإسلام لم يكفر، وفيه نظر, والذي يظهر أنه يكفر بذلك، وإن قصد ما ذكر بأنه كان متسبباً في بقائه على الكفر، وليست هذه كمسألة الحليمي الآتية خلافاً لما توهمه؛ لأن تلك فيها مجرد تمنٍ فقط. وهذه فيها تسبب إلى البقاء على الكفر أو يشير على مسلم بأن يرتد.[1]

"موجب کفر میں سے ایک کفر پر راضی ہونا بھی ہے اگرچہ ضمناً ہی ہو، جیسے کوئی کافر اسلام قبول کرنے کے ارادے کلمہ اسلام کی تلقین کرانے کی فرمائش کرے تو یہ تلقین نہ کرے یا اس کو کہے کہ انتظار کرو تا کہ میں اپنی مصروفیت یا اگر خطیب ہو تو اپنے خطبہ سے فارغ ہو جاؤں، یا اس کو اسلام قبول نہ کرنے کا مشورہ دے۔۔ علامہ حلیمی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسلام کا اراد کرنے والا اس کا دشمن ہو اور یہ اس کو اسلام قبول نہ کرنے کا مشورہ دے کیونکہ خود اس کے نزدیک کفر بری چیز ہے اور اسلام محبوب، تو دشمن کو محبوب سے روکنے کے لئے ایسا مشورہ دے، تو اس سے وہ کافر نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے

---

[1] الإعلام بقواطع الإسلام ،ص ١٣٣.

بھی وہ کافر ہو جائے کیونکہ اس صورت میں بھی اس کے کفر پر برقرار رہنے میں یہ سبب بن گیا۔۔۔"

تعظیم واحترام فوت ہونے کی وجہ سے تکفیر کی مثال

ایمان کے معتبر ہونے کے لئے دوسرا لازم "تعظیم و محبت" ہے، حضرات فقہاء کرام نے اس کے فوت ہونے کی بناءپر بھی تکفیر فرمائی ہیں، کلمات الکفر کے بہت سے جزئیات کا مدار اسی پر ہے کہ ایمان واسلام اوراس کے تمام ضروریات اور یقینی و قطعی احکام کی تعظیم ضروری ہے اوراس کے ساتھ محبت رکھنالازم ہے، اگر یہ دونوں لازم پورے نہ ہوں تو اس ایمان کااعتبار نہیں ہے۔

چنانچہ حضرات فقہاءِ کرام نے لکھاہے کہ جو شخص پوری شریعت کی یااس کے ضروری مسائل کی توہین کرے یاکسی عبادت کی استہزا کرے تووہ کافر ہو جائے گا مثلاً کوئی مسلمان تیمم کررہاہےاور دوسرااس کے اس عمل کو دیکھ کر مذاق اڑاتاہےاور مذاق اڑانے کی بنیاد یہی تیمم کا عمل ہو، کرنے والے کا کوئی اور ذاتی طرز عمل وغیرہ نہ ہو تو بھی وہ کافر ہو جائے گا۔[1]

اسی طرح اگر کوئی شخص کسی عبادت گزار کو مذاق کے طور پر کہے کہ اتنی عبادت نہ کرو کہ جنت پار کر باہر نکلو، اس کو بھی حضرات فقہاء کرام نے موجبِ کفر قرار دیا ہے۔[1]

---

[1] شرح الامام علی القاری علی کتاب الفاظ الکفر للعلام بدر الرشید، ص۱۶۳.

حکم شرعی کا مذاق کفر ہے

اور مذاق کے کفر ہونے کے لئے یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ وہ حکم ضروریات دین میں سے ہو، یا کوئی فرض واجب مسئلہ ہو تو اس کا مذاق ہی کفر ہوگا، بلکہ شریعت کا جو حکم جس درجے کا بھی ہو لیکن اگر کسی شخص کو اس کا حکم شرعی ہونا معلوم ہے اور اسی نسبت کی وجہ سے وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے تو دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔

جامع الفصولین میں لکھا ہے:

حكي أن في زمن المأمون سئل فقيه عمن قتل حايكاً فقال كفارت بت واجب شود فأمر المأمون بضرب الفقيه حتى مات وهذا للاستهزاء بحكم الشرع وهو كفر.

منقول ہے کہ مامون کے زمانے میں ایک فقیہ سے درزی کے قتل کرنے والے کے متعلق سوال کیا گیا تو اس نے جواب میں کہا کہ ۔۔۔ تو مامون نے اس فقیہ کے گردن مارنے کا حکم جاری کیا یہاں تک کہ وہ مر گیا، یہ شریعت کے حکم پر استہزاء کرنے کی وجہ سے تھا جو کہ کفر ہے۔"[2]

ملا علی قاری رحمہ اللہ تعالیٰ اسی واقعہ کے ذیل میں نقل کرتے ہیں:

الاستهزاء بحكم من احكام الشرع كفر.[3]

---

[1] انظر: نفس المصدر، ص۱۶۵

[2] جامع الفصولين، الفصل الثامن والثلاثون في مسائل الكلمات الكفرية، ج۲ص۱۷٦.

[3] شرح الامام على القارى على كتاب الفاظ الكفر للعلام بدر الرشيد، ص۱٦۷.

"شریعت کے کسی بھی حکم کا مذاق اڑانا کفر ہے۔"

اسی طرح فقہاءِ کرام نے تحریر فرمایا ہے کہ اگر کوئی فقیہ یا محدث شرعی احکام اور صحیح احادیث کا درس دے رہا ہو اور کوئی ان احکام و احادیث کو رد کرتے ہوئے یہ کہے کہ یہ فضول چیز ہے یا کہے کہ یہ بے کار چیز ہے یا یہ کہے کہ یہ کسی بھی مرض کی دواء نہیں، تو اس کہنے سے وہ کافر ہو جائے گا، اسی طرح اگر کوئی شخص اس دوران کہے کہ یہ سائنس و ٹیکنالوجی کا دور ہے اس دور میں ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں، تو یہ بھی کلمہ کفر ہے اور اس کی وجہ سے بھی کہنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔[1]

ان تمام صورتوں میں کفر کا اصل سبب اسی تعظیم و محبت کا فقدان یا معارضہ ہی ہے، اور اسی بنیاد پر کفر کا حکم لگایا گیا۔

تسلیم وانقیاد فوت ہو جانے کی وجہ سے تکفیر کی مثال

ایمان کے لوازمات میں سے تیسرا لازم "تسلیم وانقیاد" ذکر کیا گیا یعنی دل و جان سے شریعت کا فیصلہ قبول کرنا اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اس کا تابع فرمان بننا، یہ بھی ایمان کا ایک لازمی تقاضا ہے اگر کوئی دل و جان سے حضور ﷺ کی تصدیق کرے لیکن شرعی احکام کے سامنے تسلیم وانقیاد نہ کرے بلکہ اس کے کسی فیصلہ کو رد کرے تو اس کو مسلمان نہیں کہا جا سکتا۔

قرآن کریم میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے کہ:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي

---

[1] نفس المصدر، ص۱۶۴.

أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار نہ ہونگے جبتک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کروایں پھر اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کرلیں۔[1]

علامہ شوکانی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بڑی سخت وعید مذکور ہے کیونکہ اولاً تو الفاظ قسمیہ ہیں، ثانیاً مزید تاکید کے لئے ابتداء میں "لا" بھی لایا گیا ہے، ثالثاً نفی بھی نیک ہونے یا کامل ہونے کی نہیں، بلکہ اصل ایمان ہی کی نفی مقصود ہے جو کہ تمام طاعات اور ہر قسم کی کامیابی کی اصل بنیاد اور جڑ ہے، حاصل یہ ہوا کہ کوئی اس وقت تک ہر گز مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک وہ آپ ﷺ کو اپنے درمیانی تنازعات میں حکم نہ مقرر کرے، پھر صرف حکم کرنے پر ہی اکتفاء نہیں فرمایا گیا بلکہ اس میں مزید شرائط بھی مقرر فرمائے گئے جس کے بغیر محض "تحکیم" بھی کافی نہیں۔

پہلی شرط یہ بیان فرمائی گئی کہ تحکیم کے بعد حضور ﷺ کے فیصلہ کے متعلق دل میں کوئی حرج، تنگی اور شک نہ ہونے پائے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کو ظاہر و باطن سے تسلیم کرے۔

پھر مزید تاکید کے لئے "تسلیما" مفعول مطلق کو دوبارہ ذکر فرمایا گیا، اب اس تفصیل کا حاصل یہ ہوا کہ جب تک کوئی بندہ مؤمن مندرجہ بالا طریقے سے تحکیم نہ کرے اور پھر شریعت کے فیصلہ کو دل و جان سے قبول نہ کرے، اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] (سورة النساء، ٦٥).

واضح رہے کہ احکام شریعت کو بے چون وچرا تسلیم کرنا اور چیز ہے اور کبھی کبھار عملی کوتاہی اور احکام شریعت کو ترک کرنا اس سے بالکل مختلف چیز ہے، اگر کوئی شخص احکام شریعت کو قبول کرے اس پر عمل کرنے کا جذبہ رکھے لیکن کبھی عملی میدان میں اس کی مخالفت ہو جائے، دنیاوی مفاد کی خاطر شریعت کی احکامات کی خلاف ورزی ہو جائے تو محض اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں کہلائے گا۔[۲]

مخالف ادیان سے بری نہ ہونے کی وجہ سے تکفیر کی مثال

ایمان کے مفید و معتبر ہونے کے لئے چوتھی بنیادی چیز "مخالف ادیان سے بری ہونا" ہے، قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ اعلان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین حق صرف اور صرف اسلام ہی ہے، اس کے علاوہ جتنے ادیان و مذاہب دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم وعلی نبینا الصلوات والتسلیمات لے کر آئیں تو وہ اگرچہ اپنے اپنے زمانے کی حد تک حق تھیں لیکن حضور ﷺ کی بعثت سے وہ سارے ادیان منسوخ ہو گئیں۔

اب اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا قرب ورضا حاصل کرنا چاہتا ہے یا آخرت میں نجات کی امید رکھتا ہے تو اس کا واحد راستہ دین اسلام قبول کرنا ہی ہے، اگر کوئی شخص اسلام کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب بھی اختیار کرے تو وہ مسلمان نہیں کہلائے گا بلکہ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد بھی اگر کوئی شخص صرف اسلام کو حق نہ سمجھے بلکہ ساتھ

---

[۱] فتح القدير للشوكاني، ج۱ص ۵۵۹.

[۲] اس بات کی تفصیل باب اول میں شرائط ایمان کی بحث میں ذکر کی گئی ہے۔

ساتھ یہودیت و نصرانیت وغیرہ ادیان کو بھی حق اور قابل اطاعت سمجھے تو وہ شخص بھی کافر ہو گا۔

حضرات فقہاء کرام کے چند جزئیات

حضرات فقہاء کرام نے اس پر بہت سے جزئیات میں کفر کی بنیاد رکھی، حضرت علامہ قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ بڑی وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:

ولهذا نكفر من لم يكفر من دان بغير ملة المسلمين من الملل أو وقف فيهم أو شك أو صحح مذهبهم وإن أظهر مع ذلك الإسلام واعتقده واعتقد إبطال كل مذهب سواه فهو كافر بإظهاره ما أظهر من خلاف ذلك.

"جو شخص دین اسلام کے علاوہ دیگر ادیان اپنانے والوں کو کافر نہ کہے یا ان کے کفر میں شک و تردد کرے یا ان کے مذہب کی تصحیح کرے تو ہم اس کی تکفیر کرتے ہیں، اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کا اظہار کرے اور اس کی حقانیت، دوسرے تمام مذاہب کے باطل ہونے کا اعتقاد بھی رکھے تو بھی وہ کافر ہے کیونکہ اس نے اس کے خلاف امور کا اظہار کیا"[1]

دوسرے ادیان کو حق سمجھنا تو بڑی بات ہے اگر کوئی شخص ان ادیان کو دل سے حق نہ سمجھے لیکن بلا ضرورت ان کے مذہبی شعار و رسومات کو دلی محبت سے اپنائے، اس پر خوشی کا اظہار کرے یا ان کے اس قسم کے مذہبی منکرات کی خوشی خوشی تائید

---

[1] الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني، فصل في بيان ما هو من المقالات كفر وما يتوقف أو يختلف فيه وما ليس بكفر، ج٢ص٢٨٦.

کرے یا مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی ترجیح وتوصیف میں رطب اللسان رہے توان تمام امور کو بھی حضرات فقہاء کرام (رحمہم اللہ) موجبات کفر میں شمار فرماتے ہیں۔

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ موجبات کفر ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بوضع قلنسوة المجوسي على رأسه على الصحيح إلا لضرورة دفع الحر أو البرد وبشد الزنار في وسطه إلا إذا فعل ذلك خديعة في الحرب وطليعة للمسلمين وبقوله معلم صبيان اليهود خير من المسلمين بكثير فإنهم يقضون حقوق معلمي صبيانهم وبقوله المجوسية خير مما أنا فيه يعني فعله وبقوله النصرانية خير من المجوسية لا بقوله المجوسية شر من النصرانية وبقوله النصرانية خير من اليهودية وينبغي أن يقول النصرانية شر من اليهودية وبقوله لمعاملة الكفر خير مما أنت تفعل عند بعضهم مطلقا. وقيده الفقيه أبو الليث بأن يقصد تحسين الكفر لا تقبيح معاملته وبخروجه إلى نيروز المجوس والموافقة معهم فيما يفعلون في ذلك اليوم.

"سر پر مجوسیوں کی ٹوپی رکھنے سے بھی راجح قول کے مطابق کافر ہو جائے گا مگر اگر گرمی سردی وغیرہ عذر کی وجہ سے ایسا کیا جائے تو کافر نہیں ہوگا، جسم کے درمیان (ذمیوں کی طرح) زنار باندھنے سے بھی کافر ہو جائے گا مگر اگر جنگ میں دھوکہ دینے کے لئے یا مسلمان کے جاسوس کے طور پر کوئی ایسا کرے تو کفر نہیں، یہ کہنے والا بھی کافر ہے کہ "یہودی بچوں کا استاد مسلمانوں سے بہت بہتر ہے کیونکہ وہ اپنے بچوں کے حقوق ادا کرتے ہیں "اور اس کہنے سے بھی کہ " بت پرستی اس سے بہتر ہے جس کے اندر میں ہوں" اسی طرح اس کہنے سے بھی کہ "نصرانیت مجوسیت سے بہت بہتر ہے" ۔۔اسی طرح اگر اپنے ساتھ معاملہ کرنے والے کو کہا کہ آپ کے معاملہ سے کفر بہتر ہے تو بعض فقہاء کے نزدیک مطلقاً (

ہر حال) میں کافر ہو جائے گا جبکہ حضرت فقیہ ابو اللیث رحمہ اللہ نے اس میں یہ قید بھی لگائی کہ کہنے والے کا مقصود کفر کو اچھا سمجھنا ہو اگر کفر کو مستحسن نہیں سمجھتا صرف اس معاملہ کی برائی مقصود ہو تو کافر نہیں ہو گا، اسی طرح مجوس کے عید نیروز میں نکلنا اور ان کے ساتھ اس دن کے رسومات میں موافقت کرنا (یہ بھی ایسا اقدام ہے جس سے انسان کافر ہو جاتا ہے)[1]

اس عبارت میں جن امور کو کفر قرار دیا گیا، بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم تو کفر اور اہل کفر کے شعار کو اپنانا ہے مثلاً مجوس کی خاص وضع وہیئت والی ٹوپی پہننا، صلیب گلے میں لٹکانا، زنار باندھنا یا نیروز وغیرہ مذہبی تقریبات میں شریک ہونا دوسری قسم یہ ہے کہ کفر کو اسلام کے مقابلے میں بہتر سمجھا جائے۔

دونوں کے کفر ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس میں ایمان کا ایک لازم یعنی مخالف ادیان ومذاہب سے بیزاری، فوت ہو رہا ہے اور لازم کے انتفاء سے ملزوم کا انتفاء ثابت ہو جاتا ہے۔

نیز اس عبارت میں فقیہ ابو اللیث سمرقندی رحمہ اللہ کے حوالہ سے جو قید ذکر ہوئی ہے، اس کی رعایت رکھنا ضروری ہے اور یہ صرف دوسری قسم امور کے متعلق نہیں ہے جیسا کہ عبارت کے ظاہر سے متبادر ہو رہا ہے بلکہ پہلی قسم میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ جنگ وجاسوسی وغیرہ مقاصد کے لئے اگر کوئی ایسا اقدام کرے تو اس کو کافر قرار نہیں دیا گیا، تاہم اگر کوئی شخص اس کو مطلقاً کفر ہی سمجھ رہا ہو اور

---

[1] البحر الرائق مع منحة الخالق، کتاب السیر، باب أحکام المرتدین، ج۵ ص ۱۳۳.

اس کے باوجود اس کا ارتکاب کرے تو کافر ہو جائے گا مگر اس کی وجہ یہ نہیں ہو گی کہ یہ امور بذات خود کفر ہیں بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ اس اعتقاد کے باوجود ارتکاب کرنا درحقیقت کفر پر راضی ہونا ہے اور رضا بالکفر کفر ہے، اسی طرح استخفاف و استحلال وغیرہ کے ساتھ اگر ان کا ارتکاب کیا جائے تو بھی کفر ہے۔(مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: فتاویٰ قاضی خان، اور حضرت ملا علی قاری کی شرح الفاظ کفر)۔[1]

---

[1] فتاوی قاضی خان، باب ما یکون کفرا من المسلم وما لا یکون، ج۳ص۳۶۲. شرح الامام علي القاري على كتاب الفاظ الكفر للعلامة بدر الرشيد، ص۲۰۰تا۲۰۵.

باب خامس

سیکولرازم کا تعارف، آغاز وارتقاء

بنیادی اہداف واغراض اور زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق اس کا نظریہ

سیکولرازم کے شرعی حکم کی مکمل تحقیق

باب کا تعارف

سابقہ ابواب میں تکفیر سے متعلق کچھ بنیادی اصول وضوابط کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی، تکفیر کے باب میں امت مسلمہ کے درمیان کئی ایک مسائل مختلف فیہا ہے جس کو حضرات متکلمین عام طور پر اسی باب میں ذکر کرتے ہیں جس کے ضمن میں معتزلہ، خوارج اور جہمیہ کے اختلافات بھی ذکر کردئے جاتے ہیں اور یہ بحث ہوتی ہے کہ ان کے عقائد کفریہ ہیں یا نہیں؟ ان کے عقائد کی وجہ سے ان کو کافر کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟

قدیم متکلمین کے دور میں تو انہی فتنوں نے جنم لیا تھا، اس لئے وہ اس کے تردید میں مصروف تھے اور امت کے شیرازہ کو ان جماعتوں کے مبتدعانہ نظریات وخیالات سے بچانے کی بھرپور کوشش فرمائی جس پر وہ پوری امت کی طرف سے تحسین وآفرین کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ ان حضرات کو دفاع دین کے اس عظیم خدمت کا بہترین صلہ عطافرمائیں۔

ان حضرات کے ادوار میں انہی مسائل کی اہمیت تھی جس کا انہیں اچھی طرح احساس تھا، ہمارے اس دور میں بھی امت مسلمہ کو چند ایسے مسائل درپیش ہیں جن کا تعلق بھی اسی باب "تکفیر وعدم تکفیر" کے ساتھ ہے۔

قدیم وجدید فتنوں میں فرق

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دورحاضر کے مسائل معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ دینی فرقوں سے اس لحاظ سے انتہائی خطرناک ہے کہ ان میں سے اکثر مسائل واختلافات ایسے
تھے کہ جو کم از کم دین کی اہمیت وافادیت پر مضبوط عقیدہ رکھنے والے افراد کی طرف سے سامنے آئے تھے جن کی اصل بنیاد قرآن وسنت میں غور وفکر کرنا تھا اگرچہ اس کا طرز فکراور منہج استدلال بالکل غلط تھا لیکن دیندار اور مسلمان ہونا وہ اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

جبکہ عصر حاضر کے مسائل کی نوعیت اس سے بالکل مختلف ہے، یہ مسائل قرآن وسنت میں غور وفکر کرنے کا نتیجہ ہے نہ ہی کسی مسلمان قلب ودماغ نے اس کو ایجاد کیا، دینی ماحول ومعاشرے میں جنم لینے کا شرف بھی اس کو نصیب نہیں ہوا، قدیم دور کے بعض اسلامی فرقوں کے فتنوں کے پش پشت مذہب سے وارفتگی اور اخلاص کا جو جذبہ کارفرما ہوتا تھا، ہمارے اس دورحاضر کے مسائل اس حسین جذبے سے بھی سراسر محروم ہی ہیں۔

مفکرین جانتے ہیں کہ ان مسائل کا اصل مرکز یورپ ہے جہاں سے ان مسائل کو امت مسلمہ پر ایک خاص منصوبہ بندی اور منظم انداز میں مسلط کر دیا گیا ہیں اور آج اس بیچاری امت مرحومہ کا ایک جم غفیر اس کا شکار ہے۔

اس قسم کے مسائل کی فہرست تو کافی لمبی ہے تاہم سرِدست اس فہرست کے ایک

اہم اور بنیادی مسئلہ "سیکولرازم" پر یہاں مختصر سی بحث کی جاتی ہے جس کے اندر آج اگر اکثر امت نہیں تو کم از کم ایک نہایت عظیم طبقہ ایسا ہے کہ جو اس فتنہ کے زلفوں کا اسیر بن چکا ہے اور اس خالص مغربی گمراہی کو اسلامی لباس پہنانے میں مصروفِ عمل ہیں بلکہ کچھ نادان اور ناعاقبتاندیش لوگ تو اس کو اسلام کا لیلیٰ عروس باور کرانے میں سر گرم ہیں۔

تکفیر کے باب میں ان مسائل کو ذکر کرنے کی بنیاوی وجہ

"اصول تکفیر" میں ان مباحث کو درج کرنے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ ان مسائل کا براہ راست "مسئلہ تکفیر" سے تعلق ہے اور دیگر مسائل کے مقابلے میں امت مسلمہ کو ان مسائل میں دینی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے، اس لئے یہاں اس فکر کے شرعی حکم بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن چونکہ شرعی احکام بیان کرنے سے پہلے کسی چیز کا تعارف بھی ضروری ہوتا ہے اس لئے اس مقصد کی خاطر اس کی مختصر سی وضاحت بھی ذکر کردی جاتی ہے تاکہ حکم سمجھنے میں آسانی رہے۔

سیکولرازم کا تعارف

یہ انگریزی زبان کا لفظ ہے، کیمبرج ڈکشنری میں اس کا معنی یہ لکھا ہے کہ:

secularism

the belief that religion should not be involved with the ordinary social and political activities of a country

ترجمہ: سیکولرازم: اس بات کا یقین کرنا ہے کہ مذہب عام رسمی معاشرے کے ساتھ اور اسی طرح ملک کے سیاسی سرگرمیوں میں نہیں چل سکتا۔

عربی زبان میں اس کو" علمانیۃ" کہا جاتا ہے، عرب مفکرین اور اہل لغت میں سے بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل "عِلمانیۃ" عین کے زیر کے ساتھ ہے جو علم کی طرف منسوب ہے، اس تلفظ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نظریہ ہر چیز کو "جدید علم" کے ترازو میں تولتا ہے یعنی محض عقل اور مشاہدے سے پرکھتا ہے جو چیز مشاہدے میں آئے، اس پر یقین رکھتا ہے اور جو چیز مشاہدے سے باہر ہو، اس کو بالکل غلط اور بے بنیاد تصور کر کے اس کی تردید کرتا ہے اور اس کی طرف توجہ کرنے کی زحمت نہیں کرتا۔

لیکن بہت سے مفکرین اور عربی لغت کے ماہرین "ع" کے زیر کے ساتھ اس تلفظ کو درست تسلیم نہیں کرتے، ان کا کہنا ہے کہ یہ لفظ "ع" کے زبر کے ساتھ ہے یعنی "عَلمانیہ" اور علم سے مقصود "عالم" یعنی دنیا ہے اس کے مطابق اس کی نسبت کر کے اصل تلفظ "عالمانیہ" کہا جانا چاہئے لیکن زیادہ استعمال کی وجہ سے الف کو حذف کیا جاتا ہے، اس تلفظ کے مطابق اس کا معنی وہی بنا جو انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا نے کیا یعنی " دنیویہ"، زندگی کے ہر میدان میں دنیا ہی دنیا کو ترجیح دینا اور آخرت کے معاملات پر اس کو فوقیت دینا۔

اصطلاحی تعریف

چونکہ یہ نظریہ یورپ کی طرف سے عالم اسلام میں برآمد کیا گیا، خود اہل اسلام نے اس کی ایجاد نہیں کی اس لئے ابتداء میں اس کے متعلق یہ تصور دیا گیا کہ یہ نظام صرف سیاست کے میدان سے دین کو دور کرنے کا نام ہے، سیاست اور حکومت کے

علاوہ زندگی کے تمام گوشوں میں اگر مذہب پر عمل درامد ہوتا رہے تو یہ نظریہ اس کا بالکل مخالف نہیں۔

اسی تصور کی بناءپر بہت سے علماء کرام نے اس کی تعبیر "فصل الدین عن الدولۃ " یا "فصل الدین عن السیاسۃ" سے کی یعنی صرف حکومت وسیاست کے میدان میں دین کو جدا کرلینا کہ حکومت وسیاست کسی دین کے تابع نہ ہو، خلافت عثمانیہ کے اخیر دور کے شیخ الاسلام اور اپنے ماحول کے حالات سے باخبر شخصیت علامہ مصطفی صبری رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معرکۃ الاراء کتاب "موقف العقل "میں اسی تصور کو بنیاد بنا کر اس پر تفصیل سے قابل دید بحث فرمائی۔[1]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک مغالطہ تھا جو اس وقت عام کردیا گیا تھا، جوں جوں سیکولرازم کا تاریخی پس منظر اور اس کا آغاز وارتقاء واضح ہوتا گیا تو ساتھ ساتھ اس کے اہداف واغراض بھی ظاہر ہونے لگے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد خود اسی تحریک کے پر جوش علمبرداروں نے وضاحت کے ساتھ یہ بیان کردینا شروع کیا کہ اس تحریک کا مقصد صرف "فصل الدین عن الدولۃ یا عن السیاسۃ" ہی نہیں بلکہ اصل ہدف "فصل الدین عن الحیاۃ" ہے یعنی صرف سیاست کو مذہب کے قیودات سے آزاد کرنا ہی منزلِ مقصود نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں کو مذہب کے "خلاف عقل" پابندیوں سے آزاد کرنا ہی اصل ہدف ہے۔

---

[1] موقف العقل والعلم والعالم من رب العلمين، الباب الرابع فی عدم جواز فصل الدین عن السیاسة،ج٤ ص ٢٨٠ .

چنانچہ ۱۴۲۹ماہ رجب بمطابق نومبر ۱۹۹۸ءجب مجمع الفقہ الاسلامی نے "علمانیہ" کے موضوع پر عالم اسلام کے چند علماء کرام سے مقالات لکھوائے،اس پر مجمع کے ارکان کے درمیان مباحثہ اور مناقشہ ہوا،اس کے نتیجے میں جو قرارداد منظور ہوااس میں علمانیہ کا یہی مفہوم بیان کیا کہ "فصل الدین عن الحیاۃ"[1]

آغاز وارتقاء

قرونِ وسطی کے اندر جب یورپ میں کلیسا کاراج تھا، پوراعالم عیسائیت اس کے گویا زیر سلطنت تھا، کلیسا کا منشاو حکم بعینہ خداکا حکم تصور کیا جاتا تھا جس کی ذرہ بھر مخالفت کرنا یااس کو پورا کرنے میں تھوڑی دیر توقف کرنا خود کشی کے مترادف تھا،اس زمانے میں کلیسااور اس کے در ودیوار میں رہنے والے نام نہاد مذہبی رہنماؤں نے اپنے نہ ختم ہونے والے خواہشات اور مفادات کی خاطر عجیب وغریب دین وضع کیا تھا۔

ان کا دعویٰ تھا کہ ہمارا اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست رابطہ ہے، خدا کی طرف سے ہمیں یہ عہدہ سپرد ہوا کہ لوگوں کے درمیان احکامات جاری کریں، ہمارا معاملہ عام انسانوں سے بالکل مختلف نوعیت کا ہے، ہمیں ہر قسم کا اختیار حاصل ہے، ہماری مخالفت خدا کی مخالفت ہے۔۔۔

یہ اور اس قسم کے بے بنیاد دعاوی سے عیسائی عوام کو بے وقوف بنایا گیا، ٹیکسوں کا ظالمانہ نظام بھی بھرپور طریقے سے جاری تھا، کلیسا کے املاک بھی کسی کسی ریاست

---

[1] مجمع الفقه الإسلامي،موضوع: الإسلام في مواجهة العلمنة، ج۲ص۲۲۱۱۲.

کے املاک سے کم نہ تھے۔۔۔اس قسم کی باتوں نے عوام کے درمیان نفرت اور مخالفت کی ایک فضاء پیدا کردی جس کی آبیاری کلیسا کی طرف سے آئے روز کے ظلم و ستم سے مزید ہوتی رہی۔

یہاں تک کہ بعض جرأت مند نوجوان اٹھے اور عوام میں کلیسا کے خلاف نفرت کے جذبے کو خوب پروان چڑھایا، لیکن یورپ چونکہ اس دور میں جہالت کی بند تاریکیوں میں گھسا ہوا تھا اس لئے کلیسا کے علاوہ ان کو کوئی اور مذہب نظر نہیں آیا اور یوں کلیسا کی مخالفت مذہب کی مخالفت بنتی چلی گئی، شاید مغرب نے بھی کنویں کے مینڈک کی طرح اپنے نادانی اور جہالت یا ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے کلیسا اور مذہب کو مترادف الفاظ سمجھا۔

کلیسا کی کہانی

دوسری طرف کلیسا نے اپنی بادشاہت بلکہ خدائی برقرار رکھنے کی خاطر اپنے عوام پر خاطر خواہ پابندی لگادی تھی کہ جس راستے سے بھی ان کے درمیان علم وحکمت یا عقل وشعور پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا تھا، اس کو قطعی حرام کردیا جاتا تھا تاکہ کسی طرح کلیسا کی خدائی باقی رہے، اس لئے کلیسا کی طرف سے ہر علم وفن اور ترقی کی دشمنی کی جاتی تھی جو فطرت کے خلاف ہے جبکہ اسی دور میں اندلس وقرطبہ میں عرب مسلمانوں نے علم وحکمت اور سائنس وٹیکنالوجی کے دریا نہیں بلکہ گویا معطر سمندر بہانا شروع کئے تھے جس کو دیکھ کر عیسائیت میں مقاومت کا جذبہ پیدا ہونا ایک فطری امر تھا لیکن دوسری طرف اس کے پورا کرنے میں کلیسا کا نقصان تھا اس لئے وہ ہر قیمت ان جیسے اقدامات کو کچلنے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔

یورپ میں مذہب کے خلاف اس تصور کے قبول ہونے میں خود عیسائی مذہب کی فطرت کا بھی ایک حد تک دخل تھا، کیونکہ عیسائی مذہب دین اسلام کی طرح مکمل ضابطہ حیات نہ تھا جو انسانی دنیا کے ہر ہر گوشے کے لئے قابل عمل ہو، تعلیم و ثقافت، سیاست و حکومت، اخلاق و معاشرت، حدود و تعزیرات، عقائد و عبادات، اقتصاد و تجارت اور جنگ و جہاد وغیرہ زندگی کے تمام شعبوں کے تفصیلی احکام عیسائیت میں موجود نہ تھے، اور جو کچھ رہنمائی اصل مذہب میں موجود بھی تھی، اس کو بھی تغییر و تحریف کے گہرے سیاہ پردوں نے اتنا پوشیدہ کر رکھا تھا کہ اس میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا بیچارے انسانی عقل و فکر کا کام نہ تھا۔

کلیسا نے محض اپنے مفاد کی خاطر ان سب چیزوں کو وضع کیا تھا اور ظاہر ہے کہ ایک خود غرض انسان کے بنائے ہوئے قانون سے اتنی بڑی انسانیت کو کہاں تک سکون و اطمینان نصیب ہو سکتا ہے؟ خصوصا جب بنانے والا بھی صرف اور صرف اپنے ہی مفاد کا پجاری ہو۔

یہی وجہ تھی کہ اگر کسی کے دل و دماغ میں اس خود ساختہ مذہب کے کسی حکم کے خلاف اشکال ذہن میں آتا یا اس کا کوئی حکم خلاف فطرت محسوس ہوتا تو کلیسا کی طرف یہی پٹی پڑھائی جاتی کہ "پہلے اپنے عقل کے چراغ کو مٹا ڈالو اس کے بعد حکم پر عمل کرو" گویا یہ احکام عقل سے سوچنے اور سمجھنے کی چیز ہے ہی نہیں، یہ تو عقل و روشنی کے دریچے بند کر کے قبول کرنے اور فوراً ہی عمل پیرا ہونے کے لئے ہیں۔

اس کھوکھلے پن کی وجہ سے بھی مذہب کے خلاف نفرت عام ہوتی گئی۔

عیسائیت اور مذہب کے خلاف عیسائیوں کے انقلاب برپا کرنے میں خود مذہبی جنگوں کو بھی بڑا دخل تھا، معمولی باتوں پر بڑی بڑی جنگیں لڑی جاتیں اور اس میں زیادہ تر نقصانات بے چارے عوام ہی کو اٹھانا پڑتے تھے بلکہ کلیسا کی تاریخ و تہذیب سے یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ ذاتی مفاد کی جنگ کے لئے مذہب کا مقدس نام استعمال کرے اور اس راستے سے دونوں طرف سے عوام کے کشت وخون کا بازار گرم کر کے اپنی اہداف پورے کرے۔

ان تمام امور کی وجہ سے یورپی عوام کے اندر مذہب کے خلاف نفرت کا جذبہ اپنے انتہاء کو پہنچا اور یوں کلیسا کے خلاف تمام عوام اٹھ کھڑے ہوئے جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنے اوپر کلیسا کے اس نظام کو ختم کر ڈالا، لیکن ظاہر ہے کہ کلیسا اس تمام کاروائی میں مذہب ہی کا نام استعمال کرتا رہا، اس لئے کلیسا کی مخالفت مذہب کی مخالفت بنتی چلی گئی اور بالاخر یہی نظریہ قبول عام ہوا کہ دین کو سیاست وحکومت بلکہ تمام شعبہائے زندگی سے جدا کیا جائے، مذہب بس صرف مخصوص پوجا پاٹ تک ہی محدود رکھا جائے جس میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہو۔

اس "انقلاب" کے نتیجہ میں پوری زندگی سے دین سمٹ سمٹ کر صرف عبادت خانوں میں سکڑتا چلا گیا اور اسی نظریہ کو سیکولرازم کا بنیاد بنایا گیا۔

سیکولرازم کا فکر وفلسفہ برائے نظام زندگی

سیکولرازم کی اصل بنیاد مذہب کی مخالفت بنی اور اس نظریہ کے پرستاروں نے یہ دعوی کیا کہ انسانیت کو مذاہب کے تمام قیودات سے آزاد کرنا ہے، اور اس دعوی" جو چیز ہمارے مشاہدے میں نہیں، وہ کوئی چیز ہی نہیں" کو خوب شہرت دی گئی، تقریباً

تمام سماوی مذاہب کا ایک بڑا حصہ ایمان بالغیب یعنی غیبی امور پر ایمان واعتقاد رکھنے پر مشتمل ہوتا ہے اور تمام آسمانی مذاہب میں یہ بھی ایک قدر مشترک ہے کہ ان کا اصل ہدف انسان کی اخروی زندگی کی اصلاح ودرستگی ہے، اس لئے بہت سے احکام اپنے ماننے والوں کے لئے ضروری قرار دیتی ہے اور بہت سے خواہشات کو بالکل ممنوع قرار دیا جاتا ہے، اسی مقصد کی خاطر ہر مذہب میں جائز وناجائز کی ایک فہرست موجود ہوتی ہے۔

سیکولر نظریہ کے حاملین کو اسی بات سے چھڑ تھا اور ہے، ان کا دعویٰ یہی تھا جس کو وہ بڑے زور وشور سے پیش کر رہے تھے کہ دنیا ہی سب کچھ ہے اور ہماری علم و تحقیق، سائنس وٹیکنالوجی ہی اصل ہدف اور کامیابی کی ضمانت ہے، جو چیز ہمارے تجربے میں نہیں اور جس چیز کا حواس سے کوئی سراغ نہ ملے، اس کے پیچھے پڑنا درانسانی آزادی کو ختم کرنا ہے اور انسانیت کو غلامی کا طوق پہنانا ہے، اور چونکہ مذہب کی بھی یہی صورت حال ہے اس لئے ہر قیمت پر اس کو کچل ڈالنا ہے، مذہب سے وارفتہ دل ودماغ کے سکون کے لئے یہی کہنا کافی ہے کہ مذہب ہر کسی کا ایک شخصی معاملہ ہے، حکومت وریاست بلکہ عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اسی فلسفہ کے تحت وہ مذہب کے خلاف مختلف قسم کے پروپیگنڈے کرتا رہا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ذیل میں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق سیکولرازم کے نظریات ذکر کئے جاتے ہیں۔

علم وفکر کے باب میں سیکولر نظریہ

سیکولرازم کا کہنا یہ ہے کہ دنیامیں مادہ ہی سب کچھ ہے، یہی زندگی کا اصل مقصد ہے اور اس میں ترقی اصل کامیابی اور تنزل اصل ناکامی ہے، مذہب کی بنیاد چونکہ

غیبی امور پر ہے جن کو مادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، اس لئے مذہب کوئی قابل اتباع چیز نہیں۔

حکومت وسیاست کے باب میں اس کا نظریہ

مذہب کو حکومت وسیاست سے بالکل الگ کرنا ضروری ہے، یہ دونوں امور ہر ماحول اور ہر وقت کے رسمی طریقہ کار کے مطابق ہی سرانجام دینے چاہئے، سیاست دان اور حاکم کے لئے عادل یا متقی ہونا، یا دینی علم رکھنا کوئی ضروری نہیں ہے، اسی طرح حکومت کے لئے دینی عقائد واحکام کی حفاظت کرنا، یا اس کے مطابق نظام زندگی ترتیب دینا، یا مذہب کے تحفظ ودفاع کے لئے جنگ کرنا قطعاً غلط ہے، حکومت کے اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دنیوی مفادات کا تحفظ کرے اور بس۔

دستور و قانون کے متعلق نظریہ

اسلام کا موقف یہ ہے کہ قرآن وسنت میں جو قوانین بتائے گئے ہیں وہ انسانیت کے فلاح وبہبودی کے لئے ضروری ہیں اور حکومت وقت کا یہ اٹل فریضہ ہے کہ اپنی سلطنت میں قرآن وسنت ہی کے ان قوانین کو نافذ کرے اور اسی کے مطابق ریاست چلائے، لیکن سیکولرازم کا کہنا ہے کہ چونکہ یہ قوانین مادیت کے مطابق نہیں اس لئے یہ محض پراگندہ خیالات ہی ہیں (نعوذ باللہ)، عوام کی اکثریت جن نمائندوں کو منتخب کریں وہ مادیت اور لوگوں کے دنیوی مفاد کے خاطر جو بھی قوانین بنانا چاہے وہی اصل قوانین ہیں جن کا نفاذ حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اس دلسوز تاریخ کا یہ بھی ایک عجیب کرشمہ ہے کہ اگر یہی نمائندے اسی طریقے کار کے مطابق بھی قرآن وسنت کے قانون کو ملکی دستور بنانا چاہے تو سیکولرازم کے

علمبرداروں کے نزدیک اس کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، کیونکہ یہ مادیت کے خلاف ہے اوراس سے انسانیت کو غیبی امور کی طرف رہنمائی ملتی ہے، گویا سیکولر نظریہ کے مطابق عوام کے منتخب بندے بھی اس بات کے پابند ہیں کہ وہ مذہبی دستور کو نافذ نہ کریں ورنہ ان کا انتخاب بھی سو فیصد غلط قرار پاجائے گا۔

معیشت واقتصاد کے متعلق نظریہ

اس نظریہ کا موقف یہ ہے کہ طلب ورسد کے مطابق ہر شخص کو تجارت کے میدان میں مکمل آزادی حاصل ہے، جہاں کوئی شخص اپنا فائدہ دیکھے تو وہ کاروبار کر سکتا ہے، کوئی شخص اس کا راستہ نہیں روک سکتا، یہاں سیکولرازم کے حمایت کرنے والے کہتے ہیں کہ " الغایۃ تبرر الوسیلۃ"یعنی جب اصل مقصود درست ہے تواس کو حاصل کرنے کے لئے ہر قسم وسائل استعمال کئے جا سکتے ہیں، اس میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز نہیں ہونی چاہئے۔

لہٰذا مذہب نے اس میدان میں انسانیت پر جو پابندیاں لگائی کہ وہ سود وقمار سے لازمی طور پر بچے، بیع فاسد اور باطل کو ممنوع قرار دیا وغیرہ وغیرہ ۔۔اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

اخلاق وتربیت کے میدان میں اس کا نظریہ

سیکولزازم کا دعوی ہے کہ ہر زمانے کے اپنے اخلاق اور اپنا ایک خاص طرز عمل ہے، اس باب میں مذاہب کا پابند رہنااور صدیوں پہلے کے اخلاق کو قبول کرنا حماقت ہے، زمانے کی عام روش جس چیز کو اخلاق کا درجہ دیدے اسی کو اخلاق کہنا چاہئے اوراس

حوالے سے کسی مذہبی داستان کی تقلید واتباع نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس کو دور اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے (نعوذ باللہ)۔

لہٰذا مذہب نے زنا، بد نظری اور ہم جنس پرستی وغیرہ جن امور کو ممنوع قرار دیا یا پردے کو لازم قرار دیا، یہ بالکل غلط ہے کیونکہ یہ باہمی رضامندی کی چیز ہے اگر کوئی مرد وعورت زنا کرنے پر راضی ہیں تو مذہب کو اس میں مداخلت کا کیا حق ہے؟ اسی طرح اگر کوئی جوڑا ہم جنس پرستی کرنا چاہے تو یہ ان کا حق ہے اور ان کا شخصی معاملہ ہے جس میں مذہب کو مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں۔

تعلیم کے میدان میں سیکولر نظریہ

تعلیم بھی انہی چیزوں کی دینی چاہئے جن میں انسان کو کسی مادی فائدہ حاصل ہونے کا امکان ہو، اللہ کے وجود، توحید، انبیاء کرام کے واقعات اور حشر ونشر کی باتیں مذاہب کی طرف سے انسانیت کو فضول میں قید کرنے کے مترادف ہے، درست اور معیاری تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ اس کو ان جیسی باتوں سے بالکل دور رکھا جائے اور توجہ انہی امور پر مبذول کر لینی چاہیے جہاں سے کوئی مادی فائدہ مل سکے۔

سیکولر تعلیمات ونظریات کا خلاصہ

لادینیت کے اس تحریک کے آغاز ونشو ونما پر غور کرنے اور اس کے تمام نظریات کا تجزیہ کرنے کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ:

۱۔اخروی معاملہ کوئی قابل توجہ چیز نہیں۔

۲۔دین ومذہب کے تعلیمات اس زمانے میں قابل عمل نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام میں سے جو لوگ اس تحریک سے متاثر ہوئے وہ برملا یہ واویلا کرتے ہیں

کہ اس دور میں مسلمانوں کے پستی کی اصل جڑ مذہبی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہے یہی خرابی اور فساد کی اصل بنیاد ہے مذہبیت کا جذبہ ہی وہ افیون ہے جس نے مسلمانوں کے اونٹ کو بے خود کر کے تنزل کے اتاہ وادیوں میں ہمیشہ کے لئے دھکیل دیا ہے، ان میں سے ترکی کا کمال اتاترک، ہندوستان کا سر سید احمد خان اور مصر کا طٰہٰ حسین وغیرہ سرِ فہرست ہیں۔

۳۔ دین ہر شخص کا ایک شخصی معاملہ ہے جس میں ہر کوئی خود مختار ہے اور کسی کو دوسروں کی زندگی میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں، اور اس باب میں تمام مذاہب بالکل مساوی ہیں کسی کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں، نہ ہی مذہب کو بنیاد بنا کر کوئی امتیاز کرنا درست ہے۔

۴۔ عملی زندگی کے ساتھ دینِ اسلام سمیت کسی مذہب کا کوئی تعلق ہے نہ ہی اس کے احکام اس قابل ہیں کہ اس کو لے کر ترقی کے اس دور میں چلا جاسکے۔ اس کے مقابلے میں بہتر یہی ہے کہ ہر ملک میں اس کے منتخب شدہ نمائندے اس ملک کے مزاج و معاشرے کے مطابق قانون سازی کریں۔

سیکولرازم کے شرعی حکم کی تحقیق

اسی کتاب کے چوتھے باب میں تکفیر کا قاعدہ ذکر کیا گیا تھا، اس میں یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ اسلام معتبر ہونے کے لئے چار چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ رضا و محبت: دین اور تمام ضروریات دین پر راضی رہنا اور اس کے ساتھ محبت کرنا۔

۲۔ تعظیم واحترام: دین اور تمام ضروریات دین کی تعظیم کرنا، ان کو قابل عظمت واحترام سمجھنا۔

۳۔ تسلیم وانقیاد: دین اور اس کے سارے قطعی احکام کی فرمان برداری کرنا۔

۴۔ مخالف ادیان ومذاہب سے بیزار ہونا۔

یہ چاروں امور ایمان کے ضروری لوازم ہیں، ان میں سے اگر کوئی ایک بھی فوت ہو جائے تو ایمان کالعدم شمار ہو گا جس کی تفصیل وہاں گزر چکی۔

اگر سیکولرازم کے ان بنیادی نظریات اور ایمان کے ان چاروں لوازم پر غور کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ سیکولرازم کے اس نظریہ میں ایمان کے یہ چاروں لوازم مفقود ہے۔

یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ دین اسلام کا جو حکم بھی قطعیت کے ساتھ ثابت ہو، اس کے ساتھ یہ لوازم رضاومحبت، تعظیم واحترام اور تسلیم وانقیاد ضروری ہیں، اگر کسی ایک حکم کے ساتھ بھی یہ لوازم نہ رہے بلکہ ان کے اضداد ونقائض پائی جائیں تو یہ کفر ہے۔

مثلاً کوئی شخص تمام شریعت کو مانتا ہے، اس کے ساتھ رضاومحبت بھی رکھتا ہے تعظیم واحترام بھی کرتا ہے اور اس کے سامنے تسلیم وانقیاد بھی بجالاتا ہے لیکن مثلاً سود کی حرمت کا شریعت نے جو حکم دیا، اس پر وہ راضی نہیں یا حرمت کے اس حکم شرعی کا وہ توہین ومذاق کرتا ہے تو یقیناً ایسا شخص کافر ہے۔

اس نکتہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اگر سیکولرازم کے ان نظریات پر غور کیا جائے تو اس میں شریعت کے کسی ایک حکم یا ایک باب ہی کے ساتھ یہ لوازم مفقود نہیں،

بلکہ دین کے اکثر تر حصے کے ساتھ اس کا یہی معاندانہ رویہ ہے، سیاست و حکومت، تجارت واقتصاد، تعلیم وتربیت، نکاح ومعاشرت وغیرہ تمام ابواب میں شریعت کے دئے ہوئے سارے احکام کے ساتھ اس کا یہی رویہ ہے کہ نہ ان تعلیمات پر اس کی رضامندی ہے نہ ہی تعظیم واحترام کا کوئی شائبہ اور نہ ہی اس کو عملی زندگی میں تسلیم کرنے کا کوئی جذبہ ہے۔

بلکہ اس کے بالکل برعکس وہ زندگی کے ان تمام شعبوں میں شریعت کے دئے ہوئے احکام سے نالاں اور قطعاناخوش ہے، اپنے آغاز سے لے کر آج تک مختلف انداز سے ان کی توہین وتذلیل کرتا رہا، اور تسلیم وانقیاد تو کیا کرتا اس کو اس قابل ہی نہیں سمجھتا جس پر موجودہ دور میں عمل کیا جاسکے۔

لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ سیکولرازم کے نام لینے والوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی شامل ہیں جو اس نظریہ کے ان بنیادی حقائق اور اصل اہداف سے بالکل ناواقف ہیں اور اس حوالے سے وہ سیکولرازم کے ان خلاف دین امور میں مذہب کے ساتھ ایک حد تک مخلص بھی ہیں، ایسے لوگ سیکولرازم کے اصل نظریہ کی طرح مذہب کو وہ حیثیت نہیں دیتے کہ مادے کو اس پر ترجیح دینے لگے یا دینی تعلیمات واحکام کو اس دور میں ناقابل عمل اور ناقابل نفاذ سمجھے۔

ان دونوں امور کی وجہ سے تمام افراد پر یکساں حکم لگانا مشکل اور خلاف احتیاط ہے، بس اصولی طور پر مسئلہ یہ ہے کہ سیکولرازم کے اصول واہداف جو ابھی مذکور ہوئے، ان تفصیلات کے مطابق یہ خالص کفریہ نظریہ ہے اور اس کے نام لینے والوں میں سے جو بھی شخص سیکولرازم کے مندرجہ بالا امور کا حامی ہو یا اس کے علاوہ کسی ایسے نظریہ

یا قول و عمل کا حامل ہو جس سے دین اسلام یا اس کے قطعی اور کسی یقینی حکم کے ساتھ مندرجہ بالا چار لوازم میں سے کوئی لازم واضح اور یقینی طور پر فوت ہو رہا ہو، تو وہ شخص بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے، اور اگر کوئی شخص ان جیسے نظریات کا بالکل حامل نہ ہو بلکہ صرف پروپیگنڈے کی وجہ سے "سیکولر" کہلاتا ہو لیکن اس کے بنیاد اور اصل اہداف سے قطعاً نابلد ہو تو ایسے شخص کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔

سیکولرازم کا نظریہ متقدمین کی نظر میں

متقدمین اور متاخرین تمام اہل حل و عقد کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن و سنت میں جو اوامر اور نواہی وارد ہیں، یہ کسی خاص زمانے یا مخصوص علاقے کے ساتھ مختص نہیں ہیں بلکہ قیامت تک کے لئے اور پوری دنیا کی طرف یہ احکام متوجہ ہوتے ہیں اور تمام ہی انسانیت دین اسلام کے اصول کے مطابق ایمان لانے اور پھر اس کے احکام پر عمل کرنے کے مکلف ہیں، متقدمین کے زمانے میں تو سیکولرازم جیسا بودا نظریہ ایجاد نہیں ہوا تھا، تاہم اس کے باوجود ان حضرات نے ایک دوسری گمراہی کو ختم کرنے کے ضمن میں جو تفصیلات ذکر فرمائے ہیں، وہ آج کے دور کے سیکولرازم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں، اسی طرح ان حضرات نے اس ضمن میں جو دلائل ذکر فرمائے ہیں وہ عصر حاضر میں بھی سمجھ دار آدمی کے لئے اس باب میں رہنمائی کا کافی کام دیتی ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ ایک زمانے میں بعض جاہل صوفیہ نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا تھا کہ ہم قرب و رضا کے اس مقام پر پہنچے ہیں کہ اب ہمیں مزید اوامر اور نواہی پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں رہی، گویا اب ہم دین اسلام کے ان ظاہری احکام کے مکلف نہیں رہیں۔

اس بات کی تردید میں تمام اہل سنت نے اس بات پر اتفاق کیا کہ دنیا کے اندر رہتے ہوئے کوئی ایسا مقام ور تبہ نہیں ہے جس پر پہنچنے کے بعد آدمی مکلف نہ رہے بلکہ جب تک کوئی انسان عقل وبلوغ کی نعمت سے متصف ہو تو وہ اس دنیا میں مکلف ہی رہے گا جب تک کہ کوئی ایسے عوارض پیش نہ آئیں جس کی وجہ سے خود شریعت انسان سے تکلیف کا بوجھ اٹھادیتی ہے(جس کی تفصیل اصول فقہ کی کتابوں میں ذکر کی جاتی ہے)حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور خصوصاً سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس کی زندہ پائندہ مثال ہے کہ انسانیت کے لئے ممکنہ تمام ترقیوں اور رفعت وقربت کے سارے منازل بڑے کمال اور نہایت استقامت کے ساتھ طے فرمائے لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو آخر عمر تک عبادات کا حکم دیا جاتا ہے۔

فقہاء کرام نے ان نام نہاد صوفیہ کے دعویٰ کو قرآن وسنت کے نصوص سے متصادم قرار دیا بلکہ بہت سے حضرات نے اس دعویٰ کو ان بدعات کی فہرست میں شمار فرمایا جو موجب کفر ہوتے ہیں، چنانچہ امام شاطبیؒ رحمہ اللہ اس موضوع پر اپنی مشہور اور مفید کتاب "الاعتصام" میں تحریر فرماتے ہیں:

فمن رأى أن التكليف قد يرفعه البلوغ إلى مرتبة ما من مراتب الدين ـ كما يقوله أهل الإباحة ـ كان قوله بدعة مخرجة عن الدين.

"جو کوئی یہ سمجھے کہ دین کے کسی رتبہ پر پہنچنے کے بعد تکلیف ختم ہو جاتی ہے تو اس کا یہ کہنا ایسی بدعت ہے جو انسان کو دین کے دائرہ سے نکال دیتی ہے۔"[1]

---

[1] الاعتصام للشاطبي ت الهلالي،فصل الأخذ بالمطلقات قبل النظر في مقيداتها ،ج١ص٣١٣.

واضح رہے کہ یہاں دینی رتبہ کی جو قید لگائی گئی ، یہ قید اتفاقی ہے احترازی نہیں، جن لوگوں کی تردید کرنی مقصود تھی ان کا یہی خیال تھا کہ دینی مراتب میں سے ایک بڑے مرتبہ پر پہنچنے کے بعد تکلیف ختم ہو جاتی ہے،اس لئے اس کے مطابق یہ قید لگائی گئی، ورنہ اس باب میں دین و دنیا کے اندر کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔

علامہ تفتازانی رحمہ اللہ نے بھی شرح العقائد میں اس مسئلہ کو ذکر کیا ہے ، چنانچہ آپ لکھتے ہیں :

(ولا يصل العبد) ما دام عاقلاً بالغاً (إلى حيث يسقط عنه الأمر والنهي) لعموم الخطابات الواردة في التكاليف وإجماع المجتهدين على ذلك. وذهب بعض الإباحيين إلى أن العبد إذا بلغ غاية المحبة وصفا قلبه واختار الإيمان على الكفر من غير نفاق سقط عنه الأمر والنهي ولا يدخله الله تعالى النار بارتكاب الكبائر وبعضهم إلى أنه يسقط عنه العبادات الظاهرة من الصلاة والصوم والزكاة والحج وغير ذلك، وتكون عبادته التفكر، وهذا كفر وضلال.

"انسان جب تک عاقل بالغ رہے تو وہ کسی ایسے مقام پر نہیں پہنچ سکتا جس کی وجہ سے اس سے اوامر ونواہی ساقط ہو جائیں، کیونکہ نصوص میں جو تکلیفی احکام بیان ہوئے ہیں وہ (تمام انسانیت کے لئے) عام ہے اس پر مجتہدین کا اجماع ہے۔ بعض اباحت پسند لوگوں نے یہ موقف اپنایا کہ جب بندہ محبت کی انتہااور دل کی صفائی کے مقام کو پہنچے اور بغیر کسی قسم کے نفاق کے، ایمان کو کفر پر ترجیح دیدے تو اس سے احکام ساقط ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کبیرہ گناہوں کی وجہ سے اس کو جہنم میں داخل نہیں کریں گے۔ انہی اباحت پسندوں میں سے بعض نے یہ خیال اپنایا کہ اور حج

وغیرہ ساقط ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد اس کی عبادت (اللہ تعالیٰ کے اس مقام پر پہنچنے کے بعد (تمام تو نہیں البتہ) ظاہری عبادات مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ ذات وصفات میں) فکر کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ یہ خیال کفر اور گمراہی ہے۔"[1]

جب دنیا میں رہتے ہوئے ایک انسان سے تکلیف ختم نہیں ہو سکتی تو پورے ملک کو دین سے کیسے مستغنی قرار دیا جا سکتا ہے؟ جبکہ سیکولرازم کا اصل فلسفہ ہی یہی ہے کہ حکومت و سیاست بلکہ انسانی زندگی سے دین کے تسلط کو کچل دیا جائے جس کی تفصیل تعارف کے اندر ذکر کی جا چکی ہے۔

لہٰذا اگر ایک شخص کے متعلق یہ خیال بدعت مکفرہ ہے تو دین کو سیاست و حکومت اور ولایت و تسلط سے بالکل باہر کرنا اور ان امور میں مکمل آزادی کو روا رکھنا، انسانیت کو اس سے بالکل مستغنی سمجھنا یقیناً بدعت مکفر ہے۔

مجمع الفقہ الاسلامی کی قرارداد

مجمع الفقہ الاسلامی نے اس کے متعلق قرارداد رقم: ۹۰ (۱۱/۲) صادر فرمایا جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ:

رابعًا: إن العلمانية نظام وضعي يقوم على أساس من الإلحاد يناقض الإسلام في جملته وتفصيله، وتلتقي مع الصهيونية العالمية والدعوات الإباحية والهدامة، ولهذا فهي مذهب إلحادي يأباه الله ورسوله والمؤمنون.

[1] شرح العقائد النسفيةص٥٣٩(المطبوع مع النبراس من مكتبة البشرىٰ).

خامسًا: إن الإسلام هو دين ودولة ومنهج حياة متكامل، وهو الصالح لكل زمان ومكان، ولا يقر فصل الدين عن الحياة، وإنما يوجب أن تصدر جميع الأحكام منه، وصبغ الحياة العملية الفعلية بصبغة الإسلام، سواء في السياسة أو الاقتصاد، أو الاجتماع، أو التربية، أو الإعلام وغيرها.

"علمانیہ (سیکولرازم) ایک وضعی نظام ہے جس کی بنیاد ہی الحاد پر ہے، یہ مجموعی اور تفصیلی طور پر اسلام کے خلاف ہے،اس کی جڑیں عالمی صہیونیت اور اباحیت والی تحاریک کے ساتھ ملتی ہیں، اسی لئے یہ ایک الحادی مذہب جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور مسلمانوں کے بالکل خلاف ہے۔

پانچواں قرارداد: یقیناً اسلام ایک جامع دین، حکومت اور مکمل ضابطہ حیات ہے جو ہر زمانے اور ہر جگہ کے مناسب ہے،دین کو زندگی سے جدا نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ زندگی کے تمام احکام دین اسلام ہی سے صادر ہو،اور عملی زندگی کو اسلام کے رنگ سے رنگا جائے چاہے وہ سیاست واقتصاد کے میدان میں ہو یا اجتماع وتربیت اور صحافت کی میدان ہو (غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں دین سے رہنمائی حاصل کی جانی ضروری ہے)۔"[1]

سعودی عرب کے لجنۃ العلماء کا فیصلہ

سعودی عرب کے فقہی لجنہ کے پاس علمانیہ کے متعلق ایک سوال آیا، جس کے جواب میں اراکین نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ:

---

[1] مجلة مجمع الفقه الإسلامي،الإسلام في مواجهة العلمنة ،ج٢ص ٢٢١١٣.

ج: ما يسمى بالعلمانية التي هي دعوة إلى فصل الدين عن الدولة، والاكتفاء من الدين بأمور العبادات، وترك ما سوى ذلك من المعاملات وغيرها، والاعتراف بما يسمى بالحرية الدينية، فمن أراد أن يدين بالإسلام فعل، ومن أراد أن يرتد فيسلك غيره من المذاهب والنحل الباطلة فعل، فهذه وغيرها من معتقداتها الفاسدة دعوة فاجرة كافرة يجب التحذير منها وكشف زيفها، وبيان خطرها والحذر مما يلبسها به من فتنوا بها، فإن شرها عظيم وخطرها جسيم. نسأل الله العافية والسلامة منها وأهلها.

وبالله التوفيق، وصلى الله على نبينا محمد وآله وصحبه وسلم.

اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء.

"سیکولرازم جو کہ حکومت سے دین کو جدا کرنے، صرف عبادات پر اکتفاء کرنے اور باقی مکمل دینی آزادی کی طرف دعوت دینے کا نام ہے کہ جو اسلام کو بطور دین قبول کرنا چاہے تو کرے اور جو کوئی اس سے مرتد ہو کر دوسرا کوئی دین ومذہب اختیار کرنا چاہے تو اس کی مرضی ہے، تو یہ اور اس قسم کے دیگر غلط نظریات ایک ناجائز اور کافرانہ دعوت ہے جس (کے انجام بد) سے لوگوں کو ڈرانا اور اس کی کمزوری اور خطرات وہولناکی واضح کرنا اور اس فتنہ میں گرفتار لوگوں کے تلبیسات ودسیسہ کاریوں سے بچنا لازم ہے کیونکہ اس فتنہ کا شر بڑا اور خطرات زیادہ ہیں۔"[1]

اس جواب پر لجنہ دائمہ کے اراکین میں سے مندرجہ ذیل پانچ شخصیات کے دستخط ہیں۔

---

[1] فتاوى اللجنة الدائمة،الفرق، العلمانية والحرية الدينية،الفتوى رقم: (١٨٣٩٦) ج٢ص١٤٣.

۱۔ بکر أبو زید ۔ ۲۔ صالح الفوزان ۔ ۳۔ عبد اللہ بن غدیان ۔ ۴۔ عبد العزیز آل الشیخ ۔ ۵۔ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز

شیخ الاسلام مصطفی صبری رحمہ اللہ تعالی کی دقت نظر

جیسا کہ پہلے اس بات کی وضاحت کی گئی کہ سیکولرازم نے ابتدائی دور میں اپنا اصلی ہدف پورے طور پر واضح نہیں کیا تھا بلکہ ایک محدود سا تصور عام کیا گیا کہ "اس نظام کا مقصد صرف سیاسی میدان سے دین کو مستقل رکھنا ہے" خلافت عثمانیہ کے اخیر دور کے شیخ الاسلام علامہ مصطفی صبری رحمہ اللہ نے اس نظریہ پر اسی نقطہ نظر سے بحث کی، اور بڑے زور وشور سے اس کی تردید فرمائی، بلکہ آپ نے یہ اس کو حکومت کا ارتداد قرار دیا۔

آپ تحریر فرماتے ہیں:

قد كان فى كل بدعة احدثها العصريون المتفرنجون في البلاد الاسلامية كيد للدين ومحاولة الخروج عليه لكن كيدهم في فصله عن السياسة ادهي واشد من كل كيدفي غيره، فهو ثورة حكومية علي دين الشعب في حين ان العادة ان تكون الثورات من الشعب علي الحكومة وشق عصا الطاعة منها اي الحكومة لاحكام الاسلام، بل ارتداد عنه من الحكومة اولا ومن الامة ثانيا ان لم يكن بارتداد الداخلين في حوزة تلك الحكومة باعتبارهم افرادا فباعتبارهم جماعة، وهو اقصر طريق الي الكفر من ارتداد الافراد.

معاصر انگریزوں نے اسلامی شہروں میں جو بھی بدعت ایجاد کی ہے، اس میں دین کے خلاف کوئی مکر و تدبیر اور دین کے خلاف نکلنے کی کوشش ضرور موجود ہوتی ہے تاہم دین کو سیاست معاملات سے نکالنے کا مکر نہایت تاریک اور ہر قسم کے مکر

سے زیادہ سخت ہے، یہ ایک باقاعدہ حکومتی حملہ ہے افراد کے دین ومذہب کے خلاف، حالانکہ ابھی تک دستور یہ ہے کہ افراد حکومت کے خلاف حملہ کرتے ہیں، اور یہ حکومت کا احکام اسلام کی پیروی ختم کرنا ہے بلکہ اولاً حکومت کا پھر پوری امت کے ارتداد (کاذریعہ) ہے، اگر حکومت کے تحت داخل ہونے والے افراد ذاتی حیثیت سے مرتد نہ بھی ہو جائے تو بھی قوم وجماعت کے اعتبار سے یہ ارتداد ہے جو کہ افراد کے ارتداد سے مختصر راستہ ہے کفر کی جانب۔"[1]

اس عبارت سے بڑی وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ دین کو سیاست و حکومت کے میدان سے الگ کرنے اور اس میدان کو دینی احکام سے آزاد کرنے کے جواز کا نظریہ آپ کے نزدیک ایک کفریہ تصور ہے اور کوئی حکومت کی اگر یہی پالیسی اپنائے تو آپ کے نزدیک ایسی حکومت مسلمان نہیں ہے، اور آپ رحمہ اللہ نے صرف حکومت ہی کا یہ حکم نہیں لکھا بلکہ اس عبارت کے متصل بعد آپ نے مزید یہ بھی تحریر فرمایا کہ:

بل انه يتضمن ارتداد الافراد ايضا لقبولهم الطاعة لتلك الحكومة المرتدة التي ادعت الاستقلال لنفسها بعد ان كانت خاضعة لحكم الاسلام عليها

"بلکہ یہ افراد کے ارتداد کو بھی شامل ہو جاتا ہے کیونکہ لوگوں نے اس مرتد حکومت کی اطاعت قبول کی ہے جو پہلے اسلام کے حکم کی تابع تھی اور اب مستقل ہونے کا دعویٰ کیا۔"

---

[1] موقف العقل والعلم والعالم من رب العلمين، الباب الرابع في عدم جواز فصل الدين عن السياسة، ص٢٨١، ٢٨٢.

یہ بات بھی بالکل واضح رہے کہ آپ نے اپنی یہ رائے صرف اس تصور کے بناء پر دی کہ دین کو صرف سیاست کے میدان سے نکالا جائے لیکن اس کے باوجود آپ نے اس کو ارتداد قرار دیا، اس سے "علمانیہ" اور سیکولرازم کا اصل اہداف کا حکم باسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔

علامہ زاہد کوثریؒ کا فتویٰ

خلافت عثمانیہ کے سقوط کے ایک عرصہ بعد یہی سوال علامہ محمد زاہد کوثری رحمہ اللہ سے کیا گیا جو کہ دور خلافت میں نائب شیخ الاسلام کے عہدے پر فائز تھے اور نہایت وسیع النظر، جرأتمند اور اعلیٰ علمی ذوق سے بھرپور شخصیت کے مالک تھے، حلب کے بعض علماء کرام کی طرف سے آپ سے یہ استفسار کیا گیا تھا کہ اگر کوئی مسلمان شخص اپنے شہر میں یہ کوشش کرے کہ حکومت کا سرکاری مذہب تو اسلام ہی رہے لیکن بطور قانون اسلام نافذ نہ رہے بلکہ اس کی جگہ وضعی قوانین کو جاری کر دیا جائے تو ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کا آپ نے تفصیلی جواب لکھا جس میں آپ لکھتے ہیں:

فالمسلم اذا طالب بمثل ذلك في سلامة عقله يجري عليه حكم الردة.. وقد دلّت نصوص الكتاب والسنة على ان دين الاسلام جامع لمصلحتي الدنيا والاخرة ولاحكامهما دلالة واضحة لا ارتياب فيها، فتكون محاولة فصل الدين من الدولة كفرا صارخا منابذا لاعلاء كلمة الله وعداء موجها الى الدين الاسلامي في صميمه، ويكون هذا الطلب من هذا المطالب اقرار منه بالانبتار والانفصال فيلزمه باقراره، فنعدّه عضوا مبتورا من جسم جماعة المسلمين

وشخصا منفصلا عن عقيدة اهل الاسلام فلا تصح مناكحته ولا تحل ذبيحته لانّه ليس من المسلمين ولا من اهل الكتاب.

اگر کوئی مسلمان شخص بقائمی ہوش ایسا مطالبہ کرے تو اس پر ارتداد کا حکم جاری ہو گا۔ قرآن وسنت کے نصوص اس بات کی رہنمائی کرتے ہیں کہ بلاشبہ دین اسلام دنیا و آخرت کے مصالح اور احکام پر پوری طرح مشتمل ہے لہٰذا دین کو حکومت سے جدا کرنے کی کوشش کھلم کھلا کفر، اعلاء کلمہ اللہ کو ڈھانا اور دین اسلام کے ساتھ دلی دشمنی ہے، ایسا مطالبہ گویا دین سے جدائی کا اقرار کرنا ہے اور اپنا یہ اقرار اس پر ثابت ہو جائے گا (دین سے نکل جائے گا) ہم ایسے شخص کو مسلمانوں کے اجتماعی جسم سے کٹا ہوا عضو سمجھیں گے (اور ہم اس کو یوں قرار دیں گے کہ) مسلمانوں کے عقیدے سے ہٹا ہوا شخص ہے، لہٰذا اس کے ساتھ نکاح کرنا بھی جائز نہیں اور اس کا ذبیحہ بھی حلال نہیں کیونکہ وہ نہ مسلمان ہے اور نہ ہی اہل کتاب میں سے ہے (جبکہ نکاح اور ذبح کے صحیح ہونے کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک ہونا ضروری ہے)۔

اس کے بعد آپ رحمہ اللہ نے اپنے اس دعویٰ پر حضرت ابو بکر اور اس کی معیت میں تمام حضرات صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) کے فیصلے سے استدلال فرمایا کہ حضور ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد عرب کے بعض قبائل نے جب صرف ایک حکم کے متعلق یہ رویہ اختیار کیا کہ اس کو حکومتی طور پر نافذ نہیں ہونا چاہیئے تو صحابہ کرام نے اس کو ارتداد سمجھا اور مرتدین جیسا معاملہ فرمایا، جب ایک حکم کو سیاست و حکومت سے جدا رکھنے کا یہ حکم ہے تو پوری شریعت کو حکومت و قانون سے جدا رکھنے کا کیا حکم ہو گا؟

چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں:

وقد عدّ الصديق الاكبر رضي الله عنه الذين حاولوا ابعاد حكم جباية الزكوة عن الاحكام التي تنفذها الحكومة في سبيل الارتداد حتى عاملهم معاملة المرتدين من قتل وسبي واجمعت الصحابة على موافقته.. فكيف من لايرضى بقضاء الاسلام خارجا عن عقيدة الاسلام منفصلا عن جماعة المسلمين؟[1]

"جن لوگوں نے زکوۃ کے حکم حکومت کے نفاذ و اختیار سے دور کرنے کی کوشش کی تھی تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو ارتداد سمجھا اور ان کے ساتھ مرتدین جیسا معاملہ فرمایا کہ (لڑنے والوں کو) قتل کیا اور (باقی کو) قید کیا، اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی موافقت پر اجماع کیا، تو

جو کوئی اسلام کے قضاء (و قانون کو نافذ کرنے) پر خوش نہ ہو وہ کیونکر اسلام کے عقیدے اور اہل اسلام کی جماعت سے خارج نہیں ہو گا؟۔"

علامہ عبدالقادر عودہ کی رائے

علامہ عبدالقادر عودہ رحمہ اللہ تعالیٰ تحریر فرماتے ہیں:

يعتبر خروجًا عن الإسلام صدور قول من الشخص هو كفر بطبيعته أو يقتضى الكفر؛ كأن يجحد الربوبية فيدعى أن ليس ثمة إله-- أو جحد القرآن أو شيئًا منه, أو جحد البعث أو أنكر الإسلام أو الشهادتين, أو أعلن براءته من الإسلام, أو قال إن الشريعة لم تجئ لتنظيم العلاقات بين الإفراد والجماعات والحاكمين والمحكومين, وأن أحكامها ليست واجبة التطبيق فى كل الأحوال وعلى كل المسائل,

[1] مقالات الكوثري، حكم محاولة فصل الدين عن الدولة، ص٢٨٧.

أو قال إن أحكام الشريعة كلها أو بعضها ليست أحكامًا دائمة وإن بعضها أو كلها موقوت بزمن معين, أو قال إن أحكام الشريعة لا تصلح للعصر الحاضر وإن غيرها من أحكام القوانين الوضعية خير منها.

جب کوئی شخص ایسی بات کرے جو کفر ہو یا کفر کا تقاضا کرتی ہو تو اس کی وجہ سے کہنے والے کا اسلام سے خارج تصور کیا جائے گا مثلاً کوئی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا انکار کرے کہ کوئی خدا نہیں ہے یا قرآن میں سے کسی حصہ کا انکار کرے، قیامت، اسلام یا توحید ورسالت کا انکار کرے، اسلام سے اپنے بری ہونے کا علان کرے، یا یہ کہے کہ شریعت اس لئے نہیں کہ افراد اور جماعت اور حاکم ومحکوم کے درمیان تعلقات کی ترتیب دے، اسلام کے احکام ہر زمانے میں لاگو کرنا ضروری نہیں، نہ ہی اس کے تمام احکام لاگو کرنا کوئی لازم ہے، یا شریعت کے تمام احکام یا بعض احکام کے متعلق یہ کہے کہ یہ دائمی نہیں ہے بلکہ کسی خاص زمانے کے ساتھ خاص تھیں، یا یہ کہے کہ شریعت کے احکام موجودہ دور کے مناسب نہیں اور اسکے علاوہ موجودہ رسمی حکومتی قوانین اسلامی احکام سے بہتر ہے (تو یہ باتیں کفریہ ہیں اور اس کے کہنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔)[1]

---

[1] التشريع الجنائي الإسلامي مقارنا بالقانون الوضعي، الباب الثانى، الكتاب السابع: الردة، ج٢ص٧١٠.

المصادر والمراجع

❖ احتساب قاديانيت. عالمي مجلس تحفظ ختم نبوت، ملتان.

❖ إحكام الأحكام شرح عمدة الأحكام. مطبعة السنة المحمدية. الطبعة: بدون طبعة وبدون تاريخ

❖ أحكام القرآن للجصاص. دار الكتب العلمية بيروت — لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤١٥هـ/١٩٩٤م

❖ الإحكام في أصول الأحكام للآمدي. الناشر: المكتب الإسلامي، بيروت- دمشق- لبنان

❖ احياء علوم الدين. الناشر: دار المعرفة — بيروت.

❖ الاختيار لتعليل المختار. الناشر: مطبعة الحلبي – القاهرة .تاريخ النشر: ١٣٥٦ هـ - ١٩٣٧ م

❖ اشارات المرام. زمزم پبلشرز، کراچی -

❖ الأشباه والنظائر لابن نجيم. دار الكتب العلمية، بيروت — لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤١٩ هـ - ١٩٩٩ م.

❖ الأشباه والنظائر مع غمز عيون البصائر. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: الأولى، ١٤٠٥هـ - ١٩٨٥م.

❖ أصول البزدوي مع شرحه كشف الأسرار. الناشر: دار الكتاب الإسلامي.

❖ اصول الدين للبزدوي.الناشر المكتبة الازهرية للتراث.

❖ أصول السرخسي. الناشر: دار المعرفة — بيروت.

❖ أصول السنة لابن أبي زمنين. مكتبة الغرباء الأثرية، المدينة النبوية – المملكة العربية السعودية. الطبعة: الأولى، ١٤١٥ هـ

❖ أصول الشاشي. الناشر: دار الكتاب العربي — بيروت.

❖ الاعتصام للشاطبي. دار ابن عفان، السعودية. الطبعة: الأولى، ١٤١٢هـ - ١٩٩٢م

❖ الاعتماد في الاعتقاد. المكتبة الازهرية للتراث.
❖ الإعلام بقواطع الإسلام . الناشر: دار التقوى/ سوريا. الطبعة: الأولى، ١٤٢٨هـ/ ٢٠٠٨م.
❖ الاقتصادفي الاعتقاد. دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤٢٤ هـ - ٢٠٠٤ م.
❖ اكفار الملحدين فى ضروريات الدين. المجلس العلمي – باكستان. الطبعة: الثالثة - ١٤٢٤ هـ - ٢٠٠٤
❖ انيس الفقهاء في تعريفات الألفاظ المتداولة بين الفقهاء. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: ٢٠٠٤م-١٤٢٤هـ.
❖ إيثار الحق على الخلق في رد الخلافات الى المذهب الحق. دار الكتب العلمية – بيروت. الطبعة: الثانية، ١٩٨٧م
❖ الإيمان للقاسم بن سلام. المكتب الاسلامي. الطبعة: الثانية، ١٤٠٣هـ - ١٩٨٣م.
❖ البحر الرائق مع منحة الخالق. دار الكتاب الإسلامي. الطبعة: الثانية - بدون تاريخ
❖ بدائع الصنائع المكتبة الحقانية بشاور.
❖ بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: الثانية، ١٤٠٦هـ - ١٩٨٦م.[١]
❖ بريقة محمودية في شرح طريقة محمدية وشريعة نبوية في سيرة أحمدية. مطبعة الحلبي. الطبعة: بدون طبعة، ١٣٤٨هـ.
❖ بيان القرآن. ادره تاليفات اشرفيه، ملتان.
❖ تاج العروس. الناشر: دار الهداية.
❖ تاليفات رشيدية. اداره اسلاميات، لاهور.
❖ تاويلات اهل السنة . دار الكتب العلمية - بيروت، لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤٢٦ هـ - ٢٠٠٥ م

❖ التشريع الجنائى الاسلامى مقارنا بالقانون الوضعى. دار الكاتب العربي، بيروت.
❖ التعريفات. الناشر: دار الكتب العلمية بيروت –لبنان. الطبعة: الأولى ١٤٠٣هـ –١٩٨٣م
❖ التقرير والتحبير علي تحرير الكمال بن الهمام. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: الثانية، ١٤٠٣هـ - ١٩٨٣م.
❖ التكفير وضوابطه لابراهيم بن عامر الراحيلي، دار الامام احمد.
❖ تمهيد ابي شكور السالمي. النورية الرضويه، لاهور.
❖ تمهيد الأوائل وتلخيص الدلائل. مؤسسة الكتب الثقافية — لبنان. الطبعة: الأولى، ١٤٠٧هـ - ١٩٨٧م
❖ التمهيد لقواعد التوحيد. دار الطباعة المحمدية.
❖ تهذيب شرح السنوسية. مكتبة المعارف.
❖ جامع البيان ت شاكر . مؤسسة الرسالة. الطبعة: الأولى، ١٤٢٠ هـ - ٢٠٠٠ م
❖ جامع العلوم والحكم. الناشر: مؤسسة الرسالة — بيروت. الطبعة: السابعة، ١٤٢٢هـ - ٢٠٠١م
❖ جامع الفصولين. اسلامي كتب خانه. بنوري تاون.
❖ الجيش والكمين لقتال من كفرعامة المسلمين، مطبوعة دار الصحابة للتراث
❖ خيالي علي شرح العقائد.
❖ الدر المختار مع حاشية ابن عابدين. مكتبه ايچ ايم سعيد كمپني پاكستان.
❖ الدر المنثور في التفسير بالمأثور. الناشر: دار الفكر — بيروت.
❖ درر الحكام شرح غرر الأحكام. الناشر: دار إحياء الكتب العربية.

❖ روضة الطالبين وعمدة المفتين. الناشر: المكتب الإسلامي، بيروت- دمشق- عمان. الطبعة: الثالثة، ١٤١٢هـ / ١٩٩١م.

❖ سنن ابن ماجه. دار الرسالة العالمية. الطبعة: الأولى، ١٤٣٠ هـ - ٢٠٠٩ م

❖ سنن أبي داود. المكتبة العصرية، صيدا — بيروت.

❖ سنن الترمذي ت شاكر. شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي — مصر. الطبعة: الثانية، ١٣٩٥ هـ - ١٩٧٥ م

❖ السنن الكبرى للبيهقي. الناشر: دار الكتب العلمية، بيروت — لبنات. الطبعة: الثالثة، ١٤٢٤ هـ - ٢٠٠٣ م.

❖ شرح الامام على القارى على الفاظ الكفر. دار الفضيلة للنشر والتوزيع؛ السعودية.

❖ شرح السنة للبربهاري.

❖ شرح السنة للمزني. مكتبة الغرباء الأثرية — السعودية. الطبعة: الأولى، ١٤١٥هـ - ١٩٩٥م

❖ شرح السير الكبير. الناشر: الشركة الشرقية للإعلانات. تاريخ النشر: ١٩٧١م.

❖ شرح العقائد العضديه بتحقيق نزار حمادي.

❖ شرح العقائد النسفية، مكتبة رحمانيه. لاهور.

❖ شرح الفقه الاكبر للعلامة ملا علي القاري، قديمي كتب خانه، كراچي.

❖ الشرح الكبير للشيخ الدردير مع حاشية الدسوقي. الناشر: دار الفكر.

❖ شرح المقاصد في علم الكلام. لناشر دار المعارف النعمانية.سنة النشر ١٤٠١هـ - ١٩٨١م

❖ شرح المواقف.دار الكتب العلمية بيروت.

❖ الشريعة للآجري. دار الوطن - الرياض / السعودية. الطبعة: الثانية، ١٤٢٠ هـ - ١٩٩٩

❖ الشفا بتعريف حقوق المصطفى مع حاشية الشمني دار الفكر الطباعة والنشر والتوزيع عام النشر: ١٤٠٩ هـ - ١٩٨٨ م

❖ الصارم المسلول على شاتم الرسول.الناشر: الحرس الوطني السعودي، المملكة العربية السعودية.

❖ الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية. الناشر: دار العلم للملايين — بيروت. الطبعة: الرابعة ١٤٠٧ هـ - ١٩٨٧ م.

❖ صحيح البخاري. دار طوق النجاة (مصورة عن السلطانية بإضافة ترقيم ترقيم محمد فؤاد عبد الباقي) الطبعة: الأولى، ١٤٢٢هـ

❖ صحيح مسلم. دار إحياء التراث العربي — بيروت.

❖ طرح التثريب في شرح التقريب. الناشر: الطبعة المصرية القديمة .

❖ الطريقة المحمدية. مكتبة حقانيه پشاور.

❖ عقيد نزول مسيح. بيت العلم کراچي.

❖ عمدة القاري شرح صحيح البخاري. الناشر: دار إحياء التراث العربي — بيروت.

❖ العواصم والقواصم في الذب عن سنة أبي القاسم. الناشر: مؤسسة الرسالة للطباعة والنشر والتوزيع، بيروت. الطبعة: الثالثة، ١٤١٥ هـ - ١٩٩٤ م.

❖ الفاظ الكفر، مخطوط.

❖ الفتاوى الحديثية. دار الفكر، بيروت.

❖ فتاوى السبكي. الناشر: دار المعارف.

❖ فتاوى اللجنة الدائمة. الناشر: رئاسة إدارة البحوث العلمية والإفتاء الإدارة العامة للطبع الرياض

❖ الفتاوى الهندية. دار الفكر.الطبعة: الثانية، ١٣١٠ هـ [1] الدر المختار مع حاشية ابن عابدين، باب المصرف، ج٢ص ٣٥١.

❖ فتاوى حقانيه، مؤتمر المصنفين جامعة حقانية اکوره ختك.

❖ فتاوى قاضيخان.

- ❖ الفتاوي البزازية علي هامش الهندية.مكتبه حقانيه پشاور.
- ❖ فتاوٰی رشيديه (محقّق ومدلّل). اشاعت اكيدمي پشاور.
- ❖ فتاوي عزيزي؛ ايچ ايم سعيد كمپني. پاكستان.
- ❖ فتح الباري. الناشر: دار المعرفة — بيروت.
- ❖ فتح القدير للشوكاني. الناشر: دار ابن كثير، دار الكلم الطيب - دمشق، بيروت. الطبعة: الأولى - ١٤١٤ هـ.
- ❖ فتح القدير. دار الفكر. الطبعة: بدون طبعة وبدون تاريخ
- ❖ الفتح المبين . دار المنهاج.سن١٤٢٨هـ.
- ❖ فتح الملهم. دار احياء التراث العربي، بيروت، سن ١٤٢٦هـ.
- ❖ الفصل في الملل والأهواء والنحل. مكتبة الخانجي — القاهرة.
- ❖ الفصول في الأصول. الناشر: وزارة الأوقاف الكويتية. الطبعة: الثانية، ١٤١٤هـ - ١٩٩٤م.
- ❖ الفقه الأبسط بتحقيق العلامة الكوثري ضمن كتابه" العقيدة وعلم الكلام"، مكتبة الاحرار، مردان.
- ❖ الفقه الاكبر بتحقيق الامام الكوثري ضمن " العقيدة وعلم الكلام". مكتبة الاحرار، مردان.
- ❖ فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت.قديمي كتب خانه مقابل ارام باغ كراچي.
- ❖ فيصل التفرقة بين الاسلام والزندقة بتحقيق محمود بيجو.
- ❖ قواعد الأحكام في مصالح الأنام. مكتبة الكليات الأزهرية — القاهرة.
- ❖ الكليات،مؤسسة الرسالة — بيروت
- ❖ كتاب التوحيد. الناشر: دار الجامعات المصرية — الإسكندرية.
- ❖ كشاف اصطلاحات الفنون. الناشر: مكتبة لبنان ناشرون — بيروت. الطبعة: الأولى - ١٩٩٦م.

❖ لوامع الأنوار البهية. مؤسسة الخافقين ومكتبتها – دمشق. الطبعة: الثانية – ١٤٠٢ هـ – ١٩٨٢ م
❖ متن الطحاوية. ا لمكتب الإسلامي – بيروت. الطبعة: الثانية، ١٤١٤ هـ
❖ مجمع الأنهر في شرح ملتقى الأبحر. الناشر: دار إحياء التراث العربي.
❖ مجمع الفقه الإسلامي.
❖ المجموع شرح المهذب. الناشر: دار الفكر.
❖ المحلى بالآثار. الناشر: دار الفكر – بيروت.
❖ مختار الصحاح . الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت. الطبعة: الأولى، ١٤١٧هـ ١٩٩٦م
❖ المخصص. الناشر: دار إحياء التراث العربي – بيروت. الطبعة: الأولى، ١٤١٧هـ ١٩٩٦م.
❖ مدارك التنزيل وحقائق التأويل. دار الكلم الطيب، بيروت.الطبعة: الأولى، ١٤١٩ هـ – ١٩٩٨ م
❖ المسامرة شرح المسايرة.دار الكتب العلمية، بيروت.
❖ المستدرك على الصحيحين. الناشر: دار الكتب العلمية – بيروت. الطبعة: الأولى، ١٤١١ – ١٩٩٠
❖ المستصفى. الناشر: دار الكتب العلمية. الطبعة: الأولى، ١٤١٣هـ – ١٩٩٣م
❖ مسند أحمد. مؤسسة الرسالة.الطبعة: الأولى، ١٤٢١ هـ – ٢٠٠١ م.[١]
شرح مشكل الآثار. تحقيق: شعيب الأرنؤوط. الناشر: مؤسسة الرسالة. الطبعة: الأولى – ١٤١٥ هـ، ١٤٩٤ م
❖ مشكوة الانوار في اصول المنار. مكتبه اسلاميه كوئته.
❖ مصنف عبد الرزاق الصنعاني. المجلس العلمي– الهند.
❖ معالم أصول الدين. دار الكتاب العربي – لبنان.

❖ معجم الفروق اللغوية للعسكري. الناشر: مؤسسة النشر الإسلامي التابعة لجماعة المدرسين بـ «قم»الطبعة: الأولى، ١٤١٢هـ.

❖ المعجم الكبير للطبراني. مكتبة ابن تيمية — القاهرة.

❖ المغنى لابن قدامة. مكتبة القاهرة. تاريخ النشر: ١٣٨٨هـ - ١٩٦٨م

❖ مفاتيح الغيب. دار إحياء التراث العربي — بيروت. الطبعة: الثالثة - ١٤٢٠ هـ

❖ المفردات في غريب القرآن. الناشر: دار القلم، الدار الشامية - دمشق بيروت. الطبعة: الأولى - ١٤١٢ هـ.

❖ مقالات الكوثرى. المكتبة الحقانيه، پشاور.

❖ مقاييس اللغة، دار الفكر عام النشر: ١٣٩٩هـ - ١٩٧٩م.

❖ المنثور في القواعد الفقهية. الناشر: وزارة الأوقاف الكويتية. الطبعة: الثانية، ١٤٠٥هـ - ١٩٨٥م

❖ منهاج السنة النبوية. جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية. الطبعة: الأولى، ١٤٠٦ هـ - ١٩٨٦ م

❖ الموافقات. الناشر: دار ابن عفان. الطبعة: الطبعة الأولى ١٤١٧هـ/ ١٩٩٧م.

❖ المواقف. الناشر : دار الجيل — بيروت. الطبعة الأولى ، ١٩٩٧

❖ موقف العقل والعلم والعالم من رب العلمين وعباده المرسلين. دار احياء التراث العربي.

❖ النبراس شرح شرح العقائد النسفية، مكتبة البشرى كراتشي.

❖ نسمات الاسحار على افاضة الانوار. ادار القران والعلوم الاسلامية، كراچي.

❖ نهاية الوصول في دراية الاصول.المكتبة التجارية بمكة المكرمة.

❖ نور الانوار،مكتبة البشرى.

- ❖ نور العين فی اصلاح جامع الفصولين، مخطوطة بجامعة الملک سعود.
- ❖ نيل الأوطار. دار الحديث، مصر. الطبعة: الأولى، ١٤١٣هـ - ١٩٩٣م
- ❖ اليواقيت والجواهر في بيان عقائد الاکابر.

تالیف مفتی عبیدالرحمٰن عفی عنہ

۱۔ نشر العرف فی بناء بعض الأحکام علی العرف	مفتی ثناء اللہ صاحب	عربی محقق
۲۔ تنبیہ الولاۃ والحکام علی إحکام شاتم خیر الأنام أو أحد إصحابہ الکرام علیہ وعلیہم الصلاۃ والسلام	مفتی ثناء اللہ صاحب	عربی محقق
۳۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے بنیادی اصول وضوابط متعلقہ احکام ومسائل	مفتی عبیدالرحمٰن صاحب	اردو
۴۔ مبیع کے کمی وزیادتی کا تحقیقی مطالعہ	مفتی عبیدالرحمٰن صاحب	اردو
۵۔ اصول تکفیر	مفتی عبیدالرحمٰن صاحب	اردو
۶۔ توہین رسالت وتوہین صحابہ کا تحقیقی مطالعہ علامہ ابن عابدین شامی کی تحقیقات کی روشنی میں مفتی ثناء اللہ صاحب		
۷۔ عطر ہدایہ	مفتی عبیدالرحمٰن صاحب	(اردو محقق ومخرج/زیر طبع)
۸۔ الفتاوی الخیریۃ لنفع البریۃ	مفتی ثناء اللہ صاحب	(عربی محقق ومخرج/زیر طبع)

ملنے کے پتے

مکتبہ حقانیہ 'سواڑی' بونیر۔	مکتبہ امام محمد 'نزد جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ عمر فاروق نزد جامعہ فاروقیہ کراچی۔	مکتبۃ الاحرار میڈیسن مارکیٹ نیو اڈہ مردان
دار الاخلاص' قصہ خوانی بازار پشاور۔	مکتبہ علمیہ نزد جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک
مکتبہ نعیمیہ 'نزد خیر المدارس مردان۔	تعلیم الاسلام ماڈل سکول چارسدہ چوک محلّہ گلبہار' مردان